بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جنوری 2013
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
سالِ نو مبارک
www.paksociety.com

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، تنویر پھول 11
نعت، محسن بھوپالی 11
نبی کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

کیا کھویا، کیا پایا، ادارہ 17
صنم بلوچ سے ملاقات، شاہین رشید 26
دستک، شاہین رشید 275
شاعری، ارم حنیف 271
شعاع کے ساتھ، ادارہ 278

ناول

ستارۂ شام، آمنہ ریاض 240
دیوارِ شب، عالیہ بخاری 40

مکمل ناول

جنت کے پتے، نمرہ احمد 144
رابعہ کی کہانی، نعیمہ ناز 92
آشنا ہیں، ثوبیہ جبیں 196

ناولٹ

حیات ممکن ہے، سمیرا حمید 68

افسانے

حوا، رمشہ خالد 192
دوہرا رشتہ، سمیرا گل 134
اجنبی کے نام، مصباح علی 60
ایسا بھی ہوتا ہے، تسنیم شریف 87

نظمیں، غزلیں

غزل، امجد اسلام امجد 259
غزل، جاوید شاہین 260
نظم، امجد بخاری 259
غزل، صیثم علی آغا 260

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- 6000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل 32
مسکراہٹیں، صبا سحر 261
آئینہ خانے میں، تبصیر نشاط 280
باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 265
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 287
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 269
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 284
خوبصورت بنئے، ادارہ 290

جنوری 2013
جلد 27 شمارہ 5
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2/اے بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا جنوری سنہ 2013ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

نئی امیدوں، نئی خواہشوں اور نئے خوابوں کے ساتھ ایک اور سال دستک دے رہا ہے۔

طلوع و غروب ہوتے روز و شب میں کوئی جدت نہ سہی تب بھی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تبدیلی کا عمل لازم اور امید زندگی کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ ارادوں، خواہشوں اور خوابوں کا سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔

امن، انصاف اور خوشحالی کے خواب۔

ایک ایسی دنیا کے خواب جہاں طاقت کی نہیں انصاف کی حکمرانی ہو۔

جہاں سب کو سر اٹھا کر جینے کا حق حاصل ہو۔

ان خوابوں کی تعبیر کے لیے انسان صدیوں سے سرگرداں ہے۔ تمام پیغمبر، ہادی انسانیت کی فلاح کے لیے ہی دنیا میں بھیجے گئے۔ تمام فلسفی اسی کی جستجو اور کھوج میں غور و فکر کرتے رہے مگر خلاؤں کو تسخیر کرنے والا انسان دھرتی پر رہنے کا سلیقہ نہ سیکھ سکا۔

گیا سال کسی حوالے سے بھی دنیا کے لیے کوئی خوش کن پیغام نہ دے سکا۔ آگ اور بارود کے شعلوں میں جلتی دھرتی اس سال بھی امن کے لیے ترستی رہی۔ گزشتہ دو دہائیوں سے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما وطن عزیز کے شہر دھماکوں سے لرزتے رہے۔ اور بے گناہ معصوم انسان اندھی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔

آنے والے وقت کی بہتری کے لیے پوری خوش امیدی کے ساتھ دعاگو ہیں۔

قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔

ہماری دعا ہے کہ آنے والے سال میں آپ سب کو دلی خوشیاں نصیب ہوں اور یہ سال ہم سب کے لیے امن، برکت اور خوشحالی کا پیغام لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول ۔ رابعہ کی کہانی،
- ثوبیہ جبیں کا مکمل ناول ۔ آشنا ہیں تیرے قدموں سے،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ جنت کے پتے،
- سمیرا حمید کا ناولٹ ۔ حیات ممکن ہے،
- سمیرا عثمان گل، مصباح علی، رمشہ خالد خان اور تسنیم شریف کے افسانے،
- کیا کھویا، کیا پایا ۔ نئے سال کے حوالے سے قارئین سے سروے،
- دستک ۔ معروف شخصیات سے گفتگو،
- خط آپ کے ۔ آپ کے خط اور ان کے جوابات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ ترتیب دیتے ہوئے ہمارے پیش نظر آپ کی آراء ہوتی ہیں۔ اسی کی روشنی میں ہم پرچہ ترتیب دیتے ہیں۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

جو دل کی آنکھیں کھلیں ہم کو یہ ہوا معلوم
وہ راز جان گئے جو نہ پہلے تھا معلوم

گناہ گارِ ازل ہوں سرشت میں ہے خطا
تجھے تو میرے خدا سب ہے ماجرا معلوم

خدا کی ذات کو کیا سمجھے عقلِ انسانی
ابھی تو اپنی ہی ہستی کا راز نامعلوم

خدا کی ذات کے منکر رہے یہ بھول ہوئی
اجل کا وقت جو آیا تو ہو گیا معلوم

نہیں ہے تو ابھی رازِ حیات سے واقف
تجھے وجودِ عدم کا ہے کیا پتا معلوم

جو حال پھول کا پوچھا کلی سے بلبل نے
لگی وہ کہنے مجھے کیا پتا، خدا معلوم

تنویر پھول،

نعت رسولِ مقبول

لازم ہے اس سے پہلے کہ نعتِ نبیؐ لکھوں
جو کچھ لکھا ہے، کچھ نہیں لکھا یہی لکھوں

پاسِ ادب میں جنبشِ لب کی کہاں مجال
اور شوقِ مدح اس پہ مُصر ہے، ابھی لکھوں

وہ کائناتِ علم ہیں، وہ علمِ کائنات
منجملۂ صفات لکھوں تو یہی لکھوں

جو ان سے آشنا ہوا، حق آشنا ہوا
آگاہی نبیؐ کو خدا آگہی لکھوں

یارب عطا وہ ذہنِ رسا ہو کہ نعت میں
جو ماورائے فکر ہے وہ بھی کبھی لکھوں

اس جزوِ نورِ کُل سے ہے تابندگی تمام!
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں

محسن بھوپالی،

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

موت کی یاددہانی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے جبکہ ہم اپنے چھپر کی مرمت کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ کیا ہے؟"

ہم نے کہا "(یہ چھپر) کمزور ہو کر گرنے کے قریب ہو گیا تھا ہم اسے ٹھیک کر رہے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تو معاملے (موت) کو اس سے بھی زیادہ قریب دیکھ رہا ہوں۔"

(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے بخاری و مسلم کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے 'یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل : خص' سے مراد یا تو چھپر ہے یا وہ گھر ہے جو لکڑی اور کانوں سے بنا ہوتا ہے اور مٹی سے اسے لیپ دیا جاتا ہے۔ وہ مٹی کی لپائی ہی میں مصروف ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکان کی لیپا پوتی نہ کی جائے بلکہ مطلب موت کی یاددہانی ہے تاکہ موت ہر وقت انسان کے سامنے رہے اور وہ کسی وقت بھی اس سے غفلت نہ برتے۔

فتنہ

حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے (یعنی ایسی چیز جس کے ذریعے سے اسے آزمایا جاتا ہے۔) اور میری امت کے لیے فتنہ (آزمائش) مال ہے۔"

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے 'یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ فتنے کے معنی آزمائش کے ہیں۔ جس کو جس چیز سے آزمایا جائے 'وہ اس کے لیے فتنہ ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید میں اولاد اور مال کو بھی انسانوں کے لیے فتنہ کہا گیا ہے 'حالانکہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں 'لیکن چونکہ ان نعمتوں کے ذریعے سے انسانوں کی آزمائش ہوتی ہے 'اس لیے انہیں فتنے سے تعبیر فرمایا۔

2۔ اس حدیث میں امت محمدیہ کے لیے سخت تنبیہہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں اعتدال کو ملحوظ رکھے ورنہ وہ اس آزمائش میں ناکام ہو سکتی ہے اور یہ مال 'جو نعمت الٰہی ہے 'اس کے لیے عذاب شدید کا باعث بن سکتا ہے۔

ضروریات زندگی

حضرت ابو عمر اور بعض کے نزدیک ابو عبداللہ یا ابو لیلیٰ 'عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابن آدم کے لیے ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز میں حق نہیں ہے ایک گھر جس میں اس کی رہائش ہو 'کپڑا جس سے وہ اپنا ستر چھپالے 'بغیر سالن کے (یا موٹی) روٹی اور پانی۔"

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے 'یہ حدیث صحیح ہے۔)

انسان کا مال

حضرت عبداللہ بن شخیر (شین کے نیچے زیر اور خا کے نیچے بھی زیر اور تشدید) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ (الھکم التکاثر) "تمہیں کثرت کی آرزو نے غفلت میں ڈال دیا۔" تلاوت فرما رہے تھے 'پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کہتا ہے 'میرا مال 'میرا مال 'حالانکہ اے انسان! تیرا مال تو صرف وہ ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا 'یا پہن کر بوسیدہ کر دیا 'یا صدقہ کر کے آگے (آخرت کے لیے) چلا دیا۔" (مسلم)

فائدہ :

اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی پسندیدہ راہوں پر خرچ کرے کیونکہ یہ صدقہ کیا ہوا مال ہی آخرت کے لیے ذخیرہ ہو گا جہاں اس کو اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ باقی جو مال وہ اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ پر خرچ کرے گا وہ سب اس دنیا ہی میں ختم اور بوسیدہ ہو جائے گا اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ اس کے کام نہیں آئے گا۔

فقر

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں یقیناً" آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے!"

اس نے (پھر) کہا "اللہ کی قسم! میں یقیناً" آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں۔"

تین مرتبہ اس نے اس طرح کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اگر تو (واقعی) مجھ سے محبت کرتا ہے تو فقر و غربت کا ٹاٹ تیار کر 'اس لیے کہ فقر اس شخص کی طرف 'جو مجھ سے محبت کرتا ہے 'اتنی تیزی سے جاتا ہے کہ اتنا تیز سیلاب کا پانی بھی اپنے بہاؤ کے رخ پر نہیں جاتا۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے 'یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔)

مال و جاہ کی حرص

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو بھوکے بھیڑیے 'جنہیں بکریوں کے ریوڑ میں بھیجا جائے (بکریوں کو) اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا نقصان آدمی کے مال اور جاہ کی حرص اس کے دین کو پہنچاتی ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے 'یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

مال و جاہ کی محبت کی یہ حشر سامانیاں 'جس کی نشاندہی اس حدیث میں کی گئی ہے 'آج ہر طرف دیکھی جا سکتی ہیں حتیٰ کہ علماء اور مدعیان زہد و تقویٰ بھی جب ان کے اندر ان چیزوں کی حرص آ گئی تو وہ ان ہلاکتوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔

زہد

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) ایک چٹائی پر سوئے جس سے آپ کے پہلو میں (چٹائی کے) نشان پڑ گئے۔ ہم نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر (اجازت دیں تو) ہم آپ کے لیے ایک نرم گدا تیار کر دیں!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میں تو دنیا میں اس سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے ٹھہرا 'پھر چل پڑا اور اس درخت کو چھوڑ دیا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد کے علاوہ دنیا کی حقیقت ایک تمثیل کے ذریعے سے نہایت بلیغ انداز میں واضح کردی گئی ہے۔ کاش لوگ اس حقیقت کو سمجھ کر دنیا کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں جو اس حدیث کا مفہوم ہے۔

فقرا کی فوقیت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت میں فقرا مال داروں سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : فقرا سے مراد وہ فقرا ہیں جو ایمان میں کامل اور اعمال صالحہ کے پابند رہے ہوں گے' نیز انہوں نے فقر پر صبر کرکے مانگنے سے اجتناب کیا ہوگا۔ یہ مال داروں سے پہلے جنت میں جائیں گے کیونکہ مال داروں کا حساب ہوگا کہ مال کس طرح کمایا اور کس طرح خرچ کیا' جبکہ فقرا سے یہ سوال نہیں ہوگا۔

جنّت میں کثرت

حضرت ابن عباس اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے جنت میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں اکثر نادار لوگ ہیں' پھر جہنم میں جھانکا تو اس میں اکثریت عورتوں کی دیکھی۔" (بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور بخاری نے اسے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔)

فوائدومسائل :

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ کا یہ مشاہدہ یا تو معراج کے موقع پر کرایا گیا' یا کشف کے ذریعے سے' جیسے صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نماز کسوف میں آپ کو کشف کے ذریعے سے جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا۔

2۔ فقرا کی اکثریت اس لیے جنت میں جائے گی کہ وہ ایمان و عمل صالح کی پابندی مال داروں کے مقابلے میں زیادہ کرتے ہیں' جبکہ مال داروں کی اکثریت مال کے گھمنڈ میں ایمان و عمل کے تقاضوں کو اہمیت نہیں دیتی۔ اور عورتوں کے زیادہ جہنم میں جانے کی وجہ خود دوسری حدیث میں بیان کردی گئی ہے کہ یہ آپس میں زیادہ لعن طعن اور خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں' اس لیے عورتوں کو ان کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔

حساب کتاب

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو (میں نے دیکھا کہ) اس میں داخل ہونے والے زیادہ مساکین ہیں اور مال دار لوگوں کو (حساب کے لیے) روکا ہوا تھا' البتہ جہنمیوں کو جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔" (بخاری و مسلم)

سچی بات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی' وہ لبید (شاعر) کی بات ہے (اس نے کہا۔) "سنو! اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے' باطل (بے حقیقت) ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائدومسائل :

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے شعر پڑھنا' کہنا اور ان سے استشہاد جائز ہے۔

اس شعر میں کل من علیھا فان ○ والا مضمون بیان کیا گیا ہے جس سے آخرت کی زندگی کا دوام اور دنیا کی ناپائیداری کا اثبات ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہمیں آخرت کی طرف زیادہ توجہ رکھنی چاہیے۔

مسلمان کی مدد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے کسی مومن سے دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی (بڑی) تکلیف دور فرمادے گا۔ جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی' اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی فرمائے گا۔ جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی' اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

جو ایسے راستے پر چلتا ہے جس میں وہ علم (دین) تلاش کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے۔ اور جو لوگ بھی اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوکر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور آپس میں اس کی تدریس (سیکھتے یا سکھلاتے بحث و تکرار) کرتے ہیں تو ان پر (اللہ کی طرف سے) سکینت نازل ہوتی ہے' انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے' فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان فرشتوں میں فرماتا ہے جو اس کے پاس ہوتے ہیں اور جسے اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھائے گا۔" (مسلم)

فوائدومسائل :

1۔ اس میں مذکورہ فوائد کے علاوہ اور بہت سی اہم باتیں بیان کی گئی ہیں' مثلاً" : تنگ دست پر آسانی کرنے کی فضیلت' علم شریعت حاصل کرنے کی سعی و کاوش کی فضیلت' قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لیے اجتماع کی ترغیب و فضیلت۔

2۔ گھروں میں ختم قرآن کی جو محفلیں منعقد کرکے ان سے فوت شدگان کی بخشش و مغفرت کی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں' یہ الگ صورتیں ہیں جو ایک رسم و رواج سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یاد رہے! مسلمان کا کوئی کام خلاف سنت نہیں ہونا چاہیے۔

3۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں نسبت پر اعتماد کرنے کے بجائے اعمال صالحہ اختیار کرنے کی ترغیب و تلقین کی گئی ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے جو اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور صرف خاندانی عزت و شرافت پر اتراتے ہیں۔

سفارش

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"جس نے کوئی اچھی سفارش کی' اس کے لیے بھی اس میں سے حصہ ہوگا۔"

فیصلہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپ اپنے شرکائے مجلس کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے۔

"(اس کے لیے) سفارش کرو' تمہیں (بھی) اجر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو پسند فرماتا ہے فیصلہ فرمادیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے "(اللہ) جو چاہتا ہے (فیصلہ فرمادیتا ہے)۔"

فوائدومسائل :

1۔ اس میں جس سفارش کی ترغیب دی گئی ہے وہ حلال و مباح امور میں ہے۔ حرام کام یا اسقاط حد

WWW.PAKSOCIETY.COM

(مقررہ شرعی سزا کی معافی) کے لیے سفارش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

2۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے منشائے الٰہی کے مطابق ہی کلام صادر ہوتا تھا۔

عورت کی مرضی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بریرہ رضی اللہ عنہا اور اس کے خاوند کے قصے میں منقول ہے کہ اس (بریرہ) سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تو اس (مغیث، خاوند) سے رجوع کرے (تو اچھا ہے)۔"

اس نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ (رجوع کرنے کا) مجھے حکم فرماتے ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں، میں تو صرف سفارش کرتا ہوں۔"

اس نے کہا "مجھے (مغیث کی) کوئی ضرورت نہیں ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی تھیں جو ایک غلام مغیث کے نکاح میں تھیں۔ انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد اسلام نے لونڈی کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے غلام خاوند کے نکاح میں رہنا پسند نہ کرے تو نکاح فسخ کرا سکتی ہے، چنانچہ اس نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے اپنے خاوند مغیث سے علیحدگی اختیار کر لی۔

2۔ مغیث کو بریرہ سے بڑی محبت تھی، وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا اور اس کی منت سماجت کرتا کہ تعلق زوجیت منقطع نہ کرے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا اور مغیث کی حالت زار کا علم ہوا تو آپؐ نے بریرہ سے سفارش کی کہ وہ اپنے خاوند سے رجوع کر کے اس سے تعلق زوجیت بحال کر لے۔ لیکن چونکہ یہ حکم شرعی نہیں تھا، ایک مشورہ اور سفارش ہی تھی، اس لیے بریرہ نے اس مشورے کو اپنے لیے مفید تصور نہیں کیا اور اسے قبول کرنے سے معذرت کر لی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے شخصی حقوق اور شخصی آزادی کو تسلیم کیا ہے اور اس کا وہ پورا احترام کرتا ہے بشرطیکہ وہ دائرہ شریعت سے متجاوز نہ ہو۔ اس آزادی کو جبر و اکراہ سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

لوگوں کے درمیان اصلاح

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ان کی اکثر سرگوشیوں (مشوروں) میں کوئی بھلائی نہیں، مگر جو شخص صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے۔"

اور فرمایا "صلح بہتر ہے۔"

اور فرمایا "اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"یقیناً" مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔"

صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں کے ہر جوڑ پر صدقہ (واجب) ہے، ہر اس دن میں جس میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ تیرا دو آدمیوں کے درمیان عدل و انصاف (کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ) کرنا صدقہ ہے۔

تیرا کسی آدمی کی، اس کی سواری کے معاملے میں، مدد کرنا کہ تو اسے اس پر سوار کرا دے یا اس کے اوپر اس کا سامان رکھوا دے، صدقہ ہے۔

اچھی بات کہنا صدقہ ہے۔

ہر وہ قدم جو تو نماز کے لیے اٹھائے، صدقہ ہے۔

تیرا راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا صدقہ ہے۔"

(بخاری و مسلم)

ڈھلتا سورج ڈوب رہا ہے آؤ بیٹھ کر سوچیں
جانے والے سال میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟

خاموشی سے گزرتے ماہ و سال عمر کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ یہ زندگی میں کبھی خوشی لے کر آتے ہیں اور کبھی دکھ کی پرچھائیاں۔ کبھی ہمارے سنہرے خواب تعبیر پا کر زندگی میں قوس قزح کے رنگ بکھیر دیتے ہیں اور کبھی زندگی ایسے رخ بھی دکھاتی ہے کہ خواب کرچی کرچی ہو کر دکھ کے انمٹ نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔

گزر گئے وہ رات دن، بچھڑ گئیں وہ ساعتیں
مگر یہ کیا کہ دل پر یہ جہاں ثبت ہو گئے

کوئی بھی موسم ٹھہرتا نہیں۔ زندگی اتنی تیز رفتار ہے اور وقت اتنی برق رفتاری سے گزر رہا ہے کہ کہیں رکنے اور کچھ دیکھنے سوچنے کی مہلت ملنا بھی محال ہے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں رک کر سوچنا ہی پڑتا ہے کہ ہمیں جو زندگی دی گئی، اس کا ہر لمحہ عمل و احتساب سے مشروط ہے۔

ایک اور نیا سال ہمارے سامنے ہے۔ گزرے سال کے حوالے سے ہم نے حسب روایت اپنی قارئین سے سروے کیا۔ سوال یہ ہے۔

گزرتے سال آپ کو کیا احساس دے جاتے ہیں؟ گیا سال آپ کو کیا دے گیا اور آپ نے کیا کھو دیا؟

(1) ذاتی حوالے سے

(2) اجتماعی حوالے سے.....

آیئے! دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

کیا کھویا، کیا پایا

ادارہ

مسرت الطاف احمد..... کراچی

مجھے حقیقتاً "یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ گزرے ایک سال پر افسوس کیا جائے یا خوشیاں منائی جائیں۔ افسوس، غم اور خوشی کی ملی جلی سی کیفیت دے کر اسی طرح ہر سال گزر جاتا ہے۔ اگر ذاتی حوالے سے دیکھا جائے تو.....

میری زندگی میں اس سال بہت تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا۔ شاید آپ کو یہ میرا بچپنا لگے لیکن مجھے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں تکلیف دیتی ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ دسمبر کی ٹھٹھرتی اور خنک رات میں شبنم کی طرح آنکھوں میں نمی لیے وہ مجھے چھت کے ایک کونے میں بیٹھی ملی۔ بہت ہی کیوٹ اور معصوم سی بلی کو جب بھیگتی آنکھوں سے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ چھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرانی سموئے، پتا نہیں کیوں بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ وہ بہت ہی چھوٹی اور نرم و نازک تھی۔ پہلے ہم نے اسے دودھ دینا شروع کیا۔ جب تھوڑی بڑی ہو گئی تو کبھی مچھلی، کبھی روٹی تو کبھی چاول دیتے رہے۔ جو کچھ ہمارے گھر میں پکتا اس میں اس کا حصہ ضرور ہوتا۔ وہ 2012ء کی اداس اور خاموش رات تھی۔ بلی ہماری محبت پیار کو ٹھکرا کر اسی رات

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابدی نیند سوگئی۔
کہنے کو تو یہ بہت ہی چھوٹی اور غیر اہم بات ہے کہ جہاں انسانوں کا قتل عام کیا جارہا ہے وہاں ایک جانور کی کیا حیثیت' لیکن پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ ہمیں اس سے بہت محبت تھی اور محبت کے حوالے سے جتنا بھی لکھا جائے کم ہی ہوگا۔ کیونکہ محبت تو سمندر سے بھی گہری ہوتی ہے۔

بس آخر میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔
"میں نے اس کی جستجو میں کیا کھویا' کیا گنوایا' کس کو بتاؤں کس کو اپنا یقین دوں کہ یہ ممکن نہیں ہے' کیونکہ میرا سب کچھ تو وہی تھا۔"

2 ۔ اجتماعی اور ملکی حوالے سے اگر بات کی جائے تو مئی 2012ء میں کراچی کے بہت ہی پس ماندہ

علاقے لیاری میں آپریشن کی وجہ سے جب بہت سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو گھروں سے بے گھر کیا جارہا تھا۔ ہمارے بھی بہت سے رشتہ دار ان ہی بے بس لوگوں میں شامل تھے۔

ایسے ہی ایک روز لیاری کے بہت سے رشتہ داروں کو ہمارے گھر آنا پڑا۔ ان کا ہمارے گھر آنا ایک طرف جہاں میرے لیے بہت سی خوشیوں کا سبب بنا' وہیں دوسری طرف ان کی مشکلات' تکلیف اور مسائل سن کر دل خون کے آنسو روتا رہا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کچھ دن اکٹھے رہنے کا موقع ملا جو "عموماً" بہت کم ملتا ہے کیونکہ آج کل بھاگتی دوڑتی زندگی میں ہم اپنوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔

ان چار' پانچ دنوں میں ہم نے بہت انجوائے کیا۔ ساتھ ساتھ موجودہ حالات کی وجہ سے اذیت میں بھی مبتلا رہے۔ آخر کیوں ہماری حکومت خاموش تماشائی کا رول پلے کررہی ہے۔ تلخ حالات میں بھی ہم نے اس وقت کو اچھی یادوں کی طرح گزارا۔

ایک کمرے میں ہم سات' آٹھ لڑکیاں سوتیں رات دیر تک جاگتے' بالکل شادی جیسا ماحول تھا۔ ان خوب صورت لمحوں نے ہمارے جذبات کو سمندر کی طرح پرجوش اور ہماری محبت کو ایک دوسرے کے لیے چٹان کی طرح اور بھی مضبوط کردیا۔ یہ میری زندگی کے بہت ہی خوب صورت دن تھے' جنہیں میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔ ان کے جانے کے بعد گھر ویران سا محسوس ہونے لگا۔

یادیں چاہے اچھی ہوں یا بری' انسان کی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے انسان بری یادوں کو بھول جانا چاہتا ہے اور اچھی یادوں کو بار بار یاد کرتا ہے اور ہر بار ان یادوں کا احساس بہت ہی خوب صورت ہوتا ہے۔

کوثر خالد..... جڑانوالہ

ذاتی حوالے سے گیا سال ہمیں ایک پیاری سی بہو دے گیا۔ ہمارا رابطہ آپ سے یعنی شعاع سے بحال کرگیا۔ جن جن سے میری دوستی تھی اُسے اور مضبوط بنایا۔ خاندانی رنجشوں سے نپٹنا سکھا گیا۔
کھویا کچھ نہیں۔ خدا کے فضل سے پایا ہی پایا ہے۔ کیونکہ دنیاوی لحاظ سے کچھ پانے کی تمنا ہی نہیں۔ صرف ہدایت کی خواہش ہو تو کھونے کا احساس ہو ہی نہیں سکتا۔

اجتماعی حوالے سے جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ علم و دانش میں تو اضافہ ہوا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک پاکستان ہمارے پاس معجزاتی طور پر موجود ہے۔ ظاہر ہے اگر عمل نہیں تبھی تو ہماری دعائیں قبول ہوئیں۔ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرے نے ثابت کردیا کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کم نہیں کیا جاسکتا۔
کھویا کیا ہے۔ ابھی تک عافیہ کھوئی ہوئی ہیں۔

گزرتے سال ہمیں عبرت کا بڑا سامان دیتے ہیں
خدا کا کرم ہو تو نئے نئے الہام دیتے ہیں

ظل ہما..... فیصل آباد

سب سے پہلے سب دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔

1 ۔ گیا سال کیا لے گیا اور کیا دے گیا؟ ایک لمبی کہانی ہے۔ جنوری 2012ء نے مجھے ایم اے پاس ہونے کی خوش خبری دی۔ فروری میں ایم ایڈ بھی مکمل ہوا۔ اس کے بعد پتا چلا کہ بس تعلیم مکمل ہونا کافی نہیں' بلکہ تگڑی سفارش بھی ضروری ہے نوکری کے لیے۔ سو ہم مزید تعلیم کی طرف بھاگے اور ایم اے انگلش کرنے کی ٹھانی' ساتھ ایم فل بھی۔ مجھے بہت سے چہروں کے پیچھے چھپے اصل چہرے بھی نظر آئے اور بہت سے اپنے بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اس سال بھی دوستوں کو بہت مس کیا۔ خاص کر ام رقیہ اور پروین کو (یہ ہمارا کالج گروپ تھا) البتہ ہمارے دل کا موسم بہت باغ و بہار رہا اور آج کل وہاں ہر طرف خاموشی ہے۔
2 ۔ اس سوال کے جواب میں تو بس چند اشعار ہی عرض کیے جاسکتے ہیں۔

سفر کی شب میں جھپٹتی فضا کی دہشت سے
مسافروں کی تھکن کس طرح لڑی ہوگی؟

کٹی پھٹی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر محسن
مجھے یقین ہے کہ خود موت رو پڑی ہوگی
تمام اہل دل کے لبوں اور دل پہ یہ ایک ہی سوال مچلتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اکثر سوچتا ہوں، رہزنوں کے جانشین آخر
حقائق کیا چھپائیں گے، فسانے کیا تراشیں گے

غریبوں کی عدالت مجرموں کو جب بلائے گی
خزانے لوٹنے والے بہانے کیا تراشیں گے؟
اور بس اتنا کہوں گی کہ
دھرتی کے ستاروں کو نیا سال مبارک
اس دیس کے پیاروں کو نیا سال مبارک

جو شدت آلام سے رو بھی نہیں سکتے
ان درد کے ماروں کو نیا سال مبارک
سانحے اتنے ہیں کہ آنکھیں لہو روئیں اور دل پھٹ جائیں مگر یہاں تو احساس ہی پتھر کے ہوگئے۔
کون روئے، کون ماتم کرے؟
اجازت دیجیے۔ (اللہ حافظ!)

ثمینہ اکرم..... کراچی

شاید میں اتنی جلدی اس سروے میں شرکت کے قابل نہ ہوتی۔ اگر جو مجھے معیز کی ایک بات یاد نہ آتی کہ "ممی! آپ اپنے شعاع ڈائجسٹ میں ہر ایک کے بارے میں لکھتی ہیں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں بھی تو لکھیں نا۔" مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اپنے شہزادے کے بارے میں اس کی غیر موجودگی میں لکھوں گی۔

1 ۔ گیا سال یعنی 2012ء مجھے ایک ایسا زخم دے گیا ہے، جس سے تاحیات لہو رستا رہے گا۔

11 نومبر 2012ء کی رات مجھ پر ایک ایسی قیامت ٹوٹی، جس کی یاد مجھے زندگی بھر خون کے آنسو رلاتی رہے گی۔ معیز اکرم اکیس سال کا جوان، معصوم، سادہ، شوخ و شرارتی۔ عام نوجوانوں سے بالکل منفرد جدا۔ بہت محنتی، نیک، فرماں بردار، KICT میں جاب کے ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی سے B.A فائنل کے ایگزام کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا ایڈمٹ کارڈ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ملا۔ پورٹ پر جاب کا بہت ٹف شیڈول ہوتا ہے۔ 11 نومبر اتوار کی صبح حسب معمول صبح آٹھ بجے ناشتا کر کے گھر سے روانہ ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج میں اسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔ میرا شہزادہ معیز اکرم اپنی جاب پر گیا تو اپنے پیروں سے تھا، مگر واپس ایمبولینس میں آیا۔ 11 نومبر کو رات نو بجے جب میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی تو وہ تو نہ آیا، بلکہ بذریعہ فون اس کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع آگئی۔ گھر سے ایک اسٹاپ پہلے ماڑی پور روڈ پر دعا ہوٹل کے قریب اپنے دوست کے ساتھ گاڑی سے اتر

گیا۔ اچانک پیچھے سے آنے والی کسی تیز رفتار گاڑی نے اسے ہٹ کیا۔ جبکہ ڈکیتی کی وجہ سے موبائل بھی وہ اپنے ہمراہ نہیں لے جاتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس اپنی ذاتی موٹر سائیکل تھی۔ وہ تو A-3 سے سفر کرتا تھا۔ اس نے ایمبولنس کے ڈرائیور کو اپنے گھر کا فون نمبر خود بتایا۔ فون پر انہوں نے کہا کہ "آپ کے بیٹے کے پاؤں پر چوٹ لگی ہے، مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ باتیں کر رہا ہے اور ٹھیک ہے۔" سب لوگ اسپتال چلے گئے اور میں گھر پہ جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی۔ اسے بچانے کے لیے دنیاوی سارے وسائل موجود تھے مگر حکم ربی نہ تھا۔ اس کی سانسیں پوری ہوچکی تھیں۔

ایکسیڈنٹ کے ڈھائی گھنٹے تک معیز زندہ رہا اور بالکل اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ کسی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا۔ کمر پر ایک زخم تھا۔ جس کی وجہ سے جسم کا سب خون بہہ گیا۔ مگر میرے بیٹے کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار نہ تھے۔ اس نے مسلسل

آخری وقت کلمہ پڑھا اور اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد کردی۔ میرا بیٹا شہید ہے اور شہید کبھی مرتا نہیں۔ اس کی جان ایسے نکلی جیسے پھولوں سے خوشبو۔ اللہ ہمیں بھی اتنی آسانی کی موت نصیب کرے۔ (آمین) جنت میں اس کے درجات بلند کرے۔ (آمین) اور ہمیں صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

2 ۔ اس سال میں نے اپنی متاع جان کو کھو دیا۔ میرا بیٹا معیز اکرم جو کہ میری پہلی اولاد ہے۔ ماں، باپ کی امیدوں کا مرکز، نیک سعادت مند اولاد۔ اس نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا۔ ابھی نیا گھر بنا تھا۔ زندگی میں کچھ آسانیاں پیدا ہوئی تھیں کہ میرا دل خالی ہوگیا۔ اسے میڈیا رپورٹنگ کا بہت شوق تھا۔ اس کی ڈھیروں تصاویر، مووییز، کمپیوٹر میں موجود ہیں۔ مجھے کبھی بھی یہ نہیں لگتا کہ وہ چلا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آس پاس محسوس ہوتا ہے۔

اس سال 11 نومبر کی رات نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ اگر اللہ نے مجھ میں دین کی اتنی سمجھ نہ دی ہوتی تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنے کا اجر و ثواب، آخرت میں ملنے کی امید میں صبر کر رہی ہوں۔ وہ اللہ کی امانت تھا۔ اسے لوٹا دیا اور پھر میرے مالک نے معیز کی شہادت کی گواہی ہر ہر جگہ سے مجھ تک پہنچائی۔ اس کا تازہ اور فریش خون لحد تک بہتا گیا، جبکہ اس کے خون میں بہت خوشبو تھی۔ اس کا جسم روئی کے گالوں کی طرح نرم و ملائم تھا۔ اس کے چہرے پر اتنا نور اور روشنی تھی، جو آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے، اللہ نے مجھے شہید کی ماں کے رتبہ پر فائز کر دیا۔ میں تو اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پروردگار کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ میرے بیٹے کو شہادت ملی۔ (شکر ہے مالک)

گزرتے سال کا تو پتا نہیں مگر 2012ء جاتے جاتے مجھے ایک احساس ضرور دے گیا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کا لمحہ بھر کا بھی بھروسا نہیں۔ ہم دنیاوی زندگی کے جھمیلوں میں مصروف ہو کر فکر آخرت کو بھلا دیتے ہیں۔ میرا بیٹا جاتے جاتے مجھے فکرِ آخرت دے گیا ہے۔ ہمیں دنیا کا متاع و مال جمع کرنے کے بجائے آخرت کے لیے اچھے اعمال جمع کرنے چاہئیں۔ معیز اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ گیا۔ اپنا کمپیوٹر، سی ڈیز، کیمرا، موبائل فونز، ڈھیروں پرفیومز جنہیں اپنی زندگی میں کسی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتا تھا مگر اب وہ اس فکر سے آزاد ہے کہ اب ان چیزوں کو کون استعمال کرے گا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں دنیا بھر کی معلومات رکھتا تھا۔ ہر وقت نیوز دیکھنا یا پھر حالات حاضرہ کے پروگرامز، جگہ جگہ اپنا نام "معیز استاد" لکھنا بھی اس کا شوق تھا۔ دن میں کئی اخبار زیرِ مطالعہ رہتے۔ اس کے لیے میری سانسیں نوحہ کناں ہیں اور دھڑکنیں بین کر رہی ہیں۔ اللہ اس پر اپنی رحمت نازل کرے۔ (آمین) اجتماعی اور ملکی حوالے سے گیا سال ہمیں بیروزگاری، بڑھتی مہنگائی کا عذاب، بدامنی، بے سکونی، عدم تحفظ، ٹارگٹ کلنگ، سی این جی اور بجلی کی لوڈشیڈنگ، نوجوانوں کے جنازے اور غیر یقینی صورت حال دے کر گیا ہے۔ ہر لمحے کچھ نہ ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ شہری ذہنی مریض بن گئے ہیں، کسی کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں۔

نوال افضل گھمن..... گجرات

گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟ اور آپ نے کیا کھو دیا؟

گزرتے سال آپ کو کیا احساس دے جاتے ہیں۔

1 ۔ ذاتی حوالے سے..... جی جناب! پہلی بات یہ ہے کہ گئے سال مجھے ستائیسویں روزے کو گاڑی ملی سینٹرو، پھر 8 نومبر 2012ء بروز جمعرات میری شادی..... آہ! سب سے بڑی خوشی۔ اپنے پیر شمس صاحب کے ہاتھوں رخصتی اور شاہ صاحب بڑے شاہ صاحب میرے معلم، استاد محترم کے ہاتھوں رخصتی اور اسپیشلی نکاح۔ عالم نہ پوچھیے جب آنکھوں کے سامنے مانگی ہوئی دعا پوری ہو رہی ہو تو..... یہ بس محسوس کیا جاتا ہے۔ لفظوں میں ادائیگی مشکل ہے، بلکہ ناممکن ہے۔

اللہ کی رحمت اور فضل ویسا ہی ملا..... جس طرح میں نے گمان کیا ہوا تھا۔ ہر ایک تعلق سے زیادہ شوہر سے زیادہ سچا، مخلص، اچھا اور پیارا رشتہ کوئی نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے فرینڈ ہو..... دوستی لازوال بندھن ہے..... بے مثال ربط ہے اور صرف بنیاد مانگتا ہے۔ یہ تعلق تو صرف اور صرف بنیاد اعتماد ہے..... یگانگت ہے۔ اعتبار ہے۔ جس کو شک کے پانی سے بچا کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے جیسا گمان کیا، مجھے اس سے بڑھ کر شوہر ملا اور پھر کریم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو مجھ سے جیسا گمان کرتا ہے، میں اس کو ویسا ہی دیتا ہوں اور سچائی میں رب سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ اللہ رب العزت میری خوشیوں کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

2 ۔ کھونے کا احساس ہی اصل چیز ہے کہ ہم کچھ کھو کر کیا محسوس کرتے ہیں، اپنی پیاری بہن کا ساتھ چھن گیا۔ نادیہ پروین گھمن..... اس کی شادی بھی میرے ساتھ ہی ہوئی..... مولا کریم اسے اپنے گھر میں گرم ہوا بھی نہ دے۔ (آمین) سدا خوش رہے۔ (آمین)

3 ۔ گزرتے سال صرف یہی احساس دے جاتے ہیں کہ وقت کی رفتار تمام چیزوں سے زیادہ ہے۔

2 ۔ اجتماعی اور ملکی حالات کے حوالے سے..... واصف علی واصف کا قول ہے کہ پاکستان ایک نور ہے اور نور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس پاک وطن کو زوال نہیں کیونکہ نور کو زوال نہیں۔ سیاست سے

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2013 کے شمارہ کی ایک جھلک

جنوری 2013 کا شمارہ سال نو شائع ہوگیا ہے

- "آنے والا ہے برف کا موسم" سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- "تیرے میرے درمیان" مہوش افتخار کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- "زمین کے آنسو" نگہت سیما کا ناول،
- "ہم سے ہے زمانہ" ثمرہ بخاری کا ناولٹ،
- راشدہ رفعت، قانتہ رابعہ، افراح خان، ایلیا یقین اور ام ثمامہ کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ "نیلم منیر" سے ملاقات،
- باتیں "سجل علی" سے،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے۔

خواتین ڈائجسٹ جنوری 2013 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلچسپی اتنی ہے کہ بس زیرولیول کی۔ غریب عوام کل بھی مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کی چکی میں پس رہے تھے اور آج بھی پس رہے ہیں۔

عروج یوسف..... کراچی

1 ۔ سال پہ سال اس طرح گزر رہے ہیں جیسے دن پہ دن۔ ایک زمانہ تھا جب سال گزرنے میں سال لگ جاتا تھا۔ مگر اب تو لمحوں کی بات لگتی ہے۔ نیا سال آیا..... گیا۔

آپ کا سوال ہے کہ اس سال نے کیا دیا اور کیا لیا..... تو بہت سے خوب صورت لمحے دیے اور بہت سی نعمتیں ملیں۔ آسیہ میری دو سالہ بیٹی کی ہر پیاری بات' ہر کھانے کے وقت عطا کی گئی نعمتوں کی خوشی اور بہت سی چھوٹی بڑی خوشیاں اور دکھ۔ خدانخواستہ ایسا کچھ نہیں ہوا' بس کچھ لمحے ہیں جن کا سوچ کر دل تھم سا جاتا ہے۔ شام کو جب تک یوسف گھر نہیں آجاتے' ایک ان دیکھا خوف دل کو مٹھی میں جکڑے رکھتا ہے۔ جب کوئی بچہ بیمار ہوتا ہے۔ آسیہ کو ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا اور تشخیص نہیں ہو پا رہی تھی وہ دن' یونس کو خسرہ ہوگیا تھا اور ڈاکٹر پہلے سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے۔

اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے خوف بھرے لمحے ہیں۔ (اور احساس تو صرف یہ ہی ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ یا رب آنے والا سال خوشیاں ہی خوشیاں لے آئے۔) اور ابھی ایک ماہ پہلے ابو کا بائی پاس ہوا تھا۔ وہ چند دن' چند برس بن کر گزرے۔ اللہ تعالیٰ میرے سب پیاروں کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

2 ۔ ملکی اور اجتماعی لحاظ سے تو میرے وہی جذبات ہیں جو پوری پاکستانی قوم کے ہیں۔ بے بسی' خوف' امید' دعائیں' یوں لگتا ہے کہ ظلم کی تاریک رات ہے' جو ہر طرف چھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کے لیے خوشیوں کا سورج طلوع فرمائے۔ (آمین)

بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جنہوں نے پوری قوم کو یرغمال بنالیا ہے۔ لوڈشیڈنگ' مہنگائی' ہڑتالیں' فائرنگ' بم دھماکے' غیر یقینی حالات' غیر یقینی صورت حال' صرف اپنے رب کی ذات سے امید ہے کہ وہ ان فرعونوں سے نجات دے دے۔ انہیں تباہ و برباد کردے۔ (آمین)

صومیہ نذیر..... ہری پور' ہزارہ

1 ۔ ویسے تو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں لیکن دل سے پوچھوں تو گزرے سال نے غمگین یادوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ ذاتی زندگی کی بات کروں تو زندگی نے اپنا ایسا روپ دکھایا جو دل و دماغ کے کسی کونے میں نہ تھا۔ جون 2011ء میں فرسٹ ایر کے ایگزامز دینے کے بعد سیکنڈ ایر کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ اچانک جسم پیرالائز ہونا شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو علم ہوا کہ اسپائنل کوڈ میں ٹیومر ہے۔ سرجری تجویز ہوئی اور اگست 2011ء میں اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب آپریشن ہوا۔ پہلے مکمل بیڈ ریسٹ تھی پھر وہیل چیئر کی مدد لی اور پھر سہارے سے چلنا شروع کیا۔ اب الحمدللہ اپنے پیروں سے چلنا شروع کردیا ہے۔ میری ریکوری میں جہاں اللہ کی مدد شامل ہے' وہیں کامیاب سرجن' جدید علاج اور فیملی کی سپورٹ بھی شامل ہے۔ اپنی بہن کی بہت مشکور ہوں' جس نے میری دیکھ بھال کے لیے اپنی پڑھائی چھوڑی۔ ان تمام لوگوں کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے میری بیماری میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

2012ء کے سورج کے طلوع ہوتے ہی دعا کی کہ یہ سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا سال ہو' لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 9 جنوری 2012ء کو ابو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ابو کے چلے جانے سے تو گویا زندگی ویران ہو کر رہ گئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ میرے والد محترم کی مغفرت فرمائے۔

2 ملکی حوالے سے کیا کہوں۔ کوئی اچھی خبر ہے نہیں' صرف مسائل کے انبار ہیں۔ نااہل سیاستدان' کرپشن' غربت' بیروزگاری' دہشت گردی' قتل و غارت کیا نہیں ہے ہمارے ملک میں۔ یہ اللہ کا عذاب ہے۔ جس نظریے کی بنیاد پر یہ ملک بنا' وہ نظریہ تو کہیں گم ہوگیا ہے۔ ملکی حالات پہ کیا دل جلے جملے لکھوں کہ سب باخبر ہیں۔

گزرے سالوں میں پایا بھی بہت اور کھویا بھی بہت۔ دل ملے جلے احساسات سے دوچار ہے۔ کہنے کو کچھ زیادہ نہیں کہ ذہن الفاظ سے بالکل خالی ہے۔ تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ شکریہ

خدا کرے میری ارض پاک پہ اترے
وہ فصل گل جسے کبھی اندیشہ' زوال نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے' کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

نوشین فاطمہ..... کراچی

گزرا سال مجھے کیا دے گیا اور میں نے کیا کھو دیا۔ اگر اس سوال کو میں ذاتی حوالے سے دیکھوں تو مجموعی طور پر اس سال میں نے نہ کچھ کھویا (الحمدللہ) نہ کچھ پایا۔ باقی نرمی گرمی' سرد و گرم' خوشی و غم تو زندگی کے وہ رنگ ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں۔ الحمدللہ اس پر آشوب دور میں یہ سال بخیریت گزر گیا۔ خصوصاً" پے در پے ڈاکوں کے بعد تو یہ بھی میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ اس سال پورا گھرانہ ڈکیتی سے محفوظ رہا۔ یہ تو بات تھی ذاتی حوالے سے۔ جبکہ اگر اجتماعی حوالے سے بات کروں تو ملکی حالات ہماری انفرادی زندگیوں پر حاوی رہے۔ ہر دم ایک خوف کی سی کیفیت رہی۔ بالخصوص کراچی میں تو ہر دم جان جانے کا دھڑکا رہا۔

خوف' ہراس' بارود' موت کا خوف محسن
نہ پوچھ کتنی اذیتوں میں یہ سال گزرا

جب تک گھر کے تمام افراد گھر بخیریت نہ پہنچ جائیں' جان سولی پر ٹنگی رہتی ہے۔ باہر نکلنے پر ہر دم یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ نہ جانے کب کوئی دھماکا ہوجائے۔

بلدیہ ٹاؤن کے المناک سانحے نے تو حقیقتاً" دل دہلا دیا۔ اس قدر اذیت ناک موت کہ قیامت کی آگ کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ انسانوں کی انتہائی بے بسی کے عالم میں اس قدر اذیت ناک حالات میں موت کہ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یوٹیوب پر گستاخانہ فلم کے خلاف احتجاج کے دوران مشتعل عوام نے اپنی ہی قوم کے مسلمانوں کو لوٹ کر اور املاک کو نقصان پہنچا کر عالمی میڈیا کے سامنے اپنے وحشی ہونے پر مہر ثبت کردی۔ اس کے علاوہ بھی اگر اجتماعی حوالے سے گزرے سال پر نظر دوڑاؤں تو کوئی خوش گوار یاد دل پر دستک نہیں دیتی۔

پاکستان وہ ملک ہے جہاں چاروں موسم رنگ بکھیرتے ہیں۔ نعمتوں کی ریل پیل ہے۔ قدرت کی تمام نعمتیں وافر مقدار میں موجود ہیں' لیکن ہم آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کے امن کو تباہ کر رہے ہیں۔ کاش! ہم آنے والی نسلوں کو ایسا پاکستان دیں' جو امن کا گہوارہ ہو' جہاں غربت' بھوک و افلاس کی جگہ خوش حالی' بدامنی کی جگہ امن و سکون ہو' تعلیم و صحت کی بنیادی سہولیات سب کو میسر ہوں۔ نئی منزلیں کھوجنے کے لیے روشن راہیں قوم کے معماروں کے لیے کھلی ہوں۔

اللہ کرے نئے سال کا سورج آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو' معاشرے پر چھائی خوف و ہراس کی پرچھائیں چھٹ جائیں۔ (آمین)

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹی وی فنکارہ اور میزبان

صنم بلوچ سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ صلاحیتوں سے مالا مال پیدا کرتا ہے۔ شوبز میں اگر دیکھا جائے تو ہر شعبے میں نام پیدا کرنے والی شخصیات چند ہی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اداکار ہے تو اداکار ہی ہے اور اگر کوئی ہوسٹ ہے تو پھر وہ ہوسٹ ہی ہے مگر صنم بلوچ میں اداکاری ' ہوسٹنگ اور ماڈلنگ کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مارننگ شو کرنا ایک مشکل کام ہے مگر صنم بلوچ کئی سالوں سے یہ کام بھی بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ صنم کا پروگرام موضوع کے اعتبار سے بالکل تازہ ہوتا ہے۔ کوئی اچھی خبر ہو یا کوئی بری صنم کا پروگرام بروقت ہوتا ہے۔

"کیسی ہو صنم؟"

"بس آپ کی دعاؤں سے اچھی ہوں۔"

"تمہارا مارننگ شو تو بہت کامیاب جا رہا ہے..... کیسا رسپانس مل رہا ہے؟"

"شکریہ ..... جی بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی سے ہی یہاں تک پہنچی ہوں۔"

"کچھ عرصہ قبل تم کسی اور چینل سے بھی پروگرام کرتی تھیں۔ پھر چھوڑ دیا کہ صبح صبح اٹھنا مشکل لگتا ہے..... اب کیا صورت حال ہے؟"

"جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اس لیے چھوڑا تھا کہ واقعی مجھے صبح اٹھنا مشکل لگتا تھا۔ مگر یہ لوگوں کی محبت ہے کہ ان کے اصرار پر دوبارہ آئی ہوں۔ اور اب تو کافی ٹائم ہو گیا ہے مجھے پروگرام کرتے ہوئے۔"

"اب آسانی سے اٹھ جاتی ہو۔"

(ہنستے ہوئے)۔ "جی بالکل ..... اب عادت ہو گئی ہے اور ویسے بھی اسکول کالج کے زمانے میں بھی تو صبح صبح اٹھتے ہی تھے لہٰذا عادت تو تھی 'مگر آرام پرستی نے اس عادت کو خراب کر دیا۔ اب سب کچھ سیٹ ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"مارننگ شو' اداکاری' ماڈلنگ..... تھکن کا کیا حال ہوتا ہو گا... یا خوش حالی ساری تھکن دور کر دیتی ہے؟"

"بات تو آپ کی درست ہے کہ خوش حالی تھکن دور کر دیتی ہے۔ مگر تھکن تو تھکن ہی ہوتی ہے۔ ہر جسم کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا بھی دل آرام کرنے کو چاہتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنی تھکن اتارنے کا وقت مل جاتا ہے؟"

"تم نے مارننگ شو اس لیے بھی چھوڑا تھا کہ اداکاری کے لیے ٹائم نکالنا مشکل ہو رہا تھا اور اب ٹائم مل جاتا ہے۔"

"جی ہاں..... ہر ایک چیز کو ہر کام کو مینج کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب سب کاموں کے لیے ٹائم نکالنا آسان ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کم کم کیوں نظر آتی ہو؟"

"اداکاری تو میرا جنون ہے اور آپ کو پتا ہی ہے کہ میں کم کام کرتی ہوں 'مگر کوشش کرتی ہوں کہ اچھا کام کروں میں سال میں دو یا تین سیریلز کرتی ہوں 'کیونکہ میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ کام کرنے سے ایک تو لوگ بھی بور ہو جاتے ہیں اور پھر کام کا معیار بھی گر جاتا ہے۔ اس لیے کم کام کرو 'مگر اچھا کرو۔ میری اب یہی پالیسی ہے۔"

"کن لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے اچھا لگتا ہے؟ میرا مطلب ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سے ہے؟"

"میں سب کے ساتھ کام کرنے میں ایزی فیل کرتی ہوں۔ کیونکہ ٹی وی اب میرے لیے گھر جیسا ہو گیا ہے بالکل فیملی ماحول ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ کام کرنے کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں 'اس لیے کوئی بھی سیریل سائن کرنے سے پہلے اسٹوری اور اپنا رول دیکھتی ہوں اور پھر ٹیم دیکھتی ہوں۔ اگر سب کچھ پرفیکٹ ہوتا ہے تو پھر اوکے کرتی ہوں۔ جو کام دل کو پسند ہو 'وہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ پھر اسی کا اچھا رزلٹ بھی آتا ہے۔"

"صرف اپنا رول دیکھتی ہو یا سب کا؟"

"سب کا دیکھتی ہوں۔ کیونکہ جب تک مجھے کہانی اور اس کے کرداروں سے واقفیت نہیں ہو گی 'میں پرفارم کیسے کر سکوں گی۔ کہانی پڑھ کر 'دوسروں کے کرداروں کو پڑھ کر اور پھر اپنے کردار کو پڑھ کر کام کرتی ہوں۔"

"کردار کا مشاہدہ کس طرح کرتی ہو؟"

"ایسا کردار جو ذرا عام زندگی سے ہٹ کر ہو 'اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشاہدہ تو ان ہی لوگوں کے درمیان تھوڑا وقت گزار کر کرتی ہوں' لیکن جو کردار روزمرہ زندگی سے ملتا جلتا ہو اسے کرنے میں کوئی دشواری یا پریشانی نہیں ہوتی۔"

"تمہارے کردار' بہت ہی معصومانہ اور دکھی لڑکی کے ہوتے ہیں۔ کیوں؟"

(بے ساختہ ہنستے ہوئے)۔ "شاید میری شکل بہت معصوم ہے۔ بس' مجھے کردار ہی ایسے ملتے ہیں اور مجھے خود بھی سنجیدہ اور دکھی رول کرنا اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔۔۔ اور سچی بات ہے کہ میں بہت حساس دل کی مالک ہوں۔ اسی لیے سنجیدہ کرداروں کو پرفارم کرنے میں مجھے مشکل پیش نہیں آتی۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تم رونے کی اداکاری بالکل نیچرل کرتی ہو؟"

"ہاں نا۔۔۔ نیچرل ہی تو کرتی ہوں۔ میں کب کچھ آنکھوں میں ڈال کر روتی ہوں۔ مجھے تو سچ مچ رونا آجاتا ہے کیونکہ میں اپنے کرداروں کو بہت گہرائی کے ساتھ ابزرو کرتی ہوں۔"

"تمہیں کبھی چالاک' بہت ہی زیادہ فیشن ایبل لڑکی کا رول ملا؟"

"نہیں! ایسا رول ابھی تک تو نہیں ملا۔ ویسے چالاک لڑکی کا کردار تو شاید کرلوں' لیکن اگر زیادہ فیشن ایبل لڑکی کا رول ملا تو شاید نہ کروں' کیونکہ میں اس فیلڈ میں ضرور ہوں۔ لیکن ہماری تربیت اس قسم کی نہیں ہے کہ ہم آپے سے باہر ہو جائیں۔ میں بھی اس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں' جہاں شرم و حیا کی تربیت میری ماں نے دی ہے۔ میرے بھی بہن بھائی ہیں' بزرگ ہیں۔ سب کو ٹی وی دیکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی روایات کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

"ان لڑکیوں کے بارے میں کیا کہو گی جو اس قسم کے رول کرتی ہیں؟"

"میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہوں گی' کیونکہ سب کی اپنی اپنی سوچ اور تربیت ہوتی ہے۔ جو جیسا کام کر رہا ہے' اسے کرنے دیں۔ میرے خیال میں سب اپنے اپنے انداز میں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔"

"ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟"

"جی! بالکل ہوتا ہے۔۔۔ میں سنجیدہ طبیعت کی مالک ہوں تو سنجیدہ رول زیادہ بہتر طریقے سے کرلیتی ہوں۔ اگر بہت زیادہ شوخ و چنچل ہوتی تو رول بھی ویسے ہی کر رہی ہوتی' تو کہیں نہ کہیں تو عکس ہوتا ہی ہے' انسان کی شخصیت کا۔"

"اور ڈراموں میں حقیقت کا رنگ ہوتا ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔ ڈراموں کی کہانیاں ہمارے اردگرد کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو ان میں حقیقت کا رنگ نظر نہیں آتا؟ جو کچھ اس دنیا میں اس معاشرے میں ہو رہا ہے' وہی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ رائٹر حضرات بھی تو اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ وہ وہی کچھ لکھیں گے جو دیکھیں گے۔ ہاں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں' جو حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔"

"ڈراموں میں بہت زیادہ فینٹسی دکھائی جاتی ہے۔"

"نہیں! میں نہیں سمجھتی۔۔۔ آج کل تو کہانیاں اس معاشرے کی ہوتی ہیں جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ جو ماحول آج کل کا ہے وہی دکھایا جا رہا ہے۔"

"آج کل کیا کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"یہ مت پوچھیں۔۔۔ کیونکہ انڈر پروڈکشن کافی کام ہے' مگر کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کون سا پروجیکٹ کب مکمل ہو جائے۔۔۔ اور کب آن ایر ہو جائے۔"

"اب تک کیے گئے ڈراموں میں کون سا بہت پسند ہے؟"

"مجھے تو اپنے سارے ہی ڈرامے بہت پسند ہیں۔ لیکن "دام" اور "کیمسٹری" کا تو جواب نہیں۔ دونوں میں ہی میرے کردار بہت اچھے اور پاور فل تھے اور ناظرین نے بھی مجھے بہت پسند کیا۔"

"مارننگ شوز میں دیکھتی ہوں' تم ہر جگہ آزادی سے چلی جاتی ہو۔ کوئی پریشانی یا ڈر نہیں لگتا کیا؟"

"ڈر یا پریشانی کیسی؟ یہ سب ہمارے ہی تو ہیں۔ ہم انسان ہیں تو یہ بھی انسان ہیں۔ یہ ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہماری عزت کرتے ہیں۔ کیا یہ ہمارے لیے کم خوشی کی بات ہے۔۔۔ اور پھر میں اکیلی نہیں ہوتی پوری ٹیم ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔"

"کبھی کوئی مسئلہ ہوا؟"

"نہیں! اللہ کا شکر ہے' کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل تو ہوتے ہی رہتے ہیں' جن کی ہم پرواہ نہیں کرتے۔"

"پہچان بھی مسئلہ بنی؟"

"نہیں! ابھی نہیں۔۔۔ اور پہچان سب کے نصیب میں ہوتی کہاں ہے۔ میں تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اللہ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھے دولت اور شہرت سے نوازا ہے۔"

"ایسی شہرت کے بارے میں کبھی سوچا تھا؟"

"نہیں جی! کبھی نہیں سوچا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو شوبز میں بھی آنے کا نہیں سوچا تھا۔ میں اپنی شہرت کو بہت انجوائے کر رہی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ شوبز میں کیوں نہیں آنا چاہ رہی تھیں؟"

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق گیتوں کے خوش نوا شاعر

گیت سندر رکوش، مدھر گیتوں کا تازہ مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

سوہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کینوس کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سُر سنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیائیں تخلیق کی ہیں۔

افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پیش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سوہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فاخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہء عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton, Surry, KT67PW. U.K.

Phone: 0044-0208-397-0974

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں چاہتی تھی کہ پہلے میں اپنی پڑھائی مکمل کروں، پھر کوئی کام کروں، مگر لوگوں سے صبر کہاں ہوتا تھا۔ بس! تم آجاؤ..... پڑھائی بھی چلتی رہے گی۔ خوب تسلیاں، ہمت افزائی اور پتا نہیں کیا کیا۔"

"متعارف کس نے کرایا..... اور تعلیم مکمل کی؟"

"آپ کو تو سب معلوم ہے..... چلیں! پھر بھی بتا دیتی ہوں۔ جیسا کہ آپ کو پتا ہے کہ میری بڑی بہن سبین اس فیلڈ میں ہیں جب وہ ریکارڈنگ کے لیے جاتی تھیں تو میں بھی ان کے ساتھ چلی جایا کرتی تھی۔ بس وہیں سے آفرز آتی تھیں، مگر میں انکار کردیتی تھی کہ مجھے تو ابھی کچھ نہیں کرنا۔ لیکن جب بہت کہا گیا تو پہلا پروگرام سندھی میں کیا اور ہوسٹنگ کی۔ آپ کو پتا ہے اس وقت میں کتنی بڑی تھی..... صرف سولہ سال کی تھی..... اور جناب! ایسا نہیں ہے کہ میں تعلیم مکمل کیے بغیر آگئی۔ میں نے گریجویشن مکمل کیا اور پھر باقاعدہ طور پر اس فیلڈ میں آئی۔"

"گڈ..... پھر پہلا سیریل کیا یا سنگل پلے؟"

"کالک..... سنگل پلے تھا جو سید عاطف حسین کی ڈائریکشن میں تھا۔ میرا لیڈنگ رول تھا اور سب نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہی میرے کیریئر کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اس ڈرامے کے بعد ہی بس میں تھی اور بے شمار آفرز۔ ہاں! جب "کالک" کیا تو اس وقت پڑھ رہی تھی اور پھر جیسے ہی پڑھائی ختم ہوئی، بس پھر میں تھی اور یہ فیلڈ تھی۔"

"اچھا..... واہ..... فیلڈ سے ہٹ کر کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"آپ پوچھیں گی تو بتاؤں گی۔ (قہقہہ)..... میں چودہ جولائی کو نواب شاہ شہر میں پیدا ہوئی۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میں پانچویں نمبر پر ہوں۔ میں اور میری بہن ہی اس فیلڈ میں ہیں۔ باقی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ہر وقت کام، کام..... پرسنل لائف کے بارے میں کچھ سوچا؟"

"نہیں! یہ سوچنا والدین کا کام ہے اور جب وقت آئے گا تو سب کام خود بخود آسان ہوجائیں گے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے پتا چل جائے کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے، لیکن پھر سوچتی ہوں کہ اگر کچھ اچھا نہ لکھا ہوا ہو تو پھر باقی کی زندگی پتا نہیں کیسے گزرے گی۔"

"لوگ سوال تو کرتے ہوں گے؟"

"ہاں! کیوں نہیں کرتے۔ مگر فیوچر کس نے دیکھا ہے..... اور میں بھی ایک لڑکی ہوں۔ یقیناً" دو چار سال بعد میرا بھی ایک گھر ہوگا، شوہر ہوگا، بچے ہوں گے۔ سسرال ہوگا، پھر اس لائف کا بھی ایک علیحدہ ہی مزا ہوگا۔"

"ہر وقت بناؤ سنگھار، سجنا سنورنا کیسا لگتا ہے؟"

"میں فطرتاً" بہت سادہ طبیعت کی مالک ہوں۔ یہ بناؤ سنگھار میری مجبوری ہے۔ اس فیلڈ میں کیمرے کے آگے مجھے میک اپ میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ یہ کیمرے کی ڈیمانڈ ہے۔ عام زندگی میں اگر آپ مجھے دیکھیں تو میں آپ کو سادہ ہی نظر آؤں گی۔"

"یوں تو ہر فیلڈ میں برائیاں ہوتی ہیں، لیکن لوگ

اس کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ کیا شوبز کی برائیاں بھی نظر انداز کردینے والی ہوتی ہیں؟"

"اگر انسان چاہے تو فیلڈ کیا اپنے گھر والوں کی، عزیز واقارب کی، دوستوں کی سب کی برائیاں اور خامیاں نظر انداز کرسکتا ہے۔ شوبز میں سب کچھ ٹھیک ہے، مگر یہاں لوگوں میں منافقت بہت ہے۔ آپ کے آگے کچھ ہوں گے اور آپ کی غیر موجودگی میں کچھ، یہاں جب تک آپ "ان" ہیں سب آپ کے ہیں۔ جہاں غائب ہوئے تو "آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل" والی بات ہوجاتی ہے۔"

"لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید....."

"سچ بتاؤں..... بہت تعریف کرتے ہیں۔ کبھی تنقید نہیں سنی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے کام پر تنقید بھی ہو تاکہ میں اور بہتر سے بہتر کرسکوں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ ملتے ہیں تو نہ صرف میرے کام کی تعریف کرتے ہیں، بلکہ بے ساختہ کہتے ہیں "آپ تو اسکرین پہ بہت بڑی نظر آتی ہیں۔ دیکھنے میں تو بہت چھوٹی ہیں۔"

"گھر میں ہوتی ہو تو سب سے زیادہ کس کو ٹائم دیتی ہو؟"

"اپنی امی کو۔ کیونکہ امی کے پاس بیٹھنے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ اس لیے جب بھی گھر میں ہوتی ہوں۔ امی کے ساتھ گپیں مارتی ہوں اور امی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہی کھاتی ہوں، بلکہ فرمائش کرکے پکواتی ہوں۔"

"فضول خرچ ہو؟"

"بہت زیادہ اور اس بات پر امی سے ہمیشہ ڈانٹ پڑتی ہے کہ تم فضول چیزوں پر زیادہ پیسہ خرچ کرتی ہو۔ مگر کیا کروں، جو چیز پسند آجاتی ہے اُسے خریدے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"وہ صنم بلوچ جو کسی زمانے میں گھر میں رہتی تھی اور طالبہ تھی اور اب کی صنم بلوچ جو ایک پہچان رکھتی ہے، اس میں اور پہلے والی میں کیا فرق ہے؟"

"فرق تو کافی ہے۔ پہلے کوئی جانتا نہیں تھا، مجھے..... اب سب جانتے ہیں۔ پہلے میں اتنی بولڈ نہیں تھی۔ اب میں کافی بولڈ ہوگئی ہوں۔ پہلے امی کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی۔ اب ان کی ہر بات کو گرہ سے باندھ لیتی ہوں۔ پہلے تھوڑی ضدی طبیعت کی تھی اب نہیں ہوں۔ پہلے دل چاہتا تھا کہ میں اگر کسی سے ناراض ہوں تو وہ مجھے منائے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ تو کسی بھی فیلڈ میں رہ کر انسان وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سیکھتا ہے اور میں تو جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں، سیکھ ہی رہی ہوں۔"

"اور پہلے غصہ زیادہ آتا ہوگا۔ اب کام آتا ہے۔"

(قہقہہ)..... "آپ کو کیسے پتا چلا؟ واقعی ایسا ہی ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ آج بھی کوئی جھوٹ بولے اور غلط بیانی سے کام لے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ غصہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ غصہ ابھی بھی آتا ہے، مگر جائز باتوں پر۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صنم بلوچ سے اجازت چاہی۔

☼ ☼

WWW.PAKSOCIETY.COM

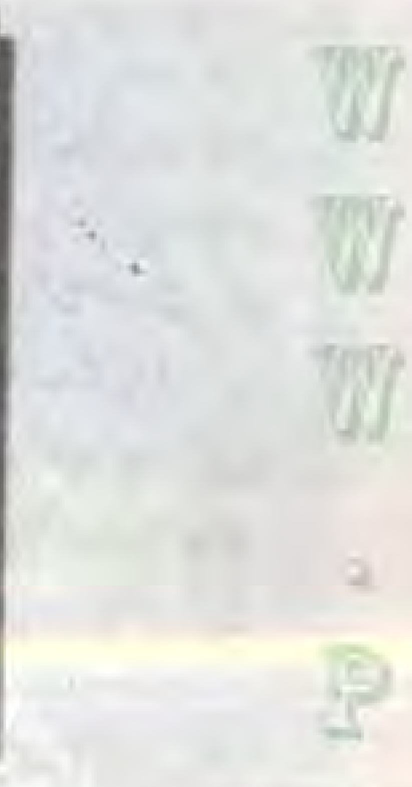

رضیہ جمیل

خط آئے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں

آپ سب کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو، ہمارے پیارے وطن کو اور امت مسلمہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وطن عزیز کا برا چاہنے والوں کو ان کے ارادوں میں ناکام کردے۔ آمین۔

پہلا خط کوٹ مٹھن سے رمشہ خالد خان کا ہے ہماری مصنفین میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ لکھتی ہیں۔

کراچی کے حالات کے بارے میں پل پل ٹی وی پر جو خبریں نشر ہوتی ہیں انہیں سن سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے، روشنیوں کے شہر میں یہ کیسا اندھیر مچا ہے نہ قتل ہونے والے کو خبر کہ وہ کس کے ہاتھوں کس جرم کی سزا پا رہا ہے اور نہ قاتل کو پتا وہ کسے اور کیوں مار رہا ہے۔ یہ آثار قیامت نہیں تو اور کیا ہے ویسے تو پورے ملک میں ہی قہر برپا ہے اور ہم عوام بے بس ہیں مگر کیا واقعی؟

ادھر ہمارے ہاں موسم ان دنوں بہت اچھا ہے، بستر کب کے کھلے آنگن سے برآمدے اور اب کمروں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ پنکھا چلانے کی نوبت شاذ ہی آتی ہے۔ چونکہ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے مگر پورشن سب کے الگ ہیں، رات کو فرصت سے تین چار کزنز مل بیٹھتی ہیں، بات سیاست سے چلتی ہے اور پھر دور تلک جاتی ہے، رات گئے جب ہر طرف خاموشی بکھری ہوتی ہے، ہلکی ہلکی خنکی اور اس میں کھلی رات کی رانی کی مہک "خصوصاً" چاندنی راتوں میں جب جامن کے پتوں سے پھسل پھسل کر چاندنی سارے آنگن میں چٹکی ہوتی ہے، ایسے میں تنہا چائے کا کپ لے کر ستون سے ٹیک لگائے ماحول کے فسوں کو اپنے اندر اتارنا، میں بتا نہیں سکتی کتنا لطف دیتا ہے مگر یہ مزے بھی بس چند ہفتوں کے ہیں، اس کے بعد رات گئے صحن میں دھند کا راج ہوگا۔

ایسے میں موٹی رضائی میں گھس کر کتابیں پڑھنا اور کافی کے سپ لینا مگر یہ کافی بنانے کے لیے کچن تک جانا بڑا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے، وجہ سردی نہیں میری ازلی آلکسی، بھئی اب گرم بستر چھوڑ کر کون جائے۔ ہاں جب سردیوں میں لائٹ جاتی ہے اور ہیٹر کے راڈ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں ایسے میں امی انگیٹھی میں کوئلے دہکا لاتی ہیں تب سب کمرے کے بیچ انگیٹھی کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں، دہکتے کوئلوں کا عکس چہروں کو گلنار کیے دیتا ہے۔

عبداللہ موبائل پر اچھا سا سونگ لگا دیتا ہے پھر ٹھک ٹھک کر آواز سے مونگ پھلیاں کھلتی ہیں، گرم گرم چائے ساتھ میں کبھی گاجر اور کبھی چنے کی دال کا کھوپرے والا حلوہ ماحول کا لطف دوبالا کر دیتا ہے، ان سب کی ملی جلی مہک حواسوں پر سوار ہونے لگتی ہے۔ دل کرتا ہے زندگی کو ان ہی خوشگوار پلوں میں قید کر لوں مگر..... یہ زندگی ہے۔

بس مونگ پھلی کے چھلکے سے کسی ایک پر ڈرون حملہ کرنے کی دیر ہوتی ہے اور جنگ عظیم سوئم شروع۔

ہاتھ میں عموماً "کتاب ہوتی ہے، ساتھ ساتھ نظریں ٹی وی پر بھی بھٹکتی رہتی ہیں، لکھنے کا موڈ ہو تو ذرا قلم بھی چل جاتا ہے، ایسے میں میرا چائے کا پھر سے موڈ بنے تو اسٹیل کے برتن میں سارے اجزا ڈال کر انگیٹھی پر رکھ دیتی ہوں، بنتے بنتے چائے آخر بن ہی جاتی ہے، مل شکری کھانے کو دل چاہے تب بھی نور البم، چینی، پانی اور تل کو کوئلوں پر اور کتاب کے کچھ صفحے پلٹنے کے بعد گرم گرم تل شکری تیار۔

بھئی، میری سرد راتیں تو ایسے ہی گزرتی ہیں، اس بار بھی ایسے گزارنے کا ارادہ ہے، آج کل وزن کم کرنے پہ کوشاں ہوں آخر کو سردیوں میں حلوے کھا کھا کر موٹا جو ہونا ہے، اس لیے بہتر ہے ابھی سے کچھ کم کر لوں، آگے منظور خدا، ویسے کیا کراچی میں بھی ایسی سردیاں ہوتی ہیں؟

سرد راتوں میں اکثر جب رات گئے اپنے کمرے میں سونے جاتی ہوں تو ٹھنڈا بستر جب تک وجود کی حرارت سے گرم نہیں ہوتا، تب تک شہر کے کھلے میدان میں خیمہ زن خانہ بدوشوں کا ناکافی ساز و سامان کے ساتھ کھلے آسمان تلے کپڑے کی چار دیواری اور خیمہ میں موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے کا احساس ستاتا ہے، پھر جوں جوں، بستر گرم ہوتا ہے نیند آ کر ہر احساس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

پیاری رمشہ! نادیہ کا یقین غلط نہیں تھا اگر ہمارے پاس آپ کا فون نمبر ہوتا تو ضرور پوچھتے کہ آپ کیوں نہیں لکھ رہیں۔ "حوا" اس ماہ شامل اشاعت ہے کراچی کے بارے میں کیا کہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ کراچی کے باسی ان حالات کو قبول کر چکے ہیں۔ عادی ہو گئے ہیں یا بے حس کہ کہیں سے بھی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

کراچی میں ایسی نہ ویسی۔ سردی ہوتی ہی نہیں ہے۔ اگر کوئٹہ میں برف باری ہو جائے تو ایک دو دن کے لیے سردی کی لہر آجاتی ہے۔ ورنہ.....

کراچی کو غریب پرور شہر اسی لیے تو کہا جاتا ہے جھگیوں میں فٹ پاتھ پر راتیں آسانی سے گزر جاتی ہیں۔

مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف نے جہلم سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

سب سے پہلے جس کہانی نے لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے دا ون اینڈ اونلی "جنت کے پتے" ہم ہر قسط پڑھنے کے بعد قلم اٹھاتے اور پھر رکھ دیتے کہ تبصرہ آخر کے لیے رکھنا ہے مگر اس قسط نے قلم اٹھانے اور لکھنے پر مجبور کر دیا کیونکہ اس بار کا انکشاف تو بہت ہی چونکا دینے والا تھا کہ۔ میجر احمد + ڈولی + پاشا = جہان۔ قسم سے ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ "ستارہ شام" بھی اچھی جا رہی ہے۔ باقی سب کی طرح ہمیں بھی یہی گلہ ہے کہ ستارہ شام کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں پورا ماہ انتظار کر کے پانچ منٹ میں قسط ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہی انتظار۔ انتظار اور انتظار۔

شعاع کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر نئے لکھنے والے کو موقع ملتا ہے۔ ہر بار فہرست میں نئے نام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مسکان اور امینہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں، آپ شعاع کے ہر سلسلے میں شرکت کر سکتی ہیں۔ شعاع کے صفحات حاضر ہیں۔ شرط صرف ایک ہے اچھا اور نیا انتخاب بھجوائیں۔

عاتکہ یاسمین نے منڈی بہاؤالدین سے لکھا ہے

خط لکھنے کے بارے میں سوچ تو نمرہ احمد کا ناول (جنت کے پتے) پڑھ کر آئی لیکن سوچ کی تکمیل فائزہ جی نے کروائی واہ شان دار..... میں نے اپنی زندگی میں اس سے دلچسپ کہانی کہیں نہیں پڑھی۔

پیاری عاتکہ! آپ کا یقین غلط ثابت ہوا اور ہم نے آپ کا خط ردی میں نہیں ڈالا۔ فائزہ اور نمرہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ لیکن صرف دو کہانیوں پر تبصرہ..... ؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

اقصیٰ بتول۔ نیا لاہور سے لکھتی ہیں

رسالہ ہاتھ میں آتے ہی سرورق پر نظر دوڑائی۔ کیا کمال انداز اور رنگوں کے امتزاج سے موسم کا احساس دلایا جا رہا تھا۔ پھر دوڑ لگائی نمرہ جی کی طرف۔ نمرہ کے ناول کا تجزیہ کرنا کچھ مشکل ہے کہ شاید اس کا حق ادا نہ ہو سکے۔ بہت سارے رنگوں سے مل کر بنا یہ ناول ہمیں بے حد پسند ہے۔ میں نے اس ناول سے بہت کچھ سیکھا ہے شکریہ۔ پھر عالیہ جی کی طرف رخ موڑا۔ دیوار شب کو پڑھتے ہوئے عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ پمفلٹ کا خراب ہو جانا نبیل جیسے مکروہ لوگوں کے منہ پر قدرت کی طرف سے طمانچہ تو پڑنا ہی تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے، زبیعہ اور خیام کی شادی ہی ہوگی۔ افسانوں میں نمبر ون رہا اڈی والی جوتی سائرہ رضا بہت اچھی جگہ بنا رہی ہیں "ایک راستہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی "روایتی گھریلو چپقلشوں پر مشتمل تھی مگر اچھی تھی۔ توازن ہر چیز کے لیے ضروری ہوتا ہے "اک نئی سنڈریلا" بہت اچھا اختتام رہا۔ آغاز بھی اچھا رہا اور انجام بھی۔ فائزہ جی کو مبارک باد "چوکھٹ کے پار" سبق آموز تحریر تھی۔ ایک بھیانک غلطی کے بعد مہر نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ در آید درست آید "تجھ پہ دل ہارا" مزے کی تھی مگر کیا ہی اچھا ہو جو ایسے اتفاقات کبھی حقیقت میں بھی ہو جایا کریں۔ "ستارہ شام" سلو رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی قیاس قبل از وقت ہے جنت بیگم کی تلملاہٹ مزہ دے گئی۔ اس بار کا بہترین ناول "ٹویٹ ٹویٹ" تھا۔ عنیزہ سید کی تحریر ہو اور بہترین نہ ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عنیزہ سید کی تحریروں سے ان کی شخصیت جھلکتی ہے بے حد سلجھی ہوئی' سوبر' سنجیدہ اور درد دل رکھنے والی انسان ہیں۔ لفظوں کا چناؤ اس قدر عمدہ ہوتا ہے کہ قاری کرداروں کا ہر ہر احساس خود پہ محسوس کرتا ہے۔ نظم اور غزل میں صابرہ سیم اور ام ثمامہ نمبر لے گئیں۔ سحرش یوسف کی شاعری کا انتخاب بے حد پسند آیا۔ یہ بتا دیں۔ کیا نمرہ احمد شادی شدہ ہیں؟

پیاری اقصیٰ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ عالیہ بخاری کے ناول کے بارے میں آپ کا قیاس کس حد تک درست ہے۔ یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ قارئین کی اکثریت کی یہ خواہش ہے کہ ربیعہ کی شادی خیام سے ہی ہو۔ راشدہ رفعت کی کہانی جیسے اتفاقات حقیقی زندگی میں عام طور پر تو نہیں ہوتے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

نمرہ احمد شادی شدہ ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ نئی زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

فوزیہ منظور نے کھروڑپکا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

سلسلے وار ناولز میں سب سے پہلے "جنت کے پتے" دس ماہ پہلے جب میں نے اس ناول کا نام پڑھا تھا' بے اختیار سیدھی ہو کے بیٹھی تھی۔ نام ہی اتنا چونکانے والا تھا۔ پہلی قسط سے اب تک میں اس ناول کے سحر سے نکل ہی نہیں پا رہی ہوں یقین کرو' نمرہ! میری زندگی کے بہت سے معاملات' بہت سے الجھاؤ جو واقعی جالے کی طرح میرے دماغ سے چپکے ہوئے تھے۔ ایک دم صاف ہوئے۔ بہت سا ایمان بڑھا۔ اس ذات پر یقین بے تحاشا پختہ ہوا اور اس رب سے تعلق کی ڈور اور مضبوط ہوئی اور آپ کے لیے تہہ دل سے دعائیں نکلیں۔ الفاظ میں طاقت اور اثر تب آتا ہے جب انسان خود باعمل ہو آپ کے شرعی پردہ کرنے کے بارے میں جان کر بہت فخر ہوا۔

اس کے بعد آمنہ ریاض کا ناول "ستارہ شام" پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ کہانی اب نیا رخ لے رہی ہے۔ آپ کو بیٹی کی ڈھیر ساری مبارک باد قبول ہو۔ اس کے بعد فائزہ افتخار کا ناول "سنڈریلا" اتنی شاندار کہانی اتنا ہی شاندار اختتام رہا۔ عالیہ بخاری کے ناول میں کردار چاہے "ثانی ستارہ کا ہو یا سالار کا' چاہے جویا ہو یا اسلام صاحب" یہ سب کردار اتنے وسیع النظر اتنے اعلا ظرف ہیں ان سب کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں صرف یہ بات آئی ہے کہ ایسے کردار ایسے ہی تخلیق نہیں ہو جاتے جب تک ان کرداروں کو تخلیق کرنے والا خود اتنا اعلا ظرف اور باوقار نہ ہو۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔

عنیزہ سید کا "ٹویٹ" پڑھا۔ عنیزہ سید اور نمرہ دونوں ہی ہر مرتبہ اتنے مختلف انداز میں سامنے آتی ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہو جائے کہ پچھلا ناول زیادہ پر اثر تھا یا اب والا۔ آپ کا مطالعہ اتنا وسیع ہے مجھے لگتا ہے آپ کا قلم لفظ منتخب کرنے کے لیے نہیں رکتا ہو گا بلکہ یہ سوچ کر رکتا ہو گا کہ "اس خیال کو لکھوں یا نہ لکھوں' پتا نہیں قارئین سمجھ بھی پائیں گی یا نہیں" سائرہ رضا کو پڑھا' ان کا ہر افسانہ ہی اپنے اندر اتنے معنی' اتنی گہرائی لیے ہوتا ہے کہ دل بے اختیار اثر لیتا ہے۔

"شہزادی عباس" عباس کا ناولٹ تو ایک دم ڈرا گیا۔ کہانی میں منظر کشی اور الفاظ کا چناؤ سب شاندار تھا۔

فرح طاہر کی سبق آموز کہانی پڑھ کر ظاہری سی بات ہے اچھا لگا) راشدہ رفعت کا ناولٹ "تجھ پہ دل ہارا" پڑھ کر سچ مچ دل ہارا تھا۔ اتنی مزاحیہ کہانی تھی یقین کریں نجانے کتنے عرصے بعد میں کھل کر ہنسی ہوں۔

پیاری فوزیہ! تفصیلی تبصرہ اچھا لگا' آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رابعہ تبسم نے ککو منڈی سے لکھا ہے

دسمبر کا شعاع ملا تو چھلانگ لگا کر پہنچے۔ سیدھا "جنت کے پتے" ناول تک! ایسا شاہکار ناول مدتوں بھلایا نہیں جا سکتا۔ مجموعی طور پر دسمبر کا پورا شمارہ ہی بہترین تھا۔ "دیوار شب" اور "ستارہ شام" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ سنڈریلا کا اینڈ اچھا لگا۔ لیکن زینی کا کیا بنا فائزہ جی؟ ٹویٹ ٹویٹ اپنے نام کی طرح منفرد اور اچھا ناول تھا۔ چوکھٹ کے پار شہزادی عباس کی بہترین کاوش تھی۔ افسانے سارے ہی پسند آئے۔

پیاری رابعہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ فائزہ کے ناول میں زینی کا کچھ نہیں بنا تاثر خالی ہاتھ واپس لوٹ گیا زینی کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد اور دوسری مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

روزینہ حسین شاہ پشاور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

پیشے کے لحاظ سے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں' خواتین اور شعاع کی قاری کب سے ہوں یاد نہیں ہے۔ اللہ نے تیسری بار حج کی سعادت نصیب فرمائی ہے۔ اس کا کرم ہے۔ حج سے آکر میں نے سب سے پہلے جس چیز کی طلب کی۔ وہ شعاع اور خواتین تھے۔

شمارہ ماہ دسمبر "باتوں سے خوشبو آئے' قوم عاد کا عذاب" پیراگراف نمبر 3 لائن نمبر 12 حضرت ہود علیہ السلام کی جگہ پر عاد علیہ السلام پرنٹ ہوا ہے۔ عاد تو وہ قوم ہے جس پر اللہ نے عذاب نازل کیا تھا اور ہم اس کے ساتھ علیہ السلام لکھ رہے ہیں گو کہ یہ جان بوجھ کر نہیں ہے مگر احتیاط برتیں۔ "جنت کے پتے" بہت خوب صورت تحریر ہے اللہ تعالیٰ نمرہ احمد کو جزا دے۔

پیاری روزینہ! بہت شکریہ! آپ نے غلطی کی نشان دہی کی۔ سہوا" ہود کی جگہ عاد لکھا گیا ہے اس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے اور قارئین معافی کے خواست گار ہیں۔ قوم عاد کے کھنڈرات کہاں واقع ہیں۔ اس کی تفصیل تاریخ کے سلسلے میں دیں گے۔

شبانہ عابد نے بھاول پور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

آپ کا ڈائجسٹ میں تب سے پڑھ رہی ہوں جب میں نے لفظوں سے نیا نیا رشتہ جوڑا تھا اور آج میں ماشاء اللہ سے بی اے کر رہی ہوں حالانکہ میرا پورا خاندان میرے پڑھنے کے خلاف ہے وہ سمجھتے ہیں ڈائجسٹ پڑھنا وقت کا ضیاع ہے اور کچھ نہیں مگر میں سمجھتی ہوں۔ آج مجھے یہ جو شعور اور آگہی ملی ہے وہ شعاع' خواتین' کرن سے ہی ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل خوب صورت تھا۔ خاص طور پر ماڈل کا ڈریس اور ریڈ لپ اسٹک۔ پہلی شعاع پڑھی جو واقعی پہلی شعاع ہوتی ہے۔

"جنت کے پتے" واہ سچ پوچھیں تو میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں جس سے میں تعریف کروں سلسلے وار ناولز دونوں ٹھیک جا رہے ہیں "اک نئی سنڈریلا" کا اختتام اچھا لگا۔ اتنا اچھا ناول دیکھنے پر فائزہ آپی کو مبارک باد۔ افسانوں میں "اڈی والی جوتی" اور بددعا پسند آئے "ایک ہی راستہ" اور سوچ کا در بھی ٹھیک تھے پلیز آپی عمیرہ احمد اور فرحت اشتیاق سے کہیں کہ وہ بھی اب شعاع کے لیے لکھیں۔

پیاری شبانہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے والد آپ کی خاندانی روایت کے برعکس آپ کو تعلیم دلا رہے ہیں اور انہوں نے ڈائجسٹ پڑھنے پر نہ صرف یہ کہ کوئی پابندی نہیں لگائی' بلکہ ہر ماہ خود لا کر دیتے ہیں۔

میمونہ اختر ولد محمد اسلم نے سکندر آباد (ضلع میانوالی) سے لکھا ہے

دسمبر 2012ء کا شعاع ہمیشہ ہر ماہ کی طرح بیسٹ تھا "سنڈریلا" فائزہ افتخار کا ناول بہت اچھا تھا۔ آمنہ ریاض سے بھی کہیں کہ وہ اپنے ناول کو اختتام پذیر کریں اور باقی سارے ناول اور ناولٹ اچھے تھے میں میٹرک کی طالب علم ہوں اور ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں میرے لیے سب سے دعا کرنے کو ضرور کہیے گا۔

پیاری میمونہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اتنے عرصہ سے شعاع کی قارئین میں شامل ہیں اور اب خود خرید کر پڑھتی ہیں۔ آپ کا پہلا خط ہمیں موصول نہیں ہوا ورنہ جواب ضرور دیتے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قارئین تک آپ کی دعا کی درخواست پہنچا رہے ہیں اور ہم بھی آپ کی کامیابی کے لیے دل سے دعاگو ہیں۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

سب سے پہلے نئے سال کی بہت بہت مبارک باد خدا کرے نیا سال ہم سب کے لیے ذاتی اور اجتماعی حوالے سے بہت بابرکت ثابت ہو (آمین) شادی سے پہلے بھی ارم ناہید کے نام سے مستقل سلسلوں میں شرکت کرتی تھی اور اب شادی کے کافی سال بعد دوبارہ قلم سے ناتہ جوڑا ہے۔

ٹائٹل بہت خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ سب سے پہلے پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں۔ بندھن میں فضا عابد سے ملاقات نے مزا دوبالا کر دیا "دیوار شب" عالیہ بخاری کی لازوال اور اثر انگیز تحریر ہے میرے دل کی ساری دعائیں جویا کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ "اڈی والی جوتی" اور "بد دعا" پراثر تحریریں تھیں۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ "تجھ پہ دل ہارا" اے ون تحریر تھی۔ لیکن ذرا ہٹ کر تھی' ایسا اکثر ہوتا نہیں ہے دونوں کا ایک مزاج کا ملنا عنیزہ سید کا ناول "ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ" بہت زبردست مگر الجھی ہوئی تحریر تھی۔ کئی باتیں غور طلب تھیں میں نے ایسا پرندہ نہیں دیکھا نہ سنا۔ یہ کہاں پایا جاتا ہے۔ "چوکھٹ کے پار" بے حد سبق آموز تحریر تھی "اک راستہ ہے زندگی" میں الجھے اور ٹیڑھے راستوں پر چلتے چلتے نادیہ نے بالآخر صحیح راستہ ڈھونڈ ہی لیا۔

پیاری ارم! عنیزہ سید نے جس علاقہ کا کہانی میں ذکر کیا ہے۔ وہ پرندہ اسی علاقے میں پایا جاتا ہو گا لیکن کہانی میں کسی مخصوص پرندے کی اہمیت واضح کرنا مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ انسان کس طرح اپنے حالات کے تحت یا کسی ذہنی کیفیت کے زیر اثر یا بے جان چیز سے توہمات وابستہ کر لیتا ہے۔ کہانی کا مقصد یہ تھا کہ ایک لڑکی جو بیوہ ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے فطری جذبات و احساسات سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ اسے نئی زندگی شروع کرنے کا حق دینا چاہیے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ٹنڈو محمد خان سے عائشہ نے لکھا ہے

آج سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا لکھوں۔ ان دو مہینوں کے درمیان ہم پر قیامت گزر گئی۔ میری بہن ندا جس کی شادی کو صرف 9 مہینے ہی ہوئے تھے۔ اس کے شوہر اچانک دماغ کی نس پھٹ جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 26 سال تھی۔

ان کے انتقال کے صرف 13 دن بعد اس کی بیٹی زینب پیدا ہوئی۔ باجی ہم پر تو قیامت ہی گزر گئی۔ میری بہن ندا ہر وقت اپنے شوہر کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔

پیاری عائشہ! آپ کی بہن پر جو سانحہ گزرا' وہ واقعی بہت المناک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کے لیے زندگی میں آسانیاں پیدا کرے اور وہ بچی جو پیدائش سے پہلے یتیم ہو گئی' اس کے نصیب میں ڈھیر ساری خوشیاں ہوں۔

کھوسکی سے صبا راؤ نے لکھا ہے

سب سے پہلے "پہلی شعاع" پڑھی جو واقعی شعاع ہے چھوٹی بات پر کھری بات اور پراثر۔ "جنت کے پتے" بہت زبردست ناول ہے۔ لیکن اس ماہ قسط پڑھ کر تو شاک لگ گیا کہ احمد' پاشا' ڈولی سب کچھ ایک جہان ہی ہے۔ عالیہ جی اب جلدی سے معاذ کو جویا سے اور خیام کو اپنے والد سے ملوا دیں۔ "ستارہ شام" میں کبھی کبھی ہادی کا کردار عجیب سا لگتا ہے اور کبھی بہت پاور فل۔ خیر کہانی بہترین ہے۔ فائزہ جی نے بھی دل خوش کر دیا۔ معصوم' شرارتی اور خواہشوں میں ڈوبی میشا کا کردار بہت پسند آیا۔ اس ماہ کے شمارے میں "ٹویٹ ٹویٹ بہت پسند آیا۔ افسانوں میں "اڈی والی جوتی" نمبر لے گیا۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ یہ ہماری پرانی رائٹرز ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ عمیرہ احمد' رخسانہ نگار' مریم عزیز' ماہا ملک' راحت جبیں' سعدیہ رئیس' پلیز واپس آ جائیں۔

اور اس ماہ عفیفہ خیام کا خط بھی بڑا پسند آیا "رحمانیہ منزل" محبتوں سے لبریز۔

پیاری صبا! ہم بھی اپنی پرانی رائٹرز کے شدت سے منتظر ہیں۔ آپ کا پیغام ان تک پہنچا رہے ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جویریہ تبسم لکھتی ہیں

"جنت کے پتے" بہت اچھی کہانی ہے۔ "بد دعا" افسانہ بھی اچھا تھا۔ میشا کو فائزہ نے ٹھیک ٹھکانے پر لگایا۔ میں نے پچھلے مہینے ایک افسانہ "دنیاوی ابلیس" بھیجا تھا۔

پیاری جویریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی کے لیے معذرت۔ فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

ربیعہ ابرار نے لکھا ہے۔

اس خط کے توسط میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہ رہی ہوں کہ UMS کے بجائے کیا ہم اپنی تحریر کوریئر سے بھیج سکتے ہیں اور قسط وار کہانی کے لیے ایک ایک کر کے قسط بھیجی جائے یا تمام اقساط یک مشت۔ ویسے میں نے رسالے میں کبھی "اشاعت سے معذرت" والا صفحہ بھی نہیں دیکھا تو کیا مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جانا چاہیے کہ آپ کو بھیجی گئی ہر تحریر رسالے میں جگہ پا لیتی ہے بصورت دیگر ہمیں پتا کیسے چلے گا کہ ہماری تحریر مسترد کر دی گئی یا اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔

ربیعہ کہانی بھجوانے کا طریق کار ہم متعدد بار بتا چکے ہیں۔ بڑی حیرانی ہوتی ہے جب یہ سوال بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کہانی آپ کوریئر سے بھی بھجوا سکتی ہیں۔ طریق کار یہ ہے لفافے میں کہانی ڈالیں اور اس پر ایڈریس لکھیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔ اور پوسٹ کر دیں۔

پوری کہانی مکمل کر کے بھجوائیں۔ قسطیں نہیں' اشاعت سے معذرت والا صفحہ پرچہ میں اس لیے شامل نہیں کرتے کہ اگر کسی کی کہانی ناقابل اشاعت ٹھہرے تو اسے اپنے دوست احباب کے سامنے خفت نہ اٹھانی پڑے۔

کہانی کے بارے میں آپ فون کر کے پتا کر سکتی ہیں۔ نمبر یہ ہے 32721666 یہ کراچی کا نمبر ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر سے فون کر رہی ہیں تو کوڈ 021 لگائیں۔

اقرا' عروج' سعدیہ' عائشہ' منال اور خدیجہ نے فتح پور ضلع لیہ سے لکھا ہے۔

ماڈل اتنی پیاری لگ رہی تھی معصوم سی۔ زیور سے پاک واہ۔ نمرہ احمد کا ناول زبردست ہے بھئی۔ ہائے سنڈریلا ختم بھی ہو گئی۔ اتنی جلدی فائزہ جی۔ اتنی جلدی میشا کی معصوم باتیں ختم کر دیں ——— "ستارہ شام" ٹھیک ہی تھا۔ دیوار شب میں اب مزا آ رہا ہے۔ ٹویٹ ٹویٹ اتنا خاص نہیں لگا۔ "تجھ پہ دل ہارا" راشدہ رفعت کا عجیب سا ناولٹ تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہو جائے' وہ بھی شادی کے معاملے میں اور آپ خاموش رہیں حد ہے بھئی پاگل پن کی۔ کنیز نبوی سے بھی کچھ لکھوائیں۔ خوبصورت بننے میں ورزش اور یوگا کا طریقہ تفصیل سے بتا دیں۔ ڈائجسٹ میں تھوڑا بہت چینج کریں پلیز۔ سالوں سے ایک ہی جیسا دیکھ دیکھ کر اب بور ہو گئے۔ ہر ماہ ایک جیسا لگتا ہے۔

باتوں سے خوشبو آئے اور دوسرے سلسلوں میں کس طرح شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی بتا دیں۔

ندا یاسر اور یاسر نواز کا دونوں میاں بیوی کا انٹرویو شامل کریں پلیز۔ شاہین رشید آپ سے میری سب سے بڑی فرمائش۔

آپ لوگوں کی یہ بات بہت عجیب لگی کہ ڈائجسٹ آپ کو ہر ماہ ایک جیسا لگتا ہے جبکہ ہر ماہ مختلف مصنفین کی نئی اور دلچسپ تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

انٹرویو کی فرمائش شاہین تک پہنچا رہے ہیں۔

شعاع کے سلسلوں میں شامل ہونے کے لیے جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ آپ علیحدہ کاغذ پر اپنا انتخاب لکھ کر خط کے ساتھ ہی لفافے ڈال دیتیں' اس کے لیے علیحدہ لفافے کی ضرورت نہیں ہے۔

سونیا ربانی نے قاضیاں محلہ بالا سے لکھا ہے۔

اس بار نہ دسمبر میں اپنا پن' اداسی' ویرانی اور سنسانی محسوس ہوئی اور نہ اب جنوری کی آمد ہے تو لگ رہا ہے کہ نیا سال آ رہا ہے' ایک سے دن ہیں ایک سی رات' ایک سے حالات' کچھ بھی بدل نہیں رہا' مگر دعا ہے کہ

سال نو میں اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل' سارے دریچے دھو جائے

شعاع سچ مچ میرے لیے شعاع ہے اب دیکھتے ہیں کہ جو تربیت شعاع نے میری کی ہے آگے چل کر کتنا میرے کام آتی ہے' ممکن ہے اس آنگن' ان رشتوں اور اپنوں کے ساتھ شعاع سے بھی ساتھ چھوٹ جائے مگر میرے فیورٹ ناول؟ مجھے سب کا اینڈ پڑھنا ہے' خیر دیکھتے ہیں' مگر میں نے شعاع کا شکریہ ادا کرنا ہے' اسکول کے بعد فارغ وقت میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کتابوں اور ڈائجسٹ کے نام رہا، جن میں پہلے شعاع، پھر خواتین اور آخر میں کرن شامل ہوا اور کوئی شک نہیں کہ اچھے برے میں فرق، خود کو زمانے سے بچا رکھنے کا طریقہ اور دلوں میں جگہ بنانے کا فن۔ ان ڈائجسٹ سے ہی حاصل

ہوا۔ امی کے بعد میری تربیت میں ان ہی رسالوں کا ہاتھ ہے سو شکریہ میرے عزیز ڈائجسٹ۔

پیاری سونیا! ایک نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے دل میں خدشات تو ہوتے ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد اور والدین کی دعائیں ساتھ ہوں تو زندگی کا یہ موڑ خوشیاں لے کر آتا ہے۔ آپ پورے اعتماد اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کریں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

انعم اعجاز اپنے گاؤں جھامکے ضلع شیخوپورہ کا تعارف کرا رہی ہیں۔

اس ماہ میں آپ کو اپنے گاؤں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میرا گاؤں جھامکے ایک بہت ہی بڑا گاؤں ہے۔ اس میں آج کے دور کی تمام سہولتیں موجود ہیں سوائے اسپتال کے، لیکن ہمارے گاؤں کی ایک بات جو مجھے اچھی نہیں لگتی وہ ہے۔ گاؤں کے مردوں کا عورتوں پر اعتماد نہ کرنا۔ یہاں گاؤں میں لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں، میں آپ کو اپنے "ورک ولا" کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ ہمارا یہ "ورک ولا" میرے دادا ابا کے ابا نے بنوایا تھا۔ اس وقت سے اب تک ہمارے ولا میں بہت سی تبدیلیاں بھی ہوئی، لیکن رشتوں میں محبت نسل در نسل ویسے ہی رہی، بلکہ بڑھتی گئی۔ ہمارے "ورک ولا" کی ایک بات جو مجھے بے حد پسند ہے کہ ان لوگوں (میرے دادا ان کے بعد تایا اور ابو اور چاچو) نے اپنے خاندان کی پرانی روایات کو آج تک سینے سے لگا کر رکھا ہے اور میرے تایا اور ابو لڑکیوں کو پڑھانے کے حق میں ہیں۔ میرے ابو نے مجھے بھی آئی کام کروایا ہے۔ میری بڑی بہن نے بھی آئی کام کیا ہے، میرے ابو ہمیں آگے بھی پڑھانا چاہتے تھے لیکن میرے چاچو اور میری پھوپھیوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے میں آگے نہیں پڑھ سکی۔ پہلے تو انہیں میرے شعاع اور خواتین پڑھنے پر بھی اعتراض تھا۔

انعم! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی، لیکن یہ افسوس ناک بات ہے کہ آپ کے گاؤں کے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف ہیں، اب اتنی تبدیلی تو آئی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر ان کے خیالات بھی بدل جائیں۔ آپ نے انٹر تو کرلیا ہے۔ اب آگے پرائیویٹ بھی تعلیم جاری رکھ سکتی ہیں۔

نایاب سعید ڈی آئی خان سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے۔

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے آتے ہیں "جنت کے پتے" کی طرف۔ نمرہ جی! آپ نے یہ کیا کردیا۔ عبدالرحمان پاشا کو جہان کے روپ میں دیکھ کر بالکل اچھا نہیں لگا۔ ہمیں تو وہی جہان پسند تھا۔ باقی حیا کا کانفیڈنس بہت اچھا لگا۔ فائزہ جی! آپ نے بھی اک نئی سنڈریلا کا اینڈ اچھا نہیں کیا۔ شروع میں تو کہانی بہت اچھی رہی۔ اینڈ پڑھ کر مزا نہیں آیا۔ اس کے بعد آمنہ جی کا "ستارہ شام" پڑھ کر ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ باقی تمام ناول اور افسانے بھی اچھے تھے۔

پیاری نایاب! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

آسیہ قادر نے کوئٹہ کینٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ خاص طور پر پیچھے کا منظر۔ سب سے پہلے دوڑ لگائی فائزہ افتخار کے ناولٹ "اک نئی سنڈریلا" کی طرف واہ جی! بہت خوب صورت اینڈ کے ساتھ آپ نے ہمارے دل جیت لیے۔ عنیزہ سید کا ناول کچھ خاص دل کو نہیں بھایا۔ "چوکھٹ کے پار" ناولٹ بہت پسند آیا۔ بہت سبق آموز کہانی تھی۔ "تجھ پہ دل ہارا" بس سو سو تھا۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت پسند آئے۔ غرض ہمیشہ کی طرح پورا شمارہ ہی بہت زبردست تھا۔

پیاری آسیہ! آپ ہماری مجبوری کو جانتیں تو کبھی بھی ناراض نہ ہوتیں۔ محدود صفحات میں سارے خط شامل کرنا ممکن نہیں۔ اسی لیے کچھ خط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات کا یقین رکھیں کہ آپ کی رائے ہم تک پہنچ جاتی ہے، کیونکہ ہم تمام خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

نیلم شہزادی نے کوٹ مومن سے لکھا ہے۔

السلام علیکم! اس امید کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں کہ شامل ہوگا۔

ہے فرض قتیل ان پہ میرا جان چھڑکنا
پر وہ میری کچھ حوصلہ افزائی تو کر جائے

کسی ایک کو بہترین کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ نمرہ احمد اور تمام کی تمام مصنفین حیات کی رمز آفرینی سمجھاتی ہیں۔ یہ سب ہماری اتالیق ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر گھر جاکر ہر ماں سے کہوں کہ خدارا اپنی بیٹیوں کو رسالے پڑھنے سے نہ روکیں۔ خاص طور پر آپ کے رسالے۔ یہ تو لڑکوں کو بھی پڑھنے چاہئیں۔

پیاری نیلم! ہم اپنی تمام قارئین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔

اے آر راحیلہ منظر نے جھموٹی سے لکھا ہے۔

پیاری باجی! مجھے لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ لکھنا میرا جنون ہے۔ باجی! مجھے شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔ تھوڑا بہت لکھ بھی لیتی ہوں۔ باجی! کیا میں اپنی اسٹوری شعاع کے لیے بھیج سکتی ہوں۔

راحیلہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ نے جو کہانی لکھی ہے بھجوادیں۔ اگر قابل اشاعت ہوئی تو شعاع میں ضرور جگہ دیں گے۔ کہانی صفحے کے ایک جانب اور لائن چھوڑ کر لکھیں۔

فوزیہ بی بی نے تونسہ شریف سے لکھا ہے۔

آپ کے تمام سلسلے بہت اچھے جارہے ہیں۔ تمام رائٹرز بہت ہی زبردست لکھتی ہیں، لیکن میری موسٹ فیورٹ رائٹر صرف عمیرہ احمد ہی ہیں، ہر دفعہ ایک نیا اور دل کو چھو لینے والا انداز ہوتا ہے۔

پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

آمنہ اعوان نے گاؤں شینلہ سے لکھا ہے۔

سب سے پہلے آمنہ جی کا "ستارہ شام" پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ مجھے نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" پسند ہیں۔ شعاع ڈائجسٹ کے سب ہی ناول اور ناولٹ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دسمبر کا اختتام ہے اور میری رب سے دعا ہے کہ آنے والا سال پاکستانیوں کے لیے بہت بہت ساری خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

آمنہ! آپ کی نانی اماں درست کہتی ہیں حسن واقعی سادگی میں ہی ہے۔ اب دیکھ لیں، آپ کا سادہ سا خط شامل اشاعت ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رابعہ اور ایمان نے فاروق آباد سے لکھا ہے۔

ظل ہما فیصل آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے ایک نئی سنڈریلا کی جانب بڑھے اچھا اختتام رہا۔ عالیہ جی پلیز جویا کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔ سائرہ رضا کا افسانہ بہت زبردست رہا انسان واقعی دل کا رئیس ہونا چاہیے۔ مگر افسوس ہوا کہ سانولی کا رشتہ ایسے لوگوں سے جڑا۔ "بددعا" بہت ہلا دینے بلکہ دہلا دینے والی تحریر تھی۔ راشدہ رفعت کا ہلکا پھلکا سا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ ہماری پیاری سی دوست فرح طاہر کا افسانہ زبردست رہا۔ عنیزہ سید تو ہمیشہ اچھا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ولی امام کا کردار بہت اچھا لگا۔ "چوکھٹ کے پار" بہت سبق آموز تحریر تھی۔ سعدیہ ملک سسرالی رشتوں کے داؤ پیچ سمجھا رہی تھیں۔ "ستارہ شام" کافی ٹرن رہا کہانی میں آگے دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔ "جنت کے پتے" بہت زبردست تحریر ام تمامہ کی نظم بہت زبردست تھی۔ ہاں ٹائٹل بھی بہت زبردست تھا۔

ظل ہما! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر رائے کا اظہار کرتی رہیں گی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عالیہ بخاری

دیوارِ شب

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی ٗنگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے۔ جس سے اس کی شناسائی ہے ٗجو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے ٗجس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار ٗلاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

قسط: ۵۸

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ابا اور معاذ پچھلے گارڈن میں ہوں گے پھر' اگر کمرے میں نہیں ملتے تو وہیں ہوتے ہیں صبح کے وقت۔" اس نے بولتے ہوئے مڑ کر چائے کا کپ اٹھایا۔ "میں آپ تینوں کے لیے وہیں چائے لے آتی ہوں۔"

"میرے آنے سے آپ کا کام بڑھ گیا۔"

دروازے کی طرف جاتی ربیعہ نے چونک کر خیام کی طرف دیکھا۔ اتنے عرصے میں وہ جتنی بار بھی یہاں آیا' محض چند لفظوں سے زیادہ وہ کبھی بھی اس کے منہ سے اور کچھ نہیں سن پائی تھی۔ سو پھر آج یہ کیسی بات برائے بات؟

"کیا ہوا؟" ربیعہ کی حیرت کو نوٹ کر کے وہ شرمندہ سا ہوا۔

"کچھ نہیں' اصل میں آپ بولتے نہیں ہیں نا' اس لیے عجیب سا لگا۔" اس بار ربیعہ کو فوراً" اپنی بات کے بے تکے پن نے شرمندہ کیا اور وہ خیام کی مسکراہٹ کو دیکھنے کے لیے وہاں رک بھی نہیں سکی۔

خیام بے ساختہ ہنستا ہی چلا گیا۔

دروازے پر پڑا پردہ ابھی تک ہل رہا تھا۔

سر کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے اس نے خود بھی باہر جانے کے لیے قدم بڑھایا تھا کہ سامنے الماری میں لگے قد آدم آئینہ میں دکھائی دیتے عکس نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔

چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ابھی بھی نمایاں تھی اور ایسے میں وہ خود اپنے آپ کو بے حد اجنبی سا لگا۔

معاذ کے ہمراہ گزرتے زندگی کے اس دور میں' جب ہلکی سی مسکراہٹ اس کے حصے میں آنے لگی تھی۔ تب بھی وہ اس طرح پورے دل کے ساتھ ہنسنے کی ہمت تو کیا خواہش بھی کبھی نہیں کر پایا تھا۔ مگر اس وقت' اک عمر کی بدنصیبی کا رونا جیسے کچھ لمحوں کے لیے پس پشت چلا گیا تھا۔

وہ ربیعہ کی بات کو یاد کر کے ایک بار پھر سے مسکرایا۔ مگر اس بار افسردگی غائب تھی۔

"کوئی تک بھی تھی بھلا؟" اس نے خود کو سختی کے ساتھ سرزنش کی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

عافیت اسی میں تھی کہ خود سے بھی نگاہ بچا کر چلا جائے۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر کر پچھلے گارڈن تک جاتے ہوئے اس نے خود کو مربوط رکھنا چاہا تھا۔

"آؤ بیٹا خیام!" ابا موسمی پھولوں سے لدی کیاری کے ساتھ ہی بید کی کرسی پر بیٹھے تھے اور معاذ ان کے قریب دیوار کے ساتھ بنی منڈیر پر۔

اسے آتا دیکھ کر دونوں ہی جس محبت سے مسکرائے تھے۔ وہ خیام کو پچھلی رات کے اپنے رویہ پر شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! جیتے رہو' بیٹھو۔" میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" ابا نے قریب پڑی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا' لیکن وہ معاذ کے قریب منڈیر پر ہی بیٹھا۔

معاذ نے دھیرے سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"نیند تو ٹھیک آئی؟"

"جی!"

"رات تمہیں بخار تھا۔ ابھی ناشتے کے بعد میرے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلنا۔" معاذ کا ہاتھ ابھی تک اس کے کندھے پر تھا۔

"میں ٹھیک ہوں معاذ بھائی!" وہ اطمینان دلانا چاہ رہا تھا' لیکن یہاں کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"معاذ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم ڈاکٹر کو دکھا آؤ گے تو مجھے بھی تسلی ہو جائے گی۔۔۔ رات میں کتنی دیر پٹیاں رکھیں' تب کہیں جا کر تمہارا بخار اترا تھا۔" وہ دونوں ہی فکر مند تھے۔ خیام کی نگاہ جھکی تھی۔

"آئی ایم سوری!"

معاذ ہلکے سے ہنس پڑا "کس بات کی معذرت۔۔۔ کیا بخار ہو جانے کی؟"

"نہیں! بلکہ۔۔۔" اس نے سر اٹھا کر کچھ کہنا چاہا تھا۔ تب ہی وہ ایک بار پھر آتی دکھائی دی۔

"لو بھئی! چائے بھی آگئی۔" ابا ربیعہ کو آتا دیکھ کر خوش دلی سے بولے۔

"السلام علیکم ابا!"

"وعلیکم السلام بیٹا! خوش رہو ہمیشہ۔"

معاذ اور ابا ربیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک سے محسوسات سے گزرے۔

"بس فقط تھوڑا عرصہ اور۔۔۔"

چائے کے خوشبو اور بھاپ اڑاتے کپ ان تینوں کو دیتے ہوئے ربیعہ نے ان کی خاموشی کو دل پر محسوس کیا تھا۔

وہ سب ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ کوئی بار کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔۔۔ اب آج کل تو جیسے یہ حساسیت عروج پر پہنچ رہی تھی اور سب ہی ایک دوسرے کو تکلیف سے بچانے میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں۔

"ربیعہ بیٹا! خیام سے ملیں؟ رات ہم اسے ساتھ لے آئے تھے۔" ابا نے پتا نہیں اسے نارمل کرنا چاہا تھا یا خود کو۔

ربیعہ مسکرا دی۔ "ہم ابھی ملے تھے ابا! کچھ دیر پہلے۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ یہ آئے ہوئے ہیں۔"

"تمہاری سسرال کے استقبال کی تیاری ہم دونوں ہی مل کر کر سکیں گے نا۔ ابا نے تو ایک لمبی لسٹ تیار کر کے دے دی ہے کاموں کی۔ جلدی سے ناشتا بناؤ۔ تاکہ ہم نکلیں گھر سے۔۔۔ اب تو مہینے بھر کے لیے آرام کا لفظ ہی ہماری زندگی سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے خیام!"

معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے خود پر مصنوعی تھکن سی طاری کی۔ ربیعہ نے حسب توقع فوراً" ہی برا مانا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔۔۔ ابا! انہیں تو کوئی کام سپرد مت کیجئے گا۔ ساری زندگی احسان جتاتے رہیں گے مجھ پر اور میں ابھی صاف کہہ رہی ہوں کہ۔۔۔"

خیام نے بے ساختہ ہی ایک نگاہ ربیعہ پر ڈالی تھی۔ جھنجلائی ہوئی تیز تیز بولتی ہوئی۔

"غصہ نہیں کرتے بیٹا! عادت پتا تو ہے بھائی کی۔" ابا نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تم سے۔"

"کوئی نہیں کرتے۔"

"ربیعہ ربیعہ۔۔۔" کھڑکی میں سے امی آوازیں دے رہی تھیں۔

وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس اندر چلی گئی۔

خیام نے ابا اور معاذ' دونوں کی مسکراہٹ کو چند لمحوں میں پھیکی پڑتی محسوس کی۔

"کل سے ان شاء اللہ تمہارے نئے اسکول کی باقاعدہ کلاس شروع ہو جائیں گی۔۔۔ ایڈمیشن ابھی کچھ دن اور چلیں گے یا پھر اب بند کرو گے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابا نے شاید جان بوجھ کر موضوع بدلا تھا۔
خیام خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سنے گیا۔
معاذ کے پاس کبھی بھی آئیڈیاز کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی بہت کچھ کی گنجائش تھی۔ مگر وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔
گزشتہ شام سے اب تک بہت کچھ تھا جو تیزی سے گڈمڈ ہوا تھا اور زندگی میں پھیلا ہوا الجھاؤ اور بھی گہرا۔
خالی خالی نگاہوں سے ابا اور معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے خیام کو ان کی باتوں کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا حالانکہ اس نے پورا دھیان لگا کر ان کی باتوں میں دلچسپی لینا چاہی تھی، مگر نہیں۔
اور وہ لوگ آخر کیوں نہیں اس سے کل شام کے بارے میں پوچھتے۔ اس کی غیر موجودگی، اس کی خستہ حالی کسی پر بھی کوئی ایک سوال کیوں نہیں اٹھایا گیا اب تک.....
کوئی تو پوچھے اس سے۔
کسی حوالے سے سہی۔
دل سے اٹھتی آواز میں اور بھی شدت تھی۔
خیام نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔
"ابا! میں آپ لوگوں کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"
ابا اور معاذ دونوں ہی نے بیک وقت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں ابا..... سب کچھ۔"
اس نے بڑی تیزی سے بات کو دہرایا، جیسے ابھی نہ کہا تو شاید پھر کبھی نہ کہہ سکے گا۔
ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو حیرت انگیز طور پر بے حد پرسکون محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خیام وہاں ہے سالار! اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔" صبح ناشتے پر ایک بار پھر اسے یاد آیا۔ وہ کل سے اتنی حیران تھی کہ حد نہیں۔ سالار ہنس پڑا۔
"ضرور ہوگا۔ میں نے کب کہا ہے کہ وہ نہیں تھا۔ بس مجھے دکھائی نہیں دیا....."
"دیکھا..... آپ پھر مذاق اڑانے لگے۔" وہ تھوڑی سی ناراض ہوئی۔ "کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں یوں ہی وہم کا شکار ہو رہی ہوں..... یا میرا اب بھی دماغ اتنا خراب ہے کہ....." بات ادھوری چھوڑ کر اس نے بے زاری سے سر جھٹک کر کسی امکان کو رد کیا۔
سالار کو اس بار پہلے سے بھی زیادہ ہنسی آئی تھی، لیکن اس کی مزید ناراضی کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔
"میں اپنی پیاری پیاری بیوی کے لیے کچھ بھی ایسا ویسا سوچ کر بے ادبی کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں؟"
گیتی کو اب بھی مذاق اڑانے کا سا شبہ ہوا تھا۔ لیکن سالار کی محبت لمحوں میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور رکھتی تھی۔
بڑے ہی غیر محسوس انداز میں وہ ذات کی تبدیلی کے عمل سے گزری تھی۔ اب تو سوچ کر بھی کوفت ہوتی تھی کہ وہ خیام کے جانے کے بعد مایوسی اور دکھ کے کسی عالم سے گزری تھی۔
"اللہ کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، مگر انسان نہیں سمجھ سکتا فوری طور پر۔" گیتی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں شاید خود سے کہا تھا۔
"یہ عادت تم میں بالکل نانی ستارہ والی ہے۔ وہ بھی اسی طرح لمحہ نہیں لگاتیں، بات کہیں سے کہیں شروع کرنے

میں۔ انسان بس سرا پکڑنے میں ہی لگا رہتا ہے، ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے۔"
گیتی ہلکے سے مسکرا دی۔ "کچھ غلط تو نہیں کہا نا میں نے..... خیام کا جانا ہمارے خاندان کے لیے بہت بڑی ٹریجڈی تھا اور اس کے لیے بھی آسان تو نہیں رہا ہوگا، مگر اب اتنے سال گزر جانے کے بعد سب کچھ بڑی حد تک نارمل ہو گیا۔"
"خیر! اب اگر وہ معاذ کے پاس آ گیا ہے تو یقیناً" یہ اللہ کا کرم ہے اس پر..... وہ تبدریج بہتری کی طرف بڑھے گا اور کیا پتا بڑھ بھی چکا ہو۔ مجھے اس خبر سے واقعی بڑا اطمینان ہوا ہے۔" آملیٹ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس نے گیتی کی پلیٹ میں رکھا۔
"کیا ہمیں نانی کو بتا دینا چاہیے؟" انہیں تسلی ہو جائے گی۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ پہلے فیروزہ خالہ اور اب خیام..... وہ اب کہتی تو نہیں..... لیکن....."
بیتے ہوئے اس سارے قصے میں آج بھی نانی ستارہ کا غم تازہ تھا۔ یہ بات طے شدہ تھی۔
سالار نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
"لیکن پھر بھی..... پھر بھی انہیں اس طرح براہ راست بتا دینا خود ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا گیتی! پہلے کم از کم خیام کا تو پتا ہو کہ وہ ان سے ملنا بھی چاہتا ہے یا....."
"میں ملنے کے لیے نہیں کہہ رہی، لیکن بس انہیں پتا چل جائے کہ وہ زندہ ہے۔ یہی بہت بڑی خبر ہوگی ان کے لیے۔"
"ابھی نہیں، کچھ دن اور رک جاؤ۔ وہ جب یہاں تک آ گیا ہے تو پھر اسے خود کو آزما لینے دو..... مت بھولو کہ اس کے پیچھے معاذ اور اس کے والد ہیں۔"
گیتی نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر تب ہی اس کی نگاہ باہر سے آتے ہوئے نبیل پر پڑی تھی۔
"مت دیکھو اس کی طرف، میں ہوں نا تمہارے پاس۔" سالار نے دھیمی آواز میں اسے ٹوکا۔
گیتی نے ذرا سا رخ موڑ کر سالار کی طرف دیکھا۔
"خدایا!" وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔ "زرد پڑ رہا ہے تمہارا رنگ۔ گیتی! تم ٹھیک تو ہو نا! وہ جا چکا ہے۔"
گیتی کی نگاہ نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تھا۔
نبیل بنا کسی سے الجھے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گیا تھا۔
وہ واقعی الجھا ہوا تھا یا پھر سالار کی موجودگی نے اسے باز رکھا تھا بظاہر ایسا ہی لگا تھا۔ لیکن صرف گیتی نے اس ایک نظر کی وارننگ کو وصول کیا تھا۔
"ویسے حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص اتنا مطمئن ہے..... یا تو اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں یا پھر یہ ضرورت سے زیادہ پر اعتماد ہے۔"
"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر لیا ہو۔" گیتی کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نبیل کے خلاف جرم ثابت ہو چکا ہے اور اس کی سزا وہ پا کر ہی رہے گا..... اگر وہ خدا نہ کرے کسی بھی وجہ سے بچ نکلتا ہے تو بھی میں اسے معاف نہیں کروں گا۔" سالار ایک دم بے حد سنجیدہ ہو گیا۔
گیتی کا دل بہت زور سے دھڑکا۔
"تم فکر مت کرو ایسا کچھ نہیں ہونے والا، جو پریشان کن ہو۔ اگر اسے سزا نہیں ملنی ہوتی تو اس وقت زرتاج بیگم کے ساتھ یو کے جانے سے روکا نہیں جاتا۔ شک کا اظہار تو ہے نا اس پر....."
سالار نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دینا چاہی، مگر اندر ہی اندر ایک گہرا سہم روز بہ روز مزید گھنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتا جارہا تھا۔
"یا نہیں کیا ہوتا تھا؟
کیتی نے مضبوطی سے سالار کا ہاتھ پکڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

گھر کا آخری سامان بھی نیچے کھڑے ٹرک میں لوڈ کر دیا گیا تھا۔ خالی در و دیوار کے بیچ اب کچھ بھی نہیں تھا' سو عجیب سی ویرانی اترنا شروع ہو گئی تھی۔
جویا نے ایک خاموش سی نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔
"جلدی کرو جویا! سب لوگ ٹیکسی میں بیٹھے ہیں۔ تم کر کیا رہی ہو آخر!" سیڑھیوں کے پاس کھڑے سلمان نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں گھر کی چابی تھی' جو اسے ابھی نیچے مالک مکان کے سپرد کرنا تھی۔
"سامان کا وہاں اتروانا اور پھر اوپر چڑھوانا' میری تو زندگی عذاب بنی ہوئی ہے۔ سارے کام کرنے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔ باقی سب کے عیش ہیں اس گھر میں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اس کے پاس سے گزرتا ہوا نیچے گیا تھا۔
جویا خاموشی سے ٹیکسی میں آبیٹھی۔
زویا' شاکرہ امی اور وہ۔ آگے اظہار صاحب تھے۔ سلمان کو بائیک پر جانا تھا۔
سڑکیں' بازار' گلیاں۔ تیزی سے پیچھے جاتے گئے۔
راستے بھر کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔
وہ جب وہاں پہنچے تو سامان اتارا جارہا تھا۔
"آپ لوگوں کو آج آپا گل کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔ سامان پھیلا پڑا ہے سارے میں یہاں تو۔" سلمان انہیں دیکھ کر قریب آیا تھا۔ "انہیں کب سے فون ملا رہا ہوں۔ مگر اٹھا ہی نہیں رہی ہیں۔" اس کی جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔
"مت کریں فون۔ وہ کام کے موقعوں پر ایسے ہی غائب ہو جاتی ہیں۔" زویا کا لہجہ سخت تھا۔ سلمان اور اظہار صاحب دونوں ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
"اور سامان کی فکر مت کریں۔ پہلے بھی تو آخر شفٹنگ کے بعد کا سارا کام میں نے اور جویا نے ہی کیا تھا۔ آؤ جویا۔۔۔ آئیں امی!" اس نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔
اظہار صاحب اور سلمان دونوں ہی نے کچھ جھینپ کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ وہ تینوں اوپر جا چکی تھیں۔
ایک تھکا دینے والے طویل دن کے بعد آنے والی صبح کو سویرے ہی آپا گل موجود تھیں۔
"مجھے پتا تھا کہ یہاں سب کے سب آرام طلب ہیں۔ سو رہے ہوں گے اور میں اتنی دور سے ان کی محبت میں دوڑی چلی آئی ہوں۔"
انہوں نے یہ جملہ اتنی بار دہرایا تھا' جب تک ان کو یقین نہ ہو گیا کہ وہ سب سن چکے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس' جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں' ابھی تک بند تھا۔ سوائے سلمان کے کسی نے بھی اب تک اسے کھولنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ مگر وہ ابھی موڈ میں نہیں آئی تھیں۔
"صبح کا ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکلی ہوں۔ یہاں ابھی تک بھی ناشتے کے آثار نہیں ہیں۔ کرتے کیا ہو تم لوگ۔۔۔ اور یہ جویا۔۔۔ جویا کہاں ہے؟" انہوں نے پہلی بار جویا کی غیر موجودگی کو نوٹ کیا۔
"وہ سو رہی ہے رات گئے تک گھر سمیٹا ہے۔ اسے ابھی مت اٹھانا۔" شاکرہ امی کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

"میں تو خود کہتی ہوں کہ اب اس سے زیادہ کام مت کروائیں۔ آج تو مایوں بیٹھنا ہے اسے۔ چند دن کا آرام تو ہر لڑکی کا حق بنتا ہے۔" آپا گل نے ایک مصلحت بھری حمایت کی۔
"سلمان! یہاں نیچے حلوہ پوری ملتی ہے۔ سب کے لیے لے آؤ۔ ناشتے سے تو فارغ ہوں کم از کم۔"
"تمہیں اتنی بھوک لگ رہی تھی تو ناشتا کر کے نکلنا تھا۔۔۔ یا پھر بنا کر ہی لے آتیں سب کے لیے۔۔۔ ایک تو اتنی جلدی آکر سب کی نیند خراب کی' اوپر سے آتے ہی حکم۔۔۔"
سلمان بڑبڑ کرتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔
آپا گل نے اس کے جانے کے بعد بڑے اہتمام سے ساتھ لایا ہوا سوٹ کیس کھولا۔
پیلے رنگ کا خوب صورت سوٹ' چوڑیاں' مہندی' ابٹن' چاندی کے زیورات۔۔۔
ایک کے بعد ایک کتنی ہی چیزیں نکل رہی تھیں۔
"بڑے ہی شوق اور ارمانوں کے ساتھ شادی کر رہے ہیں فرید بھائی۔ حالانکہ ان کی بہنیں تو جلی جا رہی ہیں یہ سب دیکھ کر۔۔۔ لاکھوں روپے کی جائیداد جو ہاتھ سے نکل رہی ہے' مگر وہ کسی کی بھی پروا نہیں کر رہے۔ سب کچھ میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ اب ظاہر ہے میں تو اپنی بہن کے لیے سب کچھ اچھے سے اچھا۔۔۔"
"یہ کڑے بھی فرید الدین نے آپ کو دیے ہیں آپا گل؟"
زویا کے سوال نے ان کی روانی سے چلتی زبان کو بریک لگایا تھا۔
ان پر نگاہ جما کے وہ جواب کی منتظر تھی اور شاید اس نے ان کڑوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ہاں نا! اپنی خوشی سے دیے ہیں۔ میں نے مانگے تھوڑی تھے۔" کچھ سٹپٹا کر انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنی قمیص کی آستین کو نیچے کھینچ کر ان چمکتے ہوئے کڑوں کو شاید چھپانا چاہا۔
"بہت منع کیا۔ ہاتھ تک جوڑ لیے کہ اب جو بھی کرنا ہے' جویا کے لیے کریں' لیکن وہ کہنے لگے کہ بہنوں کا بڑا حق ہوتا ہے۔"
"تو اپنی بہنوں کو بھی انہوں نے ایسے ہی کڑے دیے؟ ڈھائی تین لاکھ سے کیا کم ہوں گے۔ واقعی بہت بڑا دل ہے۔"
آپا گل نے پہلی بار اپنی نمائش پسندی کی عادت پر دل میں افسوس کیا۔
"بھلا کیا ضرورت تھی پہن کر آنے کی۔۔۔ جویا کی شادی کے بعد بھی پہنے جا سکتے تھے۔"
"انہوں نے رشتہ طے کروانے پر بھی ایسا ہی کچھ دیا تھا۔ کیا وہ کروڑپتی آدمی ہیں؟ حالانکہ لگتے تو نہیں ہیں۔" زویا کے لہجے کی کڑواہٹ اتنی بڑھی تھی کہ چھلک رہی تھی اور آنکھوں میں بڑی گہری بے مروتی۔
آپا گل کو عجیب سے احساس نے گھیرا۔
آنے والے دنوں میں زویا کی حیثیت مضبوط تر ہو رہی تھی۔ چند ماہ میں اس کا ہاؤس جاب شروع ہو رہا تھا اور وہ یقیناً "جویا" نہیں تھی۔
"آپ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی' اپنی سگی بہن کی قیمت لیتے ہوئے آپا گل! آپ کی عادتوں کو آج تک آپ کی فطرت کا حصہ سمجھ کر میں نے اور جویا دونوں ہی نے نظر انداز کیا ہمیشہ۔ آپ کی لالچ' آپ کی تنگ دلی۔۔۔"
ان کی خاموشی سے وہ بالکل صحیح نتیجہ نکال چکی تھی۔
"مجھے نہیں پتا تمہارا ان باتوں سے کیا مطلب ہے زویا! لیکن بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تم بالکل کھو چکی ہو۔ تم لوگوں کا ساتھ دیتے دیتے میں نے اپنے گھر کو بھلا دیا۔ اس تنگ' خستہ حال' ڈھائی کمروں والے گھر سے لا کر یہاں اس اتنے بڑے اپارٹمنٹ میں لا کر بٹھا دیا۔۔۔ وہ بھی فری میں۔۔۔ مگر بجائے احسان ماننے کے الٹا ذلیل کر رہے ہو تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگ مجھے۔ جویا کی شادی ہو جائے' پھر بات کروں گی تم سے میں۔ فی الحال تو مجھے صرف اس کی فکر ہے۔ بے چاری میری مظلوم بہن۔ بس کر رہ گئی غریب۔"

شاکرہ امی نے خالی خالی نگاہوں سے زویا اور پھر آپا گل کو دیکھا۔

"کاش! آپ نے واقعی جویا کی فکر کی ہوتی۔ کاش! اسی فرید الدین سے آپ نے بنا کسی لالچ' کسی غرض کے جویا کا رشتہ کرنا چاہا ہوتا۔ صرف اس کی بھلائی سوچی ہوتی تو شاید اس کی بد قسمتی کا دکھ کچھ ہلکا ہوتا۔ مگر آپ نے تو اسے بیچ دیا۔۔۔ اپنی سگی بہن کو بیچ دیا۔ خدا کرے کہ آپ وہ دن بھی دیکھیں' جب آپ کی ایک بیٹی دوسری کے ساتھ یہی سلوک کرے۔"

آپا گل نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔

کچھ تھا زویا کے لہجے میں' جو کمرے میں پر ہول سناٹا چھایا تھا۔

"میں نے کتنا چاہا کہ وہ آپ کے فیصلے سے بغاوت کر دے۔ یہ اس کا حق ہے۔ مگر وہ نہ مانی۔ ایک نہیں سنی اس نے میری۔ وہ حق استعمال نہیں کیا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر لڑکی اور ہر عورت کو دیا ہے۔ کیونکہ وہ تو بہت پہلے خود کو قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی آپا گل! اس وقت سے جب آپ لوگوں نے معاذ بھائی کو اس کی زندگی سے نکالا تھا۔ زندگی اس کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ مگر یہاں کسی کو خوف خدا ہے آج بھی۔"

زویا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی مزید کوشش اب لاحاصل تھی اور آپا گل کے سامنے وہ کبھی بھی رونا نہیں چاہتی تھی۔

"دیکھا آپ نے کیسے الزامات لگا رہی تھی۔ جیسے میں ڈر ہی تو جاؤں گی اس سے۔"

زویا کے جانے کے بعد ایک پھیکی سی مسکراہٹ وہ چہرے پر لانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"یہ اچھے آثار نہیں ہیں امی! ایک معاذ کے قصے نے ہی سارے خاندان میں عزت دو کوڑی کی کر دی ہے ہماری۔ یہ زویا تو اور بھی آگے نکل رہی ہے۔ غلطی کی جو اسے کو ایجوکیشن میں ۔ ہم نے پڑھنے دیا۔ جلد ہی اس کا بندوبست نہ کیا تو۔۔۔"

وہ بولے گئیں' جب تک سلمان گرم گرم پوری چھولے اور حلوہ لے کر نہیں لوٹا۔

آج پلیٹیں ڈونگے نکال کر لانے کی زحمت انہوں نے خود اٹھالی تھی۔ کسی کو بھی آواز نہیں دی۔

"شکر ہے خدا کا' ہمارا تو دل اور دامن دونوں ہی صاف ہیں۔" جس کمرے میں زویا تھی' اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے بطور خاص اونچی آواز میں کہا۔ مگر جواب میں خاموشی ہی چھائی رہی۔

شاید زویا کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید کسی کے بھی پاس کچھ نہیں تھا' سوائے آپا گل کے۔

حیرت انگیز طور پر آج انہوں نے سلمان یا اظہار صاحب کے سامنے زویا کی کسی شکایت کو نہیں دہرایا تھا۔

جویا سارا دن کمرے سے نہیں نکلی۔ فرید الدین کی بہنوں کو عصر کے بعد آنا تھا۔ صرف بٹھانے کا انتظام کرنا تھا۔ کھانا پینا' فرید الدین کی طرف سے ہی آنا تھا۔ لیکن یہ بات اس کی بہنوں سے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔

آپا گل کی بیٹیاں آگئی تھیں۔ آج کے دن کے حساب سے ان کی تیاریاں مکمل تھیں۔

"جویا۔۔۔!" آپا گل نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی۔

وہ سامنے بیڈ پر بیٹھی قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ ان کی آواز پر بھی اس کا تسلسل نہیں ٹوٹا تھا۔

زویا انہیں دیکھتے ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ آپا گل نے احتراماً" کچھ لمحے کی خاموشی اختیار کی۔

یہ دیکھ کر بہر حال سکون بھی ملا تھا کہ وہ خاصی نارمل ہے۔ چہرے پر رونے دھونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ان کی جائزہ لیتی نگاہ جویا پر جمی تھی۔

زرد رنگت والے چہرے پر صرف آنکھیں ہی نمایاں تھیں اور اس کے گلابی ہونٹ اب سفید پڑ چکے تھے۔

فرید الدین کے ہاں سے آئی ہوئی چوڑیاں اور کپڑے اس پر بے حد ڈھیلے پڑنے تھے اور فرید الدین کی بہنوں کو اس سخت بیمار نظر آتی دلہن پر اعتراض کرنے کا کھلا موقع مل جانا تھا اور خود فرید الدین بھی اس طرف اشارہ کر چکا تھا پہلے ہی۔

آپا گل کو گھبراہٹ نے گھیرا۔ پچھلی بار جب فرید الدین کی بہنیں آئی تھیں۔ تب تک جویا پھر بھی کسی حد تک بہتر نظر آتی تھی' لیکن اب تو صرف اس کا سایہ سا تھا۔

"اور جو خدا نہ کرے کہ۔۔۔" انہیں اس پکے بیوپاری والی فکر نے گھیرا' جو اپنا مال خراب ہونے کے ڈر سے جلد سے جلد فروخت کرنے کی فکر میں گھرتا ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نہا دھو کر کپڑے بدل لو جویا۔۔۔! اور چہرے پر کچھ لگا لینا فاؤنڈیشن وغیرہ۔ وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے اور ہاں! اپنے لیے دعا ضرور کرنا۔"

پتا نہیں' اس نے ان کا ہدایت نامہ سنا بھی یا نہیں۔

آپا گل کو جویا کے بے تاثر چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح تلاوت کیے گئی۔

آپا گل دروازہ بند کر کے واپس جا چکی تھیں۔

جویا کی آنکھ سے آنسو گر کر چہرے پر پھیلتا چلا گیا۔

"میں پھر کہتی ہوں جویا! مت ہونے دو یہ سب۔۔۔ اور کچھ نہ سہی' اپنی زندگی میں امید تو رہنے دو۔ خود کو اس طرح ختم مت کرو۔"

جب وہ پیلا جوڑا پہن کر آپا گل کے حسب حکم فاؤنڈیشن کی بوتل کھول رہی تھی' زویا کمرے میں واپس آئی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ جویا سے ناراض تھی۔ اس شادی سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر لینے کے بعد وہ اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

"میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے سامنے۔۔۔ نہیں کرو۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے جویا۔ میں معاذ بھائی کے ہاں جانے کا نام بھی نہیں لوں گی ساری زندگی۔ لیکن ہم کہیں اور رہ سکتے ہیں۔ دوستوں یا کسی رشتے دار کے گھر۔۔۔ بعد میں ہاسٹل چلے جائیں گے۔ میرا فائنل ایر یا ہے جویا! میں سنبھال لوں گی سب کچھ پلیز۔۔۔ پلیز۔"

وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"خود پر نہ سہی' مجھ پر رحم کرو جویا! میں بہت بہت پیار کرتی ہوں تم سے۔ میرا دل بند ہو جائے گا یہ سب دیکھ کر۔"

جویا نے فاؤنڈیشن کی بوتل واپس رکھ کر محبت سے زویا کے چہرے کو چھوا۔

"مت رو زوئی! سنبھالو خود کو۔ اس طرح مت کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" زویا نے غصے سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ نہیں ہوتی ہے تمہیں کوئی تکلیف۔ بے رحم ہو چکی ہو تم جویا! تمہیں کسی پر ترس نہیں آتا۔ خود پر بھی نہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"خود پر رحم کھانے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے زویا! چار سال پہلے سب کچھ ختم ہوا۔" اس نے فاؤنڈیشن کی تھوڑی سی مقدار ہتھیلی پر نکال کر چہرے پر ملنا شروع کی۔

"اب کم از کم کچھ لوگوں کا تو بھلا ہو رہا ہے۔ امی' ابو' سلمان بھائی آرام سے زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کبھی بھی۔"

"میں سنبھال سکتی ہوں ان سب کو۔ پڑھائی ختم ہو گئی ہے میری تقریباً۔" آنکھوں کو خشک کرتی زویا آخری لمحے تک بھی پرامید تھی۔

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ تم ایسا سوچنا بھی مت' تم اپنی پوری زندگی خود جینا زویا! پورے دل' پوری خوشی کے ساتھ۔ کسی سمجھوتے' کسی قربانی پر خود کو ضائع مت ہونے دینا۔ سنا تم نے۔" جویا کی آواز بتدریج اونچی ہوئی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"میں تمہارے لیے بہت ساری دعائیں کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ ضرور سنے گا۔" بات ختم کر کے اس نے جھک کر زویا کی پیشانی پر پیار کیا۔

زویا کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تب ہی وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔ زویا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شیشے میں دکھائی دیتے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ ہنسے ہی چلی جا رہی تھی۔

"دیکھو تو ذرا' فاؤنڈیشن لگانے سے چہرے کی رنگت کیسی عجیب سی ہو گئی ہے۔ اس سے تو پہلے ہی بہتر تھی۔ کم از کم اصلی تو تھی۔ میں منہ دھو کر آتی ہوں۔"

وہ نارمل سے انداز میں کہتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ لیکن اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ میں کچھ غیر معمولی پن جھلکا تھا۔ زویا فکر مندی وہیں بیٹھی رہی۔ جویا نے پتا نہیں کتنے منٹ تک منہ پر پانی ڈالا تھا اور جب وہ واپس آئی تو مہمانوں کی آمد کا شور اٹھ چکا تھا۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں' جب میں کہوں تو جویا کو رسم کے لیے لے آنا۔" آپا گل نے دروازہ کھول کر اتنی سی بات تیزی سے کہی اور مڑنے لگی تھیں' تب ہی کچھ اور یاد آیا۔

"یہ سارے کپڑے گیلے کر لیے ہیں تم نے جویا! کچھ تو ہوش کیا کرو اور وہ فاؤنڈیشن' چوڑیاں۔۔۔"

"امی۔۔۔ امی!" باہر سے ان کی بیٹیاں آواز دے رہی تھیں۔

"ساری ذمہ داریاں میری بچیوں پر آ گئی ہیں۔" پہلی بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے زویا کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر جس تیزی سے آئی تھیں اس سے زیادہ تیزی سے واپس چلی گئیں۔

"یہ اور ان کی بچیاں۔" زویا نے منہ بنا کر سر کو بے زاری سے جھٹکا۔

"کچھ اور پہن لو۔ میں تمہارے کپڑے دوبارہ استری کر دیتی ہوں۔"

"نہیں! ٹھیک ہیں۔ ابھی سوکھ جائیں گے۔ اتنے بھی گیلے نہیں ہیں۔"

"اور یہ چوڑیاں۔" زویا نے ڈبا اس کے آگے کیا۔ اس میں سنہری' ہری اور پیلی چوڑیوں کے خوب صورت سیٹ جگمگا رہے تھے۔

کوئی وقت تھا کہ اس طرح کی چیزوں پر اس کی اور زویا کی ایک چھوٹی سی بحث تو ہو ہی جاتی تھی۔ جویا نے دل کڑا کر کے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر۔۔۔

"یہ نہیں پہنوں گی میں زویا! رکھ دو ادھر۔"

"کیوں' ابھی تو صرف فرید الدین کی بھیجی ہوئی چوڑیاں ہیں۔ وہ ابھی پہنی نہیں جا رہیں تم سے۔ آگے کی زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیسے کٹے گی جویا؟"

اس بار زویا کے لہجے میں سختی نہیں، رحم تھا۔ جویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آپا گل کی بیٹیاں جویا کو لینے آئی تھیں۔ میک اپ، زرق برق لباس، مہندی، جیولری اور چہروں پر آپا گل والی بے حسی۔

"چلیں جویا خالہ!" ان میں سے ایک نے اس کے سر پر دوپٹا ڈالا اور تیزی سے ہاتھ پکڑ کر کھڑا بھی کر لیا۔

"ایک منٹ، آپ کی شکل کیسی ہو رہی ہے۔" دوسری نے تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے روکا اور قریب پڑی اس فاؤنڈیشن کو جسے ابھی جویا نے دھو کر صاف کیا تھا۔ جھٹ پٹ پھر سے اس کے چہرے پر مل دیا۔ جویا "نہیں نہیں" کرتی رہ گئی۔

وہ دونوں اسے تقریباً" دھکیلتی ہوئی دروازے تک لائی تھیں اور باہر آکر ہی ان کی نگاہ چوڑیوں سے خالی ہاتھوں پر پڑی تھیں۔

لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ کچھ بچیاں ڈھول کو بلاوجہ یوں ہی بجا رہی تھیں اور فرید الدین کی وہ بہنیں جن کے بارے میں آپا گل کی رائے بے حد بری تھی اس وقت خاصی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

آپا گل نے آگے بڑھ کر جویا کے بازو تھامے اور اپنے قریب صوفے پر بٹھا دیا۔ جویا کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو آنے والی کئی عورتوں نے نوٹ کیا تھا۔

"لڑکی شاید بیمار ہے۔"

شبہے کی تصدیق ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

جویا کی فاؤنڈیشن ملی زرد رنگت، بہت ہی عجیب سا تاثر دے رہی تھی اور اس کی مخصوص کشش جواب تک جیسے تیسے اس کا ساتھ دے رہی تھی، اب گم ہو چکی تھی۔ اس کی نظریں اس طرح جھکی تھیں، جیسے اب کبھی بھی نگاہ اٹھا کر زمانے کو نہ دیکھنے کا تہیہ کر چکی ہے۔

فرید الدین کی بہنوں کی ناپسندیدگی ظاہر ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"جب ہم رشتہ طے کرنے آئے تھے، تب تو خاصی اچھی تھیں۔" ان ہی سے کسی نے اپنی ایک اور رشتے دار عورت سے کہا۔ "اب تو دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔"

دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑی زویا کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

اس کی نیک دل، صابر اور خوب صورت بہن کس طرح لوگوں کی نگاہوں میں تماشا بنی تھی۔

"رسم شروع کیجیے۔" آپا گل اس وقت بڑی متانت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ بات کو بگڑنے نہ دینا ہی ان کی کامیابی تھی۔

فرید الدین کی سب سے بڑی بہن ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر جویا کے قریب آکر بیٹھی تھی۔ آپا گل کو اٹھ کر برابر والے صوفے پر جانا پڑا۔ خاموش بیٹھی شاکرہ امی، جویا کے اور بھی قریب ہو گئیں۔

"دو چار چوڑیاں تو ہاتھ میں ڈال دیتیں جویا کے۔ ہم لائے بھی تھے اور اب خالی ہاتھ کتنے برے لگ رہے ہیں۔" جویا کا ہاتھ تھام کر رسم کرنے سے پہلے انہوں نے آپا گل کو جتانا ضروری سمجھا تھا۔

تیل، ابٹن، مٹھائی، سامنے رکھی میز پر سب ہی کچھ خوب صورتی کے ساتھ رکھا تھا۔

سامنے بیٹھی سب ہی خواتین میں رسم دیکھنے کی دلچسپی ایک دم ہی بڑھ چکی تھی۔

تب ہی ایک بڑی عجیب سی بات ہوئی۔

فرید الدین کی بہن کا ابٹن لگانے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

جویا کا سر شاکرہ امی کے کندھے سے ٹکا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھال پاتیں، وہ ایک بے جان وجود کی طرح ان کی گود میں گری تھی۔

"جویا!" عورتوں کے اس چھوٹے سے ہجوم میں سے زویا کو اس تک پہنچنے میں وقت کا سامنا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

سہ پہر ڈھل کر شام میں بدل رہی تھی، جب خیام کی بازار سے واپسی ہوئی تھی۔ چھوٹی موٹی کئی چیزوں کے ساتھ بہت سے پھول بھی تھے، جو اسے خاصی دور سے جا کر لانے پڑے تھے۔

چند بڑے بڑے شاپر زائنی بائیک پر سے اٹھا کر گھر کی داخلی سیڑھیوں پر آکر کھڑا ہوا تھا۔ سامنے اندر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ انہیں یہیں رکھ دے یا پھر اندر چلا جائے سیدھا۔ اس کی بے تکلفی ابا کے کمرے اور اسٹڈی تک تھی۔ اندر جاتے ہوئے وہ ہمیشہ اطلاع دے کر ہی گیا تھا۔ تب ہی دادی کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ سیڑھیوں پر کھڑا دکھائی دے گیا۔

"ارے خیام بیٹا!" وہ وہیں سے پکاریں۔

"اندر جا کر کیوں نہیں رکھ دیتے یہ سامان؟ ادھر ہال میں یا پھر کچن میں....."

"جی!" اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ مگر اندر جانے کے بجائے وہیں برآمدے میں کھڑا رہا۔

"معاذ بھائی! معاذ بھائی!"

ربیعہ اس کی آواز پر ہی کمرے سے نکل کر آئی تھی۔

"بھائی گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

ربیعہ کی آواز نیچی تھی اور وہ کافی خاموش خاموش سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک قدرتی سی افسردگی تھی جو آج اسے گھیرے لے رہی تھی۔

خیام نے دانستہ نگاہ چرائی۔

"یہ سامان..... جگہ بتا دیں، میں خود رکھ دوں گا۔"

"اچھا! پھر کچن میں لے آئیں..... اور یہ پھول ادھر ہال میں....."

"تم آگئے۔" کچن میں کام کرتی شائستہ امی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"جی آنٹی! یہ لسٹ چیک کر لیں۔"

"تم نے دیکھ لی، کافی ہے۔ چائے پیو گے؟"

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ربیعہ کی طرف مڑ چکی تھیں۔

"ربیعہ! خیام کے لیے چائے بناؤ۔ تھکا ہوا آیا ہے۔ تم رک گئے تو بہت آسانی رہی مجھے۔ بے حد شکریہ بیٹا! کہ تم نے اتنا ساتھ دیا، ورنہ معاذ سے تو ایک کام کو اتنی بار کہنا پڑتا ہے کہ بے کار میں ہی غصہ آنے لگتا ہے۔ بی پی پہلے ہی بڑھا رہتا ہے میرا، لیکن اسے خیال نہیں ہے۔"

وہ خیام سے بے حد خوش تھیں اور اس کا اظہار بار بار ہوتا تھا۔ ربیعہ کو یاد نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے خوش گوار انداز میں اور کس سے بات کرتی ہیں۔

"تم ہال میں بیٹھو ربیعہ وہیں چائے لے آتی ہے۔ بس یہ تھوڑا سا کام اور نپٹا لوں، مغرب کے بعد وہ لوگ آجائیں گے۔ بس دعا کرو، سب کچھ خیریت سے ہو جائے۔"

"جی!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہال میں پھول میز پر رکھے تھے۔
آج ربیعہ کی سسرال والے پہنچ رہے تھے اور سارا اہتمام ان ہی خوش نصیبوں کے لیے تھا۔
خیام نے ایک تھکی تھکی سی سانس لی۔
قسمت کا گورکھ دھندا۔۔۔
کاش! اگر بہت پہلے وہ ابا اور معاذ کو اپنی ساری حقیقت بتانے کی ہمت کر لیتا تو سارے کا سارا بوجھ زائل ہو جاتا تھا۔
تب شاید وہ زیادہ بہتر فیصلے کر سکتا تھا۔
"تب شاید ربیعہ کے لیے بھی۔۔۔"
دل سے اٹھتی آواز میں آج بار بار شدت سی محسوس ہوئی تھی۔
اس نے گھبرا کر نفی میں سر ہلایا۔
"محسنوں کی بیٹی۔"
"اور محسن بھی کون؟ جنہوں نے نئی زندگی دی۔ تلخی اور تاریکی کی انتہائی گہرائی سے نکال کر روشن راستے پر قدم رکھنا سکھایا۔ زندگی سے جڑے سب سے تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا دلا دیا۔" خیام کی براؤن آنکھوں میں نمی سی اتری۔
ابا کے سامنے اپنے خاندان کی حقیقت بتاتے ہوئے، بہت کچھ غیر متوقع ہوا تھا۔
وہ سب، جو خود خیام کے خیال میں انہیں اور معاذ بھائی کو بری طرح چونکا سکتا تھا' ایک معمول کا قصہ بنے تھے۔
"ہمیشہ یاد رکھنا کہ یہ سب زندگی کا حصہ ہیں' مکمل زندگی نہیں اور حقیقت میں خود زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔" ابا نے کہا تھا۔ "تم خود کو کس بات کی سزا دے رہے ہو بیٹا! کس پر اپنا غصہ اتار رہے ہو؟ وہ مظلوم ماں' جو اب اس دنیا سے بھی جا چکی' اپنی ساری حسرتوں کو لے کر۔۔۔ اس پر۔۔۔ یا پھر اپنی نانی کے اس خاندان پر، جو حالات کا شکار ہو کر نہ جانے کیسے اب تک اپنی گزر بسر کرتا آیا ہے۔۔۔؟ وہ جنہوں نے تمہارے لاڈ پیار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' لیکن اپنی کسی بھی پریشانی کا بوجھ تم پر نہیں ڈالا۔
خیام! تم نے انہیں چھوڑ کر اچھا نہیں کیا بیٹا! زندگی کو آزمانے کے لیے نکلنا مردوں کا شیوہ ہے۔ لیکن تعلق توڑنا ہرگز نہیں۔"
انہوں نے جو کچھ کہا' خیام کے دل میں لفظ بہ لفظ اترا تھا۔
"وہ محلے' وہ سیٹ اپ' آسمان سے نہیں اترے تھے خیام۔۔۔ انسانوں کی تخلیق ہیں۔ نفرت کرنی ہے تو ان مظلوم عورتوں سے نہیں' بلکہ باہر کی دنیا کے نام نہاد شریفوں سے کرو۔"
وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے۔ تب ہی معاذ نے بے تکی سی مداخلت کی تھی۔
"باہر کی دنیا کے لوگوں کی بھی اپنی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں خیام۔۔۔ ہر شخص خود اپنی ذات کا اسیر ہے۔ ہر ایک کے لیے رعایت رکھنا سیکھ لو۔ باظرف ہونا سب سے ضروری ہے۔"
خیام کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ معاذ نے کس کی طرف سے صفائی دی تھی۔ لیکن اس سارے قصے کو دل بھر کر دہرا لینے کے بعد' جب وہ ابا کے گلے لگا تھا تو دل پر مدت سے لگا داغ ندامت دھل چکا تھا۔
پچھلے گارڈن میں گزشتہ صبح اس نے پہلی بار سکون بھرا سانس لیا تھا۔
یہ گھر اور اس کے لوگ سحر انگیز تھے۔
"آپ کی چائے۔" ربیعہ اس کے قریب چائے کا کپ رکھ رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"شکریہ۔"
"کس بات کا؟"
"آپ کی چائے کا۔"
وہ افسردگی سے مسکرائی۔
کوشش کے باوجود وہ خود کو اس کی طرف دیکھنے سے باز نہیں رکھ پایا تھا۔
وہی تھی، جسے دیکھ کر گیتی یاد آتی تھی۔
اور وہی تھی، جو گیتی کو بھلانے کا سبب بھی بنی تھی۔
سادہ پرکشش سا وجود، جس کے تصور سے بھی وہ اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ بندھا تھا اور کچھ عرصے بعد وہ اسے صرف تصور میں دیکھا کرے گا۔
"بہت مبارک ہو آپ کو ربیعہ! اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔"
اس بار ربیعہ نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خیام نے نوٹ کیا' وہ خوش نہیں تھی۔ کم از کم ویسے جیسے ایسے موقعوں پر لڑکیاں ہوتی ہیں۔
"آپ تو یہاں ہوں گے۔ ابا اور معاذ کا بہت خیال رکھیے گا۔ مجھے ان کی بہت فکر ہے۔ وہ بہت سادہ دل لوگ ہیں۔ معاذ کو تو خود سے کھانا' کھانا بھی یاد نہیں رہتا اور ابا.... وہ تو...." کسی ہمدرد کو پا کر وہ رو دینے کو تھی۔
خیام نے ایک گہرا سانس لیا۔
کیسی خوب صورت اور پیاری سی وجہ تھی ربیعہ کی افسردگی کی۔ خود اس کی اپنی طرح۔
اور یہ پہلی ذمہ داری جو وہ اسے سونپ رہی تھی خود اس کی بھی تو تھی۔
"ارے! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ بلکہ ابا اور معاذ بھائی کے لیے تو آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
وہ بڑی خوش دلی سے مسکرایا۔ لیکن ربیعہ بہت سنجیدہ تھی۔
"آپ کو نہیں پتا بھائی خوش نہیں ہیں۔ بہت دن پہلے وہ اپنی ہر خوشی سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ ہر راستہ بند کر چکے ہیں خود پر۔ بہت.... بہت تنہا' بہت دکھی ..." خیام نے مضطرب سا ہو کر ربیعہ کی طرف دیکھا۔
سو وہ بات' وہ ڈر' جو اسے معاذ کی طرف سے فکر مند کرتا تھا' سچ تھا۔
"میں معاذ بھائی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں ربیعہ! آپ دیکھیں گی کہ وہ کتنی خوش و خرم زندگی...." برابر والے کمرے سے دادی' ربیعہ کو آواز دے رہی تھیں۔
"جی آئی دادی!" آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ربیعہ نے اونچی آواز میں ان کی پکار کا جواب دیا اور جاتے جاتے مڑ کر خیام کی طرف دیکھا۔
"کاش! آپ ایسا کر سکیں۔ کاش! وہ آپ کو ایسا کرنے دیں.... یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا خیام!" بات مکمل کر کے وہ کمرے سے نکل گئی۔
"خیام...." اس نے زیرِ لب اپنا نام دہرایا۔
آج سے... پہلے کبھی اسے اپنا نام اتنا اچھا نہیں لگا اور نہ ہی اپنا آپ اتنا معتبر۔
دل خوشی اور دکھ کے ملے جلے احساس سے بوجھل ہوا تھا۔ کیا تھا' جو معاذ بھائی جیسے بے حد پیارے انسان کی زندگی کا تکلیف دہ باب تھا۔ وہ اسے پڑھنا چاہتا تھا۔
"بیٹا دنیا بھی چائے کا کپ ہے۔" وہ تیز قدموں سے اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھا۔
مہمان وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ لڑکے کے والدین اور شاید بھائی' بہن' ایک

بزرگ رشتے دار' لیکن لڑکا خود نہیں تھا۔ خیام کو ابا اور معاذ کے اصرار پر ان سے ملنا بھی پڑا اور ساتھ میں بیٹھنا بھی... سو وہ ایک زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لیے ان سب کے درمیان بیٹھا رہا۔
"میرا بھتیجا ہے۔ آج کل یہاں میرے پاس آیا ہوا ہے۔" ابا کسی کو اس کے بارے میں بتا رہے تھے۔
خیام کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کوشش کے باوجود بھی وہ خود کو جذباتی ہونے سے نہیں روک پایا تھا۔
لڑکے کے ساتھ نہ آنے کے بارے میں کوئی وجہ بتائی جا رہی تھی۔ خیام بڑی خاموشی سے بڑے ہال سے نکلا تھا۔
کسی کی بھی توجہ اس پر نہیں تھی' لیکن ابا کی نگاہ نے اس کا پیچھا کیا تھا۔
وہ حد درجہ اداس تھا اور اس بار اداسی کی وجہ بھی کچھ اور... یہ بات طے شدہ تھی۔
ایک گہری سانس لے کر وہ پھر سے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔
شام ڈھل کر رات میں بدلنے لگی تھی۔ وہ چپ چاپ اسٹڈی کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔
خود کو مربوط کر کے وہ جلد ہی واپس اندر جانا چاہتا تھا' تاکہ اس کی غیر حاضری کا نوٹس نہ لیا جا سکے۔ تب ہی کسی نے گیٹ پر لگی بیل کو بجایا تھا۔
خیام تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف گیا تھا۔
"السلام علیکم!" سامنے کھڑی پریشان حال بزرگ خاتون کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلی تھیں۔
"وعلیکم السلام بیٹا! مجھے اسلام بھائی سے ملنا ہے یا پھر معاذ...."
"گھر پر اس وقت مہمان ہیں اور...." خیام نے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس کی تھی۔
"میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے بیٹا! میں بہت مشکل سے آئی ہوں۔ گھر بھی بھول گئی تھی۔ تم انہیں کہو کہ شاکرہ آئی ہے۔ وہ ضرور مل لیں گے مجھ سے۔" ان کے انداز میں بے بسی تھی۔
خیام نے بنا کچھ کہے ان کو آنے کا راستہ دیا۔
وہ گیٹ سے اندر آئیں اور پھر سیڑھیوں سے کچھ دور ہی رک گئیں۔
"میں یہیں بات کر لوں گی... تم بلا لاؤ بس۔" خیام تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمدے کی سیڑھیوں پر آیا۔ تب ہی شائستہ اندر سے نکل کر آئی تھیں۔
"گیٹ پر کون تھا خیام؟"
"آنٹی! کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔ معاذ بھائی یا ابا سے۔"
"تم کہہ دو کہ وہ مصروف ہیں۔ پھر کسی وقت آ جائیں۔" وہ واپس اندر مڑنے لگیں۔
"میں نے کہا تھا' لیکن وہ کہہ رہی ہیں کہ بہت ضروری بات کرنی ہے ان کا نام شاکرہ ہے۔"
شائستہ امی کا قدم وہی تھما تھا۔
خیام نے بہت حیرت سے انہیں تیز قدموں سے اس طرف جاتے دیکھا۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم یہاں آئیں شاکرہ! میرے بچے' میرے گھرانے پر دل بھر کر کیچڑ اچھالنے کے بعد بھی... انسان میں کم از کم اتنی شرم تو ہونی چاہیے کہ وہ پھر سامنا کرنے سے بھی گریز کرے۔"
خیام جب وہاں پہنچا تو اس نے انہیں بے حد غصے میں کہتے سنا تھا۔ وہ چند قدم پیچھے رکا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری خاتون کی آواز دھیمی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔
"ایک کپڑے سی کر گزارہ کرنے والی عورت کا بیٹا۔۔۔ آوارہ' نااہل' جس کی ہنسی اڑانے کا کوئی موقع نہیں جانے

دیا تم نے اور تمہارے خاندان نے شاکرہ! عروج پر تھی تمہاری فرعونیت۔ کس حقارت سے تم نے ہماری شرافت اور بے بسی کو دیکھا ہمیشہ۔" شائستہ کی آواز میں نمی آرہی تھی۔ لیکن وہ خود کو ہرگز' ہرگز بھی کمزور نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔

خیام نے دل پر بھاری بوجھ سا محسوس کیا تھا۔

زندگی سے جڑے دکھ اور بے بسی کی کہانیاں' صرف تائی ستارہ کے محلے تک ہی کب محدود تھیں۔

"میں ہاتھ جوڑتی ہوں شائستہ! بہت سزا پالی ہم نے۔۔۔ معاف کردو خدا کے لیے۔۔۔ مدد کرو میری۔۔۔ بہت امید لے کر آئی ہوں۔" اس بار ان کی آواز واضح تھی۔

"معافی اور امید دونوں ہی اللہ سے مانگیے۔ ہم کم ظرف لوگ بھلا کسی کو کیا دے سکتے ہیں۔" وہ مزید کچھ سنے بغیر واپس مڑیں۔ "خیام بیٹا! گیٹ بند کر لینا۔" وہ اس کے قریب سے کہتی ہوئی واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

"شائستہ۔۔۔ شائستہ۔۔۔" وہ بے قراری سے پکار رہی تھیں۔

"میری بچی مر جائے گی' جویا مر جائے گی۔"

خیام نے انہیں کہتے سنا۔

برآمدے کی سیڑھیاں خالی تھیں۔ شائستہ اندر جا چکی تھیں۔ وہ خاتون بری طرح رو رہی تھیں۔

گیٹ پر وہی رکشہ والا آکر کھڑا ہوا تھا۔ جو انہیں لایا تھا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اماں کو واپس بھی چھوڑنا ہے۔ کرایہ بڑھتا جارہا ہے۔"

"کتنا کرایہ؟" خیام نے اسے مطلوبہ کرایہ دے دیا تو وہ مطمئن ہو کر دوبارہ رکشہ میں جا بیٹھا۔

شاکرہ ابھی تک رو رہی تھیں۔

"میری جویا۔۔۔ مر جائے گی۔"

اس ادھورے بھید بھرے قصہ کا فی الوقت ایک وہ ہی گواہ تھا۔

اس نے انہیں گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر سخت بے چینی سی محسوس کی تھی۔

معاذ کی قسمت بند دروازے کا قفل اسی نام سے کھلنا تھا۔

"جویا۔۔۔"

اسے پورا یقین ہوا۔

"سنیں!" وہ بہت تیزی سے ان کے پیچھے آیا۔

اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔

یہ وقت نکل جاتا تو شاید وہ خود کو پھر کبھی بھی معاف نہ کر پاتا۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM

اجنبی کے نام

مصباح علی

''صوفیہ کل پاکستان آرہی ہیں۔''

ناشتے کی میز پر وہ بہت پرجوش ہو کر میاں جی کو بتانے لگیں۔ میاں جی نے خفیف سا ہو کر اخبار کو جھٹکا، جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو اور تیزی سے اخبار کی سطروں پر نظریں گھمانے لگے۔

''تمام چینلز والے خوب کوریج دے رہے ہیں۔ لگتا ہے، بہت ہی انتظار کروایا ہے انہوں نے۔''

وہ چائے میں چینی ملا کر میاں کو تھماتے ہوئے پھر گویا ہوئیں مگر وہ ناگواری کا مسلسل تاثر لیے آنکھیں سکیڑتے اخبار کا صفحہ پلٹنے لگے۔ جیسے کوئی خاص خبر کی تلاش ہو یا پھر بیگم کی کسی بات کا جواب نہ دینا چاہتے ہوں۔ حالانکہ چہرہ اضطراب کی ترجمانی کر رہا تھا لیکن بیگم صاحبہ مسلسل ''صوفیہ صوفیہ'' کی گردان کر رہی تھیں۔

کبھی ملک سے گئے ان کے سالوں کا حساب لگاتیں، تو کبھی فرمائش کرنے لگتیں انہیں اپنے گھر بلانے کی مگر بریگیڈیر مودت کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سرسری انداز میں اخبار ایک طرف میز پر رکھا اور چائے کی پیالی اٹھا کر چسکیاں بھرنے لگے۔ گرم چائے ہونٹ تو جھلسا ہی رہی تھی مگر اس وقت ان کا دل بھی سلگ رہا تھا۔

''ویسے مودت! وہ اپنے پرانے محلے تو ضرور جائیں گی۔ پرانی جگہوں پر انسان کی یادیں بکھری ہوتی ہیں۔'' بیگم نے انجانے میں یادوں کا ایک اور ہنٹر مارا۔

''لگتا ہے آج چائے میں چینی نہیں ملائی۔'' وہ کپ نیچے رکھتے ہوئے بولے۔ وہ شاید موضوع بدلنا چاہتے تھے۔

بیگم صاحبہ چائے میں دوبارہ چینی ملانے لگیں۔ ساتھ ساتھ میاں سے فرمائش جاری تھی۔

''کل رات ہی ان سے ملنے ہوٹل چلیں گے، آخر پرانے مراسم ہیں۔'' ساتھ ساتھ ارادہ بھی ظاہر کرنے لگیں، وہ اپنی خوشی میں میاں کے چہرے پر پھیلی ناگواری محسوس ہی نہیں کر رہی تھیں۔ بس اپنے ملنے ملانے والوں پر رعب جمانے کے لیے انہیں گھر بلوانا چاہتی تھیں اور ساتھ تصویریں بنوا کر یادگار بنانا چاہتی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ شریک سفر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

''میری کیپ پکڑا دو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اپنے احساسات چھپا کر انہوں نے سپاٹ انداز میں کہا۔

بیگم صاحبہ قریب رکھی کیپ پکڑاتے ہوئے ساتھ آن کھڑی ہوئیں۔

''میں اتنی دیر سے کیا باتیں کر رہی ہوں، لگتا ہے کچھ سنا ہی نہیں۔'' وہ بگڑ کر غصے میں بولیں۔ وہ میاں کے خالی خالی چہرے کو بالکل نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

''ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں۔'' وہ اب بھی انجان بنے اپنی کیپ درست کرتے ہوئے بولے۔

''کل صوفیہ پاکستان آرہی ہیں۔ انہوں نے غصے سے گھورتے ہوئے اپنی بات دوہرائی۔

''روزانہ بہت سے پاکستانی بھارت سے آتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان کا ملک ہے۔ انہیں آنا چاہیے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے۔'' وہ شان بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے میں روکھا اور اکتاہٹ واضح تھی۔

بیگم صاحبہ کے لیے حیرت کا جھٹکا تھا۔ وہ ان کی اسٹڈی میں صوفیہ کی لکھی کتابیں دیکھ چکی تھی۔ بلکہ شوہر کی پسند سراہتے ہوئے خود بھی صوفیہ کی شاعری پڑھنے لگی تھیں اور اب تو وہ گھر کے ہر فرد کی پسندیدہ شاعرہ تھیں۔

''جناب! میں اس صوفیہ کی بات کر رہی ہوں جو آپ کے پرانے محلے میں رہتی تھیں۔ جن کی آپ سے بہت دوستی تھی۔ وہی جو چھت پر آپ سے باتیں کرنے آتی تھیں۔ جب پڑھائی سے آپ لوگ اکتا جاتے تھے تو وہ آپ کو شعر سناتی تھیں۔ خود ہی تو آپ نے بتایا تھا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔'' وہ بوکھلا گئے۔ ''مجھے کیوں سنانے لگی شعر۔'' وہ اپنی چوری پکڑی جانے پر کچھ غصے میں بولے۔

''ارے بھئی یاد دلا رہی ہوں آپ کو۔''

وہ اپنے میاں کی شرٹ کا کالر درست کرتے ہوئے بولیں۔ لیکن وہ تو جان چھڑانے کے چکر میں تھے، ایک دم ان کے ہاتھ ہٹائے اور دوپہر کے کھانے پر انتظار نہ کرنے کا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتے لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ ڈرائیور سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا کہہ کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

چڑھتے دن کا ایک اپنا ہی سحر ہوتا ہے۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی تیزی سے سرمئی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ بریگیڈیر مودت ہونٹوں کو سختی سے جمائے پشت پر سر ٹکائے ماضی میں جھانک رہے تھے۔ ان کے ماضی کو ان کی اپنی بیوی نے جھاڑا تھا۔ جس پر برسوں کی گرد جمی تھی۔

☼ ☼ ☼

صوفیہ اور مودت ایک ہی متوسط محلے کے رہائشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ صوفیہ والدین کی اکلوتی بیٹی تھی مگر موحد کی دو بہنیں اور ایک بھائی، درمیانے درجہ کا خوشحال گھرانہ تھا۔ بچوں کی وجہ سے گھر میں ہر وقت رونق برپا رہتی۔ صوفیہ بھی اپنا وقت گزارنے ان کے گھر آجاتی۔ روما سے گہری دوستی بھی تھی۔ جہاں موحد اردو کے الفاظ و معانی صوفیہ سے سمجھتا، وہاں اس کی ریاضی موحد پر انحصار کرتی تھی۔

وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ کب سانسوں کی ضرورت محسوس ہونے لگا، پتا ہی نہ چلا۔ صوفیہ میں شعر کہنے کی صلاحیت تھی۔ وہ ہر موقع کو جملے میں ڈھال سکتی تھی۔ اس کے لفظوں میں محبت کا لمس تھا۔ وہ جلد ہی باقاعدہ شاعری کرنے لگی۔ اس کا کالج میں پہلا دن تھا، جب اس نے ایک غزل لکھ کر موحد کو دی، جو اس نے فوراً" ایک مقامی رسالے میں شائع کروا دی۔ فرمائش پر وہ زیادہ لکھنے لگی۔ موحد کاکول اکیڈمی چلا گیا۔ صوفیہ کے لفظوں میں محبت کے ساتھ انتظار کی باس پھیلنے لگی۔

موحد کے بڑے بھائی نے پی سی ایس کا امتحان اعلا نمبرز سے پاس کیا اور سیشن کورٹ میں جج لگ گئے۔ بڑی بہن لیکچرار تھی۔ کسٹم آفیسر سے شادی کے بعد باہر چلی گئی۔ چھوٹی بہن جو صوفیہ اور موحد میں محبتی پل کا کام کرتی تھی، اب ڈگریاں اکٹھی کرنے لگی۔ وہ دن صوفیہ کے لیے بڑا ہی دلکش تھا جب موحد لیفٹیننٹ بنا اپنے گھر آیا۔ وہ پہلے سے زیادہ وجیہہ و دلکش لگ رہا تھا۔ صوفیہ بھی موحد کے گھر اعزازی تقریب میں بھرپور طریقے سے شامل ہوئی۔ موقع کی مناسبت سے چند دعائیہ اشعار بھی اسے لکھ دیے۔ اب جب بھی وہ چھٹی پر گھر آتا تو دونوں کی بے قرار ملاقات ضرور ہوتی۔

آج بھی لیفٹیننٹ موحد چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا اور شام کے وقت اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا فضا میں آزاد اڑتے پرندے دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اپنی چھت پر آنے کی دعوت دے دی۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا نہ صرف مست بادلوں کو بکھیر رہی تھی، بلکہ درختوں سے جھڑے بے جان سوکھے پتے بھی چھت پر پھینک رہی تھی۔ صوفیہ چھوٹی سی مشترکہ دیوار پھلانگ کر اس کے قریب چلی آئی۔ وہ کتنی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔

موحد کے نہ صرف لفظوں سے محبت کی خوشبو آرہی تھی، بلکہ آنکھوں میں میں موتی سے چمک رہے تھے جنہیں صوفیہ بڑے خیر مقدم سے اپنے دل میں پرو رہی تھی۔ مست بادل کے گہرے ٹکڑے سے ننھی ننھی بوندیں گرنے لگیں۔ موحد صوفیہ کا ہاتھ کھینچ کر کونے میں بنی چھوٹی سی برساتی کے نیچے لے آیا۔ صوفیہ کے ہاتھ بہت گرم تھے۔ اس کے ہاتھوں کی گرمی موحد کو آج بھی یاد تھی۔

موحد اس کی آنکھوں میں بہت سے دیپ جلا کر بہت سے وعدے لے کر اسے انتظار سونپ گیا۔ اس کی پوسٹنگ سیاچن ہو رہی تھی۔ اس لیے دونوں طرف خدشے برابر تھے۔ دعاؤں پر زور ہوا اور بیس تک جاتے ہی اسے پتا چلا اس کی پوسٹنگ فی الحال منسوخ ہو گئی۔

وہ اس منسوخی کو صوفیہ کی دعا سمجھ رہا تھا مگر یہ معمہ جلد حل ہو گیا۔ یہ مہربانی اس کی کمپنی کے میجر جنرل کی ہے۔ جنرل صاحب کی نظر التفات اس کی پرکشش جاذب نظر شخصیت پر کیا پڑی، رینک بھی تیزی سے بدلے۔ مراعات کے کیا ہی کہنے۔

موحد بٹ کو شک گزرا۔ وہ ایمرجنسی میں چھٹی لے کر گھر آگیا اور شادی کا شور مچا دیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ اس سے شادی کرو گے؟" یہ بھائی جان تھے جو ہر بات پر اڑیل گھوڑے کی طرح ٹانگیں اٹھا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

"حیثیت ہی کیا ہے اس کی تمہارے سامنے؟ گھٹیا قسم کے شعر کہتی ہے۔ اس سے شادی کر کے ہمارے خاندان پر دھبہ لگانا ہے کیا؟" وہ غصے میں لال پیلے

ہو رہے تھے۔ "تم نے افسانہ پڑھا ہے اس کا؟" وہ غصے میں پھنکارے۔

"افسانہ کم محبت نامہ زیادہ ہے۔"

اس نے چند ماہ پہلے ہی افسانہ نگاری بھی شروع کی تھی۔ بھائی صاحب اسی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک افسانہ نگاری، شاعری گھٹیا ترین فعل تھا۔ جج ہونے کے ناتے فرد جرم عائد کر رہے تھے۔

"بھائی جان! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ کھوکھلی ہوتی اپنی سانسوں میں مضبوطی پیدا کر کے بولا۔ "محبت کرتا ہوں اس سے۔"

"یہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔ سب بکواس ہے۔" وہ تیوری چڑھا کر بولے۔ "ویسے بھی وہ عباسی ہیں اور ہم بٹ۔ کیسے میل کھا سکتے ہیں۔" ان کے لہجے میں فیصلے کی مضبوطی تھی۔

موحد کا رنگ اتر گیا۔ بھائی جان نے اسے ڈھیلا پڑتا دیکھ کر موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور اسے بہت پیار سے اپنے قریب بٹھالیا اور پیار سے پچکارتے ہوئے معاشرے کی اونچ نیچ سمجھانے لگے۔

"لوگ کیا کہیں گے، بڑی بہو اعلا وکیل اور چھوٹی سیکنڈ ڈویژن بی اے پاس شاعرہ افسانہ نگار؟" ان کے لہجے میں واضح حقارت کے نشتر تھے۔

متوسط طبقے کا یہ ایک بڑا المیہ ہے، یہ لوگ احساسات وجذبات سے زیادہ ڈگریوں کو معتبر جانتے ہیں۔ صوفیہ بھی اسی نظریے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بھائی جان نے میجر جنرل کی طرف سے آئے پرپوزل کا ذکر کیا۔ مزید ترقی کے چانسز دکھائے جو تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔

"تم اپنی بہترین زندگی کے بارے میں سوچو۔ ویسے بھی ہم یہ محلہ چھوڑنے والے ہیں۔ کیا یہاں کی گھٹیا یادیں لے کر جانی ہیں؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

موحد نے آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں بکھیری، اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کیے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے کئی دن کمرے میں قید گزارے۔ وہ سرخ آنکھوں سے گزرتا ایک ایک لمحہ سوچ رہا تھا۔ انکار کی اس میں ہمت نہ تھی۔ الفاظ سلب ہو چکے تھے۔ اس کے کانوں میں بھائی کے الفاظ کی گونج تھی۔

"لوگ ایک رومانٹک شاعرہ کے ساتھ آرمی آفیسر کو شاید کسی اور ہی رنگ میں دیکھیں۔" آرام کرسی پر جھولتے ہوئے وہ یک لخت رک گیا۔

ادھر صوفیہ پریشان تھی۔ موحد کو آئے ہفتہ ہونے والا ہے مگر چھت پر، گھر کے باہر کہیں نظر کیوں نہیں آتا۔ اس نے بہانے بہانے سے کتنے چکر لگائے۔ مگر بے سود۔

ایک چڑھتی دوپہر میں وہ گیلے کپڑے پھیلانے کے لیے چھت پر آئی۔ وہ جھٹک جھٹک کر کپڑے تار پر ڈال رہی تھی۔ کپڑوں سے چھنتیں ننھی بوندیں بھی اسے فرحت کا احساس دلانے سے عاری تھیں کیونکہ اس کی سوچوں کا مرکز دیوار پار تھا۔ اس نے عادتاً" دیوار کے ساتھ چوکی رکھ کر دوسری طرف جھانکا۔

سامنے ہی ستمگر گہری سوچ میں ڈوبا کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے دیوار پھلانگی اور قریب چلی آئی۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"کہاں تھے تم۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "کیپٹن کا بیج سجا کر مغرور تو نہیں ہو گئے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ سورج کی طرف پشت کیے کھڑا تھا اور وہ ہاتھ سے آنکھوں پر باڑ بنائے سورج کے سامنے کھڑی اس کی گہری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بھنویں اچکا کر بولی۔

"تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ایسی کیا ضروری بات ہے۔ کسی لفظ کا مطلب تو نہیں پوچھنا۔ سوہان روح، شادی مرگ۔" وہ اس کی بات کو مذاق میں لے گئی۔ "یاد ہے تمہیں شادیٔ مرگ کا تم نے جو جملہ بنایا تھا، شادی میں ہونے والی ہوائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

فائرنگ سے بچہ ہلاک ہو گیا تو اہل خانہ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" وہ گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں بھی اب تشویش در آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک لفظ بنتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کچھ شرمندگی پریشانی کے آثار تھے۔ مگر اس کے الفاظ بہت سپاٹ تھے۔

"صوفیہ! محبت کچی عمر کا ایک جذباتی لمحہ ہوتا ہے، مگر کیریر زندگی کی روشن حقیقت۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ "جذباتی لمحوں پر کیریر قربان نہیں کیے جاسکتے۔"

وہ بول رہا تھا۔ صوفیہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ کی باڑ نیچے گر چکی تھی۔ وہ اس کے لفظوں کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر حیران تھی، یہ اتنے افسانوی لفظ کیسے بول گیا۔ سورج کی براہ راست کرنیں اس کی آنکھوں میں جا رہی تھیں۔ اسے کسی تپش کا احساس نہیں رہا تھا کیونکہ اس کی روح سورج نہیں، کوئی اور جھلسا رہا تھا۔ وہ ساکن نظروں سے مسلسل اسے تک رہی تھی۔

"تم خاموش کیوں ہو؟" وہ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر دہل گیا۔

"کوئی لقب تو دو بے وفا، خود غرض، فلرٹی... کوئی بددعا ہی دے دو، مگر خدا کے لیے خاموش مت رہو۔"

وہ اس کی طرف سے شدید رد عمل کا منتظر تھا۔ مگر وہ اس کی سوچوں کے برعکس خشک نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ خود بھی اپنے اس رد عمل پر حیران تھی۔ اس نے تو یہی سنا تھا شاعر ہو یا مصنف، معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ فوراً" دلبرداشتہ ہو کر غمی میں گھلنے لگتا ہے۔ لیکن یہ راز تو آج فاش ہوا تھا۔ لکھاری تو بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے حساس ترین موڑ پر بھی ضبط پر کمال دسترس رکھتا ہے۔ وہ بھی اپنے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا اس کے دل کی دھڑکن رک جائے، کیونکہ وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی مگر وہ خاموش نظروں سے اسے جانچتی رہی۔ دھوپ کی تیز شعاعوں میں اس کے چہرے کا بھورا رواں کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"محبت میں طعنہ زنی یا بددعائیں نہیں ہوتیں۔" وہ کافی دیر بعد اس کی شرمسار نظروں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم خوش رہو۔ تمہیں بہت عروج ملے۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں، بلکہ سوکھی آنکھوں اور سپاٹ انداز کے ساتھ تیزی سے دیوار پھلانگ گئی۔ محبت میں اس نے ذات، رشتے، عہدے نہیں دیکھے تھے۔ بس خود ہی جگہ بنتی چلی گئی، اب وہ اس جگہ کو سمیٹ کر بڑے حوصلے سے اس کی زندگی سے چلی گئی۔ مبادا اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ مودت شکستہ قدموں سے واپس بیس چلا گیا۔ ہفتے بعد ہی پتا چلا، صوفیہ اپنی ماں کے ساتھ بھارت چلی گئی ہے۔ جہاں اس کے ماموں رہتے تھے۔ صوفیہ کے والد کے انتقال کے بعد سے وہ انہیں اپنے پاس بلانے پر اصرار کر رہے تھے مگر صوفیہ مسلسل ایک سال سے اپنی ماں کو ٹالتی آئی تھی۔

"امی! یہ ہمارا ملک ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔" مگر اب ایسا کیا ہوا تھا جو وہ خاموشی سے اپنا ملک بھی چھوڑ گئی۔

کیپٹن صاحب کی شادی جنرل کی بیٹی سے ہو گئی۔ دل کے آئینے پر برسوں کی دھول پڑ گئی۔ مگر ایک کتاب کا رشتہ باقی تھا۔

صوفیہ تیزی سے شاعری کی دنیا میں مشہور ہوئی۔ ہر سال اس کی کوئی نہ کوئی کتاب افسانے یا شاعری کی زبان میں آنے لگی۔ اس کی ہر کتاب کا انتساب "اجنبی کے نام" ہوتا۔ اس کی شاعری میں بے وفائی کی

بالکل بسانذ نہ تھی، بلکہ محبت، امن، خواہش، مگر صبر کا ہی پیغام ہوتا، اس لیے وہ نہ صرف بھارت، بلکہ پاکستان میں یکساں مقبول ہوئی۔

گاڑی ٹائر کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک جھٹکے سے رکی۔ بریگیڈیر صاحب کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کتنی ہی بار ذہن کو جھٹکا مگر ایک کے بعد ایک سوچ تھی۔ انہوں نے اپنی کیپ اتار کر سامنے میز پر رکھی اور خود کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر چھت کو گھورنے لگے۔

"آخر یہ اٹھارہ سال بعد اب کیوں آ رہی ہے؟"

☼ ☼ ☼

صوفیہ حکومت پاکستان کی طرف سے منعقد کیے گئے بین الاقوامی مشاعرے میں مہمان خصوصی تھیں، پاکستانی ہونے کی بنا پر انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا اور تقریب کے پاس مہینہ پہلے فوجی افسران کو بھی بھجوائے گئے۔ یہاں تو وہ طبیعت خرابی کا بہانہ تراش سکتے تھے کیونکہ ان میں صوفیہ کا سامنا کرنے کی سکت نہ پہلے تھی نہ اب، مگر بیگم کا مسلسل عشائیہ پر اصرار۔ وہ گومگو کیفیت میں کرسی پر جھول رہے تھے۔

دو، تین دن اسی گم صم کیفیت میں گزرے۔ بالآخر وہ دن آن پہنچا جس دن تقریب تھی۔ بریگیڈیر صاحب طبیعت ناسازی کا بہانہ کیے گھر میں براجمان تھے۔ لاؤنج میں بیگم اور بچے آواز اونچی کیے اسکرین کے سامنے بیٹھے مشاعرے کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ بریگیڈیر صاحب بھی بظاہر فیملی کا ساتھ دینے کے لیے شرمندہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مائیک کے سامنے بیٹھا شخص صوفیہ کے اعزاز میں مسلسل رطب اللسان تھا۔ ساتھ ساتھ بیگم صاحبہ بھی تمام ریکارڈ توڑنے پر بریگیڈیر صاحب کو طعنوں سے نواز رہی تھیں۔ بظاہر وسیع سوچ کے مالک بریگیڈیر صاحب جوان ہوتے بچوں سے ماضی کی جھلک چھپانے کے لیے کھسیانی ہنسی ہنستے رہے۔

"یار! ہم لوگوں کے پاس کہاں ٹائم ہوتا ہے، اس قسم کی تقریبات کے لیے۔ تم اسے گھر بلا کر کیا کرتیں۔ یہ لوگ میڈیا پر ہی اچھے لگتے ہیں۔"

نہ جانے کس دل سے بولے تھے۔ ان کی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھیے! آپ کے میجر صاحب تو اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے جھوم رہے ہیں۔" بیگم کی نظر انہی کی کمپنی کے میجر صاحب پر پڑی تو تڑپ کر بولیں۔

"خود نہیں جانا تھا نہ جاتے، کم از کم ہمیں ہی جانے دیتے۔" انہیں شدید غصہ تھا۔

"ہونہہ۔" بیٹے نے بھی نخوت سے گردن گھمائی۔

جیسے ہی صوفیہ نے اپنی تازہ غزل شروع کی۔ بیٹی نے شدت جذبات سے فلائنگ کس پلازما اسکرین پر اچھالنی شروع کر دی۔

ایک تو اسکرین پر رات کے منظر میں برقی قمقموں کا سحر، دوسرا لاؤنج میں بیٹھے اپنے خاندان کا یہ عالم، بریگیڈیر صاحب کے لیے سخت تکلیف کا باعث تھا۔ اپنوں سے اپنا ہی درد چھپانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ بریگیڈیر صاحب کو اچھی طرح ہو رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے وہ پروگرام ختم ہوا۔

☼ ☼ ☼

بریگیڈیر صاحب نے چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ ڈیوٹی پر جانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ آج شام بھی لان میں بیٹھے دل ہی دل میں دنوں کا حساب لگا رہے تھے۔

"کل اتوار ہے، صبح اس کی فلائٹ ہے۔"

انہیں پورا شیڈول یاد تھا۔ ان کی نظر سامنے لان میں لگے نیٹ پر تھی۔ جس کی دونوں جانب بیٹا، بیٹی اوپن ٹینس کھیل رہے تھے۔ بیگم بچوں کے قریب ہی کھڑی جج کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ کوچنگ بھی کر رہی تھیں۔

"سر! کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" جدید

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرز سے بنی بید کی کرسی پر بیٹھے بریگیڈیئر صاحب کو گارڈ کی آواز نے چونکا دیا۔

"ہوں... کون۔" کہتے ہی ان کی نگاہ براؤن آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوتے نسوانی حسن پر پڑی۔ وہ گہرے گلابی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی ایک وقار کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں اپنے پسندیدہ رنگ میں ملبوس اپنی ہی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم... السلام۔" ان کے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔ "ایم... سوری... میں نے... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" آج بھی ان کی بوکھلاہٹ ان کے لفظوں کی چغلی کھا رہے تھے۔

وہ خاموش سوکھی نگاہوں سے آج بھی صرف انہیں دیکھے گئیں۔ اتنے میں بیگم صاحبہ اور بچوں کی نظر پڑی۔ کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے قریب آئے۔

"آ... آپ... یہاں... آپ ہمارے گھر...." بیگم کی زبان اور الفاظ دونوں ہی خوشی میں بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ کبھی اندر لاؤنج میں لے جانے کا کہتیں۔ کبھی حیران ہوتیں۔ "ہمارا گھر کیسے ملا۔" پھر ان کی یادداشت پر حیران ہوتیں۔ کوئی اتنے عرصے بعد بھی ہمسایوں کو یاد رکھتا ہے۔

ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیسے خوشی کا اظہار کریں۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھیں کہ اس گھر کے مالک سے لے کر نوکر تک ان کے فین ہیں۔ وہ ان کی شاعری کی، افسانوں کی دل کھول کر تعریف کر رہی تھیں۔ صوفیہ کو موقع دیے بغیر۔

بریگیڈیئر صاحب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ صوفیہ کے لیے یہ قابل برداشت نہ تھا۔ وہ ہمت کرتی ہوئی وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "بس آپ کی نوازش ہے، آپ مجھ ناچیز کو یاد رکھتے ہیں۔"

بیگم بتانے لگیں، بریگیڈیئر صاحب کی اسٹڈی میں ان کی ہر کتاب موجود ہے۔ پھر اصرار کر کے پوچھنے لگیں۔ آپ کی ہر کتاب کا انتساب کس اجنبی کے نام ہوتا ہے۔

"ہے ایک اجنبی۔" وہ سامنے طنزیہ نظریں اٹھاتے ہوئے بولی۔

بریگیڈیئر صاحب سامنے رکھی دوسری کرسی پر ٹکے بوٹ کی نوک سے گھاس مسل رہے تھے۔ بیگم صاحبہ بٹلر کو چائے پانی کی ہدایات دینے کے لیے تیزی سے اندر کی طرف بڑھیں۔ بیٹے کو اپنا ہینڈی کیم یاد آیا کہ کچھ یادگار ویڈیو بنالی جائے اور بیٹی کو آٹوگراف لینے تھے۔ سب اپنی اپنی چیزوں کے لیے ادھر ادھر بھاگے لیکن صوفیہ بہت عجلت میں تھیں۔ وہ جانے کے لیے پر تولنے لگیں۔

"دراصل میں یہاں ایک خوش فہمی میں آگئی تھی۔ جس شخص سے میں ملنا چاہ رہی ہوں، آیا میں اسے یاد بھی ہوں کہ نہیں۔ کافی مراسم رہے تھے میرے اور اس کے درمیان۔" وہ آج بھی تپتے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بول رہی تھیں۔ بریگیڈیئر صاحب کا دل کن پٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ چہرہ شرمندگی سے سرخ ہونے لگا تھا۔

"سب کچھ بھول کر جینا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر مجبوری اور بزدلی میں بڑی بھوک ہوتی ہے صوفیہ! سب کچھ نگل کر بڑھتی رہتی ہے۔"

وہ شکستہ قدموں سے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا آواز گہرے کنوئیں سے آرہی ہے مگر صوفیہ ایک جانباز، دلیر سپاہی کو جو ان کا محبوب بھی تھا ہارا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ تو صرف اپنی دعاؤں کی تاثیر دیکھنے آئی تھیں کہ کیا انہیں عروج ملا۔ وہاں عروج تو تھا خوشی بھی، مگر خالی لہجے میں سابقہ ملاقات والا کھوکھلا پن تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔ جاتے جاتے آخری بات کہی۔

"اللہ تمہیں مضبوطی دے مووت!"

وہ آج بھی اسے دعا ہی دے رہی تھیں۔

✲

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمیرا حمید

حیات ممکن ہے

"آذر لندن آرہا ہے۔ شام چار بجے تک وہ پہنچ جائے گا اسٹیشن۔" ثانیہ نے اسے صبح ہی فون پر بتایا تھا۔

"آفس کے کام سے وہ دو دن سے برطانیہ میں تھا۔ اسکاٹ لینڈ سے اسے آج لندن آنا ہے۔" ثانیہ نے تفصیل بتائی۔ ثانیہ کا وہ فون اس کے لیے کسی معجزے کے رونما ہونے کی خبر سے بڑھ کر تھا۔

"آپ سے ملنے نہیں آرہا آنٹی! اپنے کسی کام سے آرہا ہے۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آپ اسے دور سے دیکھ لیجئے گا۔ اگر اسے معلوم ہوا کہ میں نے آپ کو اس کے آنے کا بتایا ہے تو وہ بہت ہنگامہ کرے گا، پلیز آنٹی!"

اور فریال نے ثانیہ سے وعدہ کیا کہ وہ آذر کو صرف دیکھے گی، ملے گی نہیں لیکن یہ وہ اس وقت بھی جانتی تھی کہ وہ جھوٹا وعدہ کر رہی ہے۔ وہ آذر کو دیکھے گی نہیں وہ اس سے لپٹ جائے گی۔ اسے بھینچ لے گی اور پھر بے تحاشا پیار کرے گی۔ وہ آذر کو دیکھ کر اس سے دور کیسے رہ سکتی ہے۔

وہ سات سال بعد اس سے ملنے والی تھی، دیکھنے والی تھی۔ جب وہ گھر چھوڑ کر گیا تھا، اس وقت وہ اٹھارہ

ناولٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سال کا تھا۔ فریال کے لیے چھوٹا سا بچہ تھا۔ اب وہ خود ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔

اتنا لمبا عرصہ۔ اتنے بہت سارے دن۔ اتنی لمبی لمبی راتیں اس نے آذر کو یاد کرتے' اسے پکارتے' اس کے لیے روتے ہوئے گزاری تھیں۔ ثانیہ کا فون سنتے ہی وہ فوراً" لندن ریلوے اسٹیشن آگئی۔ اپنے گھر کو لاک بھی نہیں کیا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ خوشی کے مارے اس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ بس سے آنے کے بجائے وہ ٹیکسی سے آئی۔ وہ ایک ایسے چھوٹے بچے کی طرح لگ رہی تھی جو غبارے ہاتھ میں پکڑے اپنے والدین کے ساتھ پہلی بار آئس کریم کھانے جارہا ہو۔

اسٹیشن کی بھیڑ میں وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی' پھر اسے یاد آیا کہ آذر کو چار بجے تک آنا ہے اور ابھی صرف گیارہ بجے ہیں۔ اس نے ثانیہ کو فون کیا۔

"کیا وہ لندن کے لیے نکل چکا ہے۔" وہ ایک بار پھر سے تصدیق چاہتی تھی کہ وہ لندن آرہا ہے۔

"ابھی وہ اسکاٹ لینڈ میں ہے آنٹی! آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ۔ آپ کہاں ہیں؟" ثانیہ اچانک چونک کر بولی۔

"میں اسٹیشن۔۔۔"

"آپ گیارہ بجے ہی اسٹیشن آگئیں؟ میں نے غلطی کی آپ کو بتا کر۔" ثانیہ کو افسوس ہوا۔ یہ افسوس اسے تب نہ ہوتا' اگر وہ فریال کی جگہ پر ہوتی۔

"پلیز آنٹی! گھر جائیے۔ اتنا وقت ہے۔ ابھی آپ یہاں کیا کریں گی؟"

"میں بہت خوش ہوں' تم میری فکر نہ کرو۔" اسے خدشہ تھا کہ وہ چار بجے سے پہلے بھی آسکتا ہے' وہ اپنا ارادہ بدل سکتا ہے' سو جلدی آنے میں کیا حرج ہے۔ وہ اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے پاس آگئی۔ یہ ایسی جگہ تھی' جہاں سے وہ ہر آنے' جانے والے کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسٹیشن کے اندر اسے نہیں ڈھونڈ سکے گی مگر یہاں آذر اس سے بچ کر نہیں گزر سکے گا۔ وہ قریب ہی ایک جگہ بیٹھ گئی اور ٹکٹکی لگا کر ہر ایک کو دیکھنے لگی ابھی اس کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا' مگر کون جانے وہ آ بھی جائے۔۔۔

وہ گزرنے والوں کی شکل کی طرف دیکھتی اور پہچاننے سے پہلے ہی مسکرانے لگتی۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے پلک جھپکنے کے دوران ہی کہیں آذر اس سے بچ کر نہ نکل جائے۔ وہ ایک لمحے بھی نظریں ادھر ادھر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

گیارہ سے بارہ اور بارہ سے ایک بج گیا۔ وہ اسی ایک جگہ پر نظریں جمائے کبھی کھڑی ہوتی۔ کبھی بیٹھ جاتی وہ خوش بھی تھی' مگر اسے چین و قرار نہیں تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا' لیکن اسے بھوک پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کاؤنٹر تک جائے اور اسکاٹ لینڈ سے آنے والی ٹرین کا پوچھے' لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسے "ٹرین لیٹ ہے یا ٹرین سرے سے آ ہی نہیں رہی" جیسی منحوس خبریں سننے کو ملیں' جبکہ ایسی خبروں کا کوئی امکان نہیں تھا' لیکن اس کے نزدیک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ وہم کو دل میں جگہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ دل میں جگہ بنا رہے تھے۔

اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ آذر اس سے ملنے نہیں آرہا۔ وہ وہاں ایسے انتظار کر رہی تھی جیسے آذر نے اسے فون کر کے وہاں آنے کے لیے کہا ہو۔

تکلیف اور خوشی نے اس کے چہرے پر شکنوں کو نمایاں کر دیا تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ آذر سے ملنے جا رہی تھی۔

اس کی اپنی ماں سے نفرت اتنی بڑھ گئی کہ وہ اسے سزا دینے کے لیے گھر ہی چھوڑ گیا۔ اچھی سزا تھی جو فریال نے خوب کاٹی۔ وہ ایک کرپٹ عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ خاص کر ایسی عورت کے ساتھ جس کی وجہ سے اس کا باپ اسے بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ وہ ایک بری عورت تھی۔ وہ بار بار اسے کہہ گیا تھا کہ وہ بری عورت ہے اور وہ اس عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے گشتیوں والے کام بھی شروع کر دیے۔" وہ کچن میں کھڑی رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ آذر سامنے ہی بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا' جب وہ بیگ ہاتھ میں لیے اس کے سامنے کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

"دیدہ دلیری تو دیکھو۔ بے شرم ویسے ہی دلیر ہو جاتا ہے۔"

"جیسے تم ہو۔" وہ بدستور اپنا کام کرتے ہوئے پلٹے بغیر بولی۔

"مجھے بے شرم کہا۔" بیگ پھینک کر اس نے اس کی گردن پکڑی۔

"تمہیں تمہاری اصلیت بتا رہی ہوں۔" اس سے اپنی گردن آزاد کروا کر وہ کچن سے باہر نکلی۔ آذر سہما ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"آذر! تم کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ آذر کے پاس آکر بولی۔ وہ جانتی تھی کہ اب یہ تماشا رات گئے تک لگا رہے گا۔

"بیٹھا رہنے دو اسے یہاں۔ اسے جاننے دو سب کچھ۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ماں باہر کیا کیا کرتی ہے۔"

"آذر! آؤ میرے ساتھ۔" آذر کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے کمرے میں لے آئی اور دروازہ بند کر دیا۔

"اس کی ماں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتی ہے باہر۔ یہ بتاؤں اسے یا یہ کہ اس کا باپ سولہ منٹ کام کر کے کما کر نہیں لا سکتا۔ اسے کھلانا تو دور کی بات ہے۔" وہ واپس آکر کچن میں کام کرنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے رسید اس کی آنکھوں کے سامنے لا کر لہرائی' جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ رسید تو بیگ میں مل گئی۔ انگوٹھی کہاں ہے' ہیرے کی؟"

اسے عادت تھی اس کا بیگ' اس کی الماری حتیٰ کہ کچن میں بنے دراز تک چیک کرنے کی۔ جب وہ بالکل خالی جیب ہو جاتا تو وہ گھر کی ہر چیز سونگھتا پھرتا حتیٰ کہ گلدان اور لانڈری مشین بھی۔۔۔

"کس یار نے لے کر دی ہے یہ۔۔۔؟"

"تمہیں یقیناً" یار کی فکر تو نہیں ہوگی۔ فکر تو تمہیں انگوٹھی کی ہے نا؟" وہ برتن دھونے لگی۔

اس بات نے اسے اور طیش دلایا۔ اس نے اس کی کمر پر زور سے ایک لات ماری۔ انتہائی غصے میں وہ یہی کرتا تھا۔

"بد حرام۔۔۔ کس نے لے کر دی ہے؟" اس نے ایک سانس میں چار پانچ گالیاں دے دیں۔

کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ زمین پر ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"گوگی کی تھی۔ آج وہ میرے ساتھ خریداری کرنے گئی تھی۔ اس کے پاس سامان بہت تھا۔ میں نے اپنے بیگ میں رکھ لی۔"

"تو انگوٹھی اس نے نکال لی اور رسید تجھے پکڑا گئی؟

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ظلمت کی بستی میں

فاخرہ جبیں

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے نا مجھے؟ اپنے باپ کی طرح جو تیری کمائی کھاتا ہے۔"

"جاتے ہوئے وہ انگوٹھی لے گئی۔ رسید رہ گئی میرے بیگ میں۔ گوگی سے فون کرکے پوچھ لو۔" وہ جانتی تھی کہ ایک لات مارنے کے بعد وہ اب اسے سارے گھر میں گھسیٹے گا۔

مجھے یہ کہانی مت سنا۔ صرف اتنا بتا کہ یہ کس نے لے کر دی؟ تیرا کیا خیال ہے میں جانتا نہیں کہ وہ کمپنی کا ڈرائیور اور تو' دونوں کیا کیا کرتے پھرتے ہو۔"

"وہ میرا بھائی بنا ہوا ہے۔ کچھ شرم کرو۔"

"تم جیسی عورتیں بھائی ہی بناتی ہیں۔ بہت بھائی بنا رکھے ہوں گے اور بھی۔ کمپنی میں بھی۔"

"جیسے تم نے اپنی کئی بہنیں بنا رکھی ہیں۔"

"ہاں! بنا رکھی ہیں۔" وہ مارنے کے لیے اس کی طرف لپکا۔

"میرے پاس نہ آنا۔ میں پولیس کو فون کردوں گی۔"

"پولیس۔۔۔ کر پولیس کو فون۔۔۔ لے کر۔" کھڑا کھڑا وہ اسے اپنی ٹانگوں سے مارنے لگا۔ "آج تو کر ہی لے اپنا شوق پورا۔۔۔ جا۔۔۔ جا کر۔۔۔"

جب وہ اسے مارتے مارتے تھک گیا تو رسید اٹھا کر آذر کے کمرے میں آگیا اور کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

آذر پہلے ہی باہر کی آوازوں سے سہما بیٹھا تھا۔

"یہ دیکھو آذر!" نادر نے آذر کو گود میں بٹھایا۔ اس کا ماتھا چوما اور رسید اس کے ہاتھ میں دی۔ "تمہاری ماں نے اتنے بہت سارے پیسوں کی خریداری کی ہے۔ بہت مہنگی مہنگی چیزیں لی ہیں۔ یہ سب اسے اس کے دوست نے لے کر دی ہیں۔ تمہاری ماں اور وہ دوست آپس میں بہت خوش رہتے ہیں۔ تمہاری ماں نہ میرا خیال رکھتی ہے اور نہ ہی تمہارا۔ آج میں نے پوچھا کہ وہ آدمی کون تھا تو لڑنے لگی۔ ہمارا مذہب عورت کو ایسی آزادی نہیں دیتا۔ ایسی عورت کو بدکردار کہتے ہیں میں سمجھاتا ہوں تو مجھ سے لڑتی ہے۔"

سات سالہ آذر سر اٹھا کر حیرت سے اپنے باپ کی باتیں سن رہا تھا۔

"دروازہ کھولو نادر! خدا کے لیے بچے پر رحم کرو۔" فریال دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگی۔ "وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔ اپنے بچے پر تو رحم کرو نادر!"

"اسے تمہارے کرتوت بتا رہا ہوں۔" نادر نے چلا کر کہا۔

وہ مسلسل دروازہ پیٹے جارہی تھی جب تک کہ اس نے دروازہ کھول نہ دیا۔

"کیوں۔۔۔ تم نہیں چاہتیں اسے سب معلوم ہو۔۔۔ وہ۔۔۔"

فریال اس کی بات سنے بغیر آذر کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئی اور دروازہ لاک کرلیا۔ آذر اس سب ڈرامے کے دوران خاموش ہی تھا۔ وہ ہر بار خاموش ہی رہتا تھا۔

"پاپا مذاق کررہے تھے آذر! تمہارے ساتھ۔۔۔ تم جانتے ہو نا' کبھی کبھی انہیں غصہ آجاتا ہے۔" وہ آذر کا سر سہلانے لگی۔

ایک عرصے سے آذر کی معمولی کارکردگی پر اسے بار بار اسکول بلایا جارہا تھا۔ آذر دن بدن صفر ہی ہوتا جارہا تھا۔ اسکول کے ہی ڈاکٹر نے آذر کے لیے نفسیاتی ڈاکٹر تجویز کیا تھا۔ ایک ماہ سے فریال' آذر کو ڈاکٹر کے پاس لے کر بھی جارہی تھی۔ لیکن وہ ٹھیک کیسے ہوتا۔ ٹھیک ہونے کے لیے اس کے ماں اور باپ دونوں کا ٹھیک ہونا ضروری تھا اور ایسا ناممکن تھا۔ شروع سے ہی وہ کم گو تھا' لیکن گزرتے وقت نے اسے خاموش ترین بنا دیا۔ لندن میں آذر' فریال کا کل اثاثہ تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا۔۔۔

دس سال پہلے فریال جب بیاہ کر لندن آئی تھی تو اتنی اذیت ناک زندگی کے بارے میں اسے گمان تک نہیں تھا۔ وہ سرکاری اسکول سے آٹھ جماعتیں پاس تھی۔ نادر اس کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ چند سالوں سے وہ لندن میں ہی مقیم تھا۔ نادر نے ہی فریال سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا' کیوں؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ شادی کے فوراً بعد ہی وہ نادر کے ساتھ لندن

آگئی۔ لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ خود وہ بھی کرتی تھی۔ وہ گھر میں سب سے بڑی تھی اور کڑھائی سلائی کا کام کرکے گھر کے لیے ایک معمولی سا سہارا بنی ہوئی تھی۔ اس کے چار چھوٹے بہن بھائی سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے اور باپ پوسٹ آفس میں چوکیدار تھا۔ وہ بے حد غریب نہیں تھے۔ صرف اتنے کہ وہ تین وقت کا کھانا ہی سہولت سے کھا سکتے تھے بس۔۔۔

وہ لندن جارہی تھی یہ ان کے گھرانے کے لیے قارون کے خزانے جیسی بات تھی۔ وہ خزانہ نادر اور لندن تھے۔ لندن ایک ایسی جگہ' جہاں جانے کا اس کی ساتویں نسل بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

لندن میں نادر اسے ایک کمرے کے ڈربے نما گھر میں لے آیا۔ دو دن بعد ہی وہ اسے دواؤں کی ایک کمپنی میں لے گیا۔ نادر نے اسے ڈبل ڈیوٹی ورکرز میں لگوایا تھا۔ اسے اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا۔ محنت کرنے پر اسے اعتراض نہیں تھا۔ اپنے چھوٹے سے شہر میں بھی وہ محنت ہی کرتی تھی۔

نادر اس سے اس کی ساری تنخواہ لیتا تھا۔ نادر چند گنی چنی چیزیں کھانے پکانے کے لیے لے آتا۔ وہ لندن میں پاکستان سے زیادہ غربت کا سامنا کررہی تھی۔ نادر کا کہنا تھا کہ وہ اس قرض کو ادا کررہا ہے جو اسے لندن لانے کے لیے اس نے لیا تھا اور وہ بہت زیادہ تھا' جس کے لیے وہ بھی دن رات کام کررہا تھا۔ وہ چھوٹے شہر کی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی تھی اور لندن آکر رہنے میں ہی بہت خوش تھی۔

"انڈیا' پاکستان' بنگلہ دیش۔۔۔ بہت لوگ تم جیسی بیویاں امپورٹ کرتے ہیں وہاں سے۔"

یہ گوگی تھی۔ کمپنی میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی اس کی کچھ جھجک ختم ہوئی اور اس نے بولنا اور دوسروں کو سننا شروع کیا تو اسے بہت سی نئی باتوں کی سوجھ بوجھ آنے لگی۔ جونئی صرف اس کے لیے تھیں۔ اس کی بہت سی پاکستانی اور انڈین عورتوں سے دوستی ہوگئی تھی۔ گوگی سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کھانے کے دوران بھی گوگی ہی ان سب کو لیکچر دیتی۔

"ایک یہ ہے نرملا۔۔۔ دس سال سے یہاں کام کررہی ہے۔ آج تک میں نے اسے ڈھنگ کی ساڑھی میں نہیں دیکھا اور یہ پاکستان کی لڑکی نرملا سے بھی آگے ہے۔ اس نے لندن آکر آئس کریم تک خرید کر نہیں کھائی۔"

فریال اس کی سچائی پر افسردہ ہوگئی۔ یہ گوگی ہی تھی جو اسے گاہے بگاہے سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ نادر کو اپنا شوہر سمجھے۔ اسے اپنا آقا نہ بنائے۔ اسے سارے پیسے نہ دیا کرے کچھ اپنے پاس بھی رکھا کرے۔

پہلی بار مار بھی اسے اسی بات پر پڑی تھی' جب اس نے نادر کو آدھے پیسے دیے تھے۔ اس نے اس کی مار کھائی' مگر پیسے آدھے ہی دیے۔ پہلی بار مشکل لگا مگر اس نے کرلیا۔ وہ اپنے گھر پیسے بھیجنا چاہتی تھی۔ اس کا باپ بیمار تھا۔

"اگر وہ کماتی تھی تو اس کی کمائی پر صرف اسی کا حق تھا۔" یہ گوگی کا کہنا تھا' جسے وہ جلدی ہی سمجھ گئی' ٹھیک دو سال بعد۔۔۔ ہر بار نادر اسے پیسوں کے لیے مارتا۔ خود وہ پتا نہیں کیا کرتا تھا۔ کبھی دنوں کے لیے غائب رہتا تھا اور کبھی ہفتوں کے لیے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

وہ اس کی مار کھالیتی تھی مگر پھر بھی اس کی مار اور غصے سے ڈرتی تھی۔ تھوڑا بہت بھی وہ اپنی دوستوں کے کہنے پر بول لیتی تھی۔ تین سال بعد جب آذر آنے والا تھا تو گوگی کے مشورے پر ہی فریال نے گھر بدل لیا۔

"ہمت ہے تمہاری۔۔۔ تم اس غسل خانے جتنے گھر میں رہتی ہو۔"

گوگی نے ہی کرائے پر گھر لے کر دیا۔ کچھ اپنے جمع شدہ پیسے اور کچھ اس نے گوگی سے ادھار لیے اور وہ دو کمروں کے فلیٹ میں کرائے دار بن کر رہنے لگی۔

صاف ستھرا گھر اس کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی لایا۔ اسے اچھا لگتا تھا اس گھر میں رہنا۔ حیرت انگیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

طور پر نادر نے اس کے گھر بدلنے پر کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ کرتا بھی کیوں، گھر کا کرایہ بھی اسے دینا تھا اور اخراجات تو وہ پہلے ہی خود سے اٹھاتی تھی۔ جب نادر پورے پیسے لے لیتا تھا، تب بھی گنی چنی چیزیں ہی پکانے کے لیے لاتا تھا۔

"تم جیسی پاگل عورتیں ہی مردوں کو شیر بناتی ہیں۔" گوگی اسے کافی عرصے سے سمجھا رہی تھی کہ وہ نادر کو پیسے دینا بند کردے۔ گھر کا کرایہ، روز مرہ کے اخراجات، آذر کی ضروریات، اس کی اپنی صحت، مگر وہ کیسے یہ سب کرتی۔ وہ بار بار اسے یہی دھمکی دیتا تھا کہ وہ اسے پاکستان واپس بھیج دے گا۔ وہ پاکستان جانے سے ڈرتی تھی۔ یہاں تو وہ پھر بھی اچھا خاصا کما لیتی تھی گھر بھی پیسے بھیج دیتی تھی۔ وہاں وہ کیا کما سکتی تھی۔ وہی دو ڈھائی ہزار مہینے کے....

نادر اس کے گھر میں چھپا کر رکھے پیسے بھی نکال کر لے جاتا تھا۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ وہ اکیلی گھر چلاتی ہے، بچے کو سنبھالتی ہے۔

ایک دن پاکستان سے اس کے گھر والوں کا فون آیا ان کا کہنا تھا کہ نادر کی پاکستان میں موجودگی کی اڑتی اڑتی خبر ان تک پہنچی ہے۔ نادر مہینے سے غائب تھا۔ وہ اسے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانے کا بتا کر گیا تھا۔

"اڑتی اڑتی خبر سچ بھی ہو سکتی ہے۔" گوگی کو اڑتی اڑتی خبر پر یقین تھا۔

"لیکن وہ پاکستان جائے گا کیوں؟" فریال کو یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہاری طرح کی ایک اور لینے۔" گوگی سنجیدہ تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا کہ نادر یہیں ہے۔ وہ انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"اپنے گھر والوں سے کہو! وہاں پتا کریں۔ وہ وہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔"

"ابا بیمار رہتے ہیں۔ میں انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔"

"پھر خود ٹکٹ کٹواؤ اور جاؤ۔" گوگی کو غصہ آگیا۔

وہ اتنی سمجھ دار ہمت والی ہوتی تو ابھی تک نادر کی بیوی نہ ہوتی۔

جب نادر آیا تو اس نے اس سے پوچھا۔

"پاگل تو نہیں تمہارے گھر والے... مجھے کیا ضرورت تھی پاکستان جانے کی؟"

"اس کا پاسپورٹ دیکھنا تھا... دیکھا؟" گوگی پوچھ رہی تھی۔

"وہ تو اسی کے پاس ہوتا ہے۔ میں کیسے دیکھتی؟"

"پھر جا کر اپنا ڈربا چیک کر۔" گوگی نے نہ صرف مشورہ دیا، بلکہ اسے ساتھ لے کر بھی گئی۔

اس ڈربے میں واقعی ایک اور مرغی موجود تھی، انتہائی سادہ اور سہمی ہوئی۔ دو دن پہلے ہی وہ وہاں آئی تھی۔

"نادر کون ہے تمہارا؟" گوگی نے ہی ساری پڑتال کی۔

"شوہر۔"

"آں... اچھا۔ ہمارا مت بتانا۔ ہم یہاں پہلے کرائے دار تھے۔ اس لیے نادر کو جانتے ہیں۔" گوگی نے بچی کے گالوں پر چٹکی بھری۔ وہ بچی ہی تھی، جو اکیلی وہاں پڑی تھی۔

"کہا تھا نا تمہیں... دیکھ لی اس کی نئی بیوی... نئی فریال۔"

☼ ☼ ☼

"تم پاکستان سے ایک اور بیوی لائے ہو؟" دو دن بعد جب وہ گھر آیا تو فریال نے اس کے بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس کی بات پر وہ کافی دیر تک خاموش ہی رہا۔

"بیوی نہیں ہے میری... میرے دوست کی رشتے دار ہے۔ اسے یہاں کام کرنا تھا۔ پیپر میرج کرنا پڑی اس کے ویزے کے لیے۔ غریب ہے، بہن بھائیوں کی واحد کفیل ہے۔ میں نے تو مدد کی ہے اس کی۔" وہ

اسے اور تین چار باتیں سنا کر سونے چلا گیا۔

"او پاگل! اس لڑکی کی شکل یاد کر۔ وہ تجھے لگتی ہے برطانیہ آکر کام کرنے والی، وہ تو شاید کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلی ہوگی کبھی۔"

گوگی نے اسے سمجھایا بہت مثالیں دیں، مگر اس میں شاید سچ کو قبول کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بھی دھوکا دے رہی تھی۔ اس نے نادر کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

"جس عورت کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے۔ اس دھوکے میں آدھی وہ خود شریک ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنا دماغ استعمال نہیں کرتے۔ وہ کفران نعمت کرتے ہیں۔ عذاب صرف برے لوگوں کو ہی نہیں ملنا چاہیے۔ انہیں بھی ملنا چاہیے، جو برے لوگوں کو شہہ دیتے ہیں۔" گوگی کو بے تحاشا غصہ تھا فریال پر....

کچھ دنوں تک نادر باقاعدگی سے گھر آتا رہا۔ گھر کا ماحول بھی ٹھیک ہی رہا۔ ایسے دنوں میں آذر بہت خوش ہوتا تھا۔ جب نادر زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں گزارتا تھا۔

چند دنوں بعد اس کی پرانی ڈگر لوٹ آئی۔ فریال اس کی زندگی میں ایک ملازمہ سے بڑھ کر نہیں تھی۔ ایک بار مارنے کے بعد اس کا ہاتھ کھل گیا تھا۔ وہ بات بات پر اسے بلاوجہ مارتا تھا تاکہ وہ اس کے سامنے خوف زدہ ہی رہے۔

آذر بڑا ہو رہا تھا اور فریال نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سامنے کوئی لڑائی ہو۔ وہ اس کا واحد اثاثہ تھا۔ اسے اس کی تعلیم کے لیے اس ملک میں رہنا تھا۔ وہ اپنے بچے کو غربت میں واپس لے جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ڈبل ڈبل کام کرتی تھی۔ ہفتے کے پانچ دن دوائیوں کی کمپنی میں اور ہفتہ، اتوار ایک گودام میں، جہاں اس کا کام صفائی کرنا تھا۔ گھر میں اس کے بھائی، بہن بڑے ہو رہے تھے۔ ان کے لیے اسے الگ سے محنت کرنا پڑتی تھی۔ ان کا مستقبل بھی فریال کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

نادر کی بدترین عادت یہ تھی کہ وہ اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ وہ گھر آتا ہی کھانے اور پیسے لینے کے لیے تھا اور ہر بار مار، خاص کر آذر کے سامنے مار سے بچنے کے لیے اسے نادر کو پیسے دینے ہی پڑتے تھے۔ وہ نادر کے لیے کسی نہ کسی طرح پیسے بچا کر رکھتی۔

"میں اخبار کا نمائندہ تمہارے گھر بھیجتی ہوں۔ تم اسے اپنی کہانی سناؤ۔" گوگی ہر بار اسے اکساتی مگر وہ چھوٹے شہر کی چھوٹی عورت بڑی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

"نہیں! نادر مجھے طلاق دے دے گا۔"

"جب خود کو اور اپنے بچے کو تم پال رہی ہو تو طلاق ہو جانے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"میں اکیلا ہونے سے، رہنے سے ڈرتی ہوں۔"

اکیلے رہنے سے ڈرتی ہو؟ اکیلے مار کھاتے نہیں ڈرتیں؟ اس کے جوتے اپنے منہ پر کھاتی ہو اور اس کے منہ میں اپنی کمائی ڈالتی ہو۔ جو جوتی کاٹے اسے پھینک دیتے ہیں۔"

"نادر جوتی نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہا، نادر تو تمہارے پاؤں کی جوتی بھی نہیں ہے۔ میرے پہلے شوہر نے جب اپنے جوتے کی نوک میرے منہ میں گھسائی تو میں نے اسے اپنے لیے آخری بار سمجھ لیا۔ اسی رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جوتوں کو اپنے پیروں میں رکھوں گی۔ اپنے سر پر نہیں پڑنے دوں گی۔ جو ڈرتے ہیں، وہ زندگی نہیں گزارتے فریال! وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے بنائی گئی دوزخ میں خود کو جلاتے ہیں۔ یاد رکھنا فریال! ظلم کا ہر باب، ہم خود اپنے لیے لکھتے ہیں۔"

فریال صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میرا دوسرا شوہر انسان ہے۔ میں نے اپنی زندگی سے اس جانور کو نکال دیا۔ اب میں خوش ہوں اس دنیا میں برے بھی ملتے ہیں اور اچھے بھی...."

"میں آذر سے اس کا باپ نہیں چھین سکتی۔ تم جانتی ہو بروکن فیملیز کے بچے کیسے ہوتے ہیں۔"

"بروکن فیملیز کے بچے جیسے بھی ہوتے ہیں، وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

انسان ہی رہتے ہیں۔ نادر کے زیر سایہ تو آذر انسان بھی نہیں رہے گا۔ خود پر رحم کرو۔ آذر بڑا ہو کر جان جائے گا کہ تمہارے لیے طلاق کتنی ضروری تھی۔ پاکستانی ان پڑھ بیویوں والی سوچ کو آگ لگا دو۔ طلاق لے لو۔"

"لیکن آذر کا مکمل خاندان کا خواب ٹوٹ جائے گا۔"

وہ "we are family" سیریز بہت شوق سے دیکھتا ہے گوگی۔"

"تم پچھتاؤ گی فریال! امید اچھے کی کی جاتی ہے۔ نادر سے کسی اچھے کی امید مت رکھنا۔ اچھے وقت پر طلاق لے لو۔ آذر ابھی چھوٹا ہے۔"

"آذر ابھی چھوٹا ہے اسی لیے تو.... نادر کے گھر آتے ہی وہ اس کا سایہ بن جاتا ہے۔ نادر بہت پیار کرتا ہے آذر سے۔"

"ان دونوں کا یہ پیار تمہیں لے ڈوبے گا۔ اسے تمہارا دن رات کا کام کرنا یاد نہیں رہے گا۔ ہفتے بعد ملنے والا باپ کا پیار یاد رہے گا' آذر تمہارے ہاتھ سے کھائے نوالے بھول جائے گا۔"

"وہ بے شک باپ سے پیار کرے۔ مجھے تو بس اپنا بیٹا ایک کامیاب انسان چاہیے۔"

"ایک وقت میں تمہیں صرف آذر کا پیار ہی چاہیے ہوگا۔ یاد رکھنا! اس وقت آذر کا پیار ہی سب کچھ ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

وہ خیالوں میں اتنی گم نہیں تھی کہ بھول جاتی کہ وہ وہاں کیوں آئی ہے۔ ایک بار پھر اس نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔ چار بجنے میں چند منٹ تھے۔ خوشی خوشی وہ ہر گزرنے والے کو دیکھتی رہی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ مسکرا رہی تھی۔ آج اس کا بیٹا آرہا تھا۔ فریال نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آذر سے بالکل چھوٹے بچوں کی طرح لپٹ جائے گی تو وہ کیا کرلے گا کچھ نہیں اور وہ لپٹی ہی رہے گی۔

پانچ منٹ... دس منٹ .... فریال نے قریب سے گزرتی ایک عورت سے اسکاٹ لینڈ سے آنے والی ٹرین کا پوچھا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ تصدیق ہو چکی تھی ٹرین آچکی تھی۔ آذر بھی بس باہر آنے ہی والا تھا۔ وہ اور چاق و چوبند ہو کر دیکھنے لگی۔

وہ آنے ہی والا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں وہ میرے سامنے کھڑا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

جب آذر ذرا اور بڑا ہوا تب اسے معلوم ہوا کہ نادر اور اس کے درمیان ہونے والی تکراروں اور لڑائیوں کا اس نے کتنا گہرا اثر لیا تھا۔ آئے دن اس کے رویے کی شکایت اسکول سے آنے لگیں۔ وہ نادر کی طرح ہی بدتمیز اور اکھڑ ہوتا جارہا تھا۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ آذر کے اچھے گریڈ کے بجائے اسے اس طرح کی رپورٹس ملیں۔

اب اس نے اور زیادہ کوشش کرنی شروع کردی کہ نادر سے اس کا سامنا ہی نہ ہو' لیکن چھوٹا سا گھر تھا اور نادر اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ کوئی بھی ملاقات لڑے بغیر نہیں گزارتا تھا۔ زیادہ لڑائی اس کے نشے میں ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اس کے آتے ہی فریال اسے کھانا کھلا کر جیسے تیسے جمع کیے گئے پیسے پکڑا دیتی۔ اس سے وہ یہ سمجھنے لگا کہ شاید فریال زیادہ ہی کمانے لگی ہے۔ وہ اس سے اور زیادہ پیسے مانگنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نادر کے سامنے سب تدبیریں الٹی ہی ہوئی تھیں۔ آذر سے وہ نادر کے خلاف کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرتی تھی۔ آذر یہی جانتا تھا کہ وہ دوسرے شہر جاب کرتا تھا اور چھٹی ملنے پر ہفتوں بعد ہی گھر آتا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے اسکول جانے والے بچے کے ذہن پر اور کتنا بوجھ لادتی' وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا باپ نشئی ہے' جوا کھیلتا ہے اور اپنی بیوی کی حلال کی ساری کمائی لے اڑتا ہے۔

"تم اپنے گھر پیسے بھجواتی ہو؟"

"نہیں...!" اس نے صاف جھوٹ بولا۔

"میرے ساتھ ہیرا پھیری نہ کرو فریال!" اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "میرے پاس ثبوت ہے۔ اپنے منہ سے خود اگل دو' ورنہ جلتے چولہے پر رکھ دوں گا۔"

"ایک' دوبار..." وہ اٹکی۔ "نہیں ضرورت تھی تو..."

"ضرورت کی کچھ لگتی... تو ان کی ماں ہے...؟ جانتی ہے میرے کتنے پیسے لگے ہیں تجھے یہاں لانے میں؟ کتنے عیش سے رہ رہی ہے تو یہاں۔ شوہر کو ایک روپیہ نہیں دیتا اور اپنے بھوکے ننگے بہن' بھائیوں پر بہت ترس آتا ہے۔"

آذر کے سامنے وہ ایسے ہی بڑے بڑے جھوٹ بولتا تھا۔ وہ جانتا تھا آذر' فریال کی کمزوری ہے اور وہ اتنا گھاگ تھا کہ آذر پر قطرہ قطرہ زہر ٹپکا رہا تھا۔

"مجھ سے تو کہتی تھی کہ آذر کے کمپیوٹر کے لیے پیسے جمع کررہی ہوں۔ تو' تو ان کے لیے نان نفقے کا انتظام کررہی تھی۔" نادر نے ایک اور جھوٹ گھڑا۔

"آذر! ادھر آؤ۔" آذر بھاگ کر اپنے پاپا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"تمہاری ماما نے سارے پیسے اپنے بہن بھائیوں کو پاکستان بھجوا دیے ہیں' جو میں نے اسے تمہارے لیے دیے تھے۔"

"آذر کو کیوں پریشان کررہے ہو نادر... آذر! اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"یہ یہیں رہے گا۔ سب سنے گا یہ۔"

"خدا کے لیے نادر! اپنے بیٹے پر رحم کرو۔ اب نہیں بھیجوں گی پیسے وہاں۔ آذر بیٹا! جاؤ جا کر کھیلو۔"

"یاد رکھنا فریال! میرے ساتھ کوئی چالاکی نہ کرنا۔" آذر کے جاتے ہی نادر نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔ "بیٹا چھین کر تمہیں پاکستان چلتا کروں گا۔"

"نادر کو بتانا تھا' یہ لندن ہے۔ پاکستان نہیں' جہاں وہ بیٹا چھین لے گا۔ زبان تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ عقل کب آئے گی؟ ایک شخص کو شوہر بننے کے تم پیسے بھی دے رہی ہو۔ اس سے مار بھی کھا رہی ہو اور ڈرتی بھی اسی سے ہو۔"

"کیا کروں پھر... ذرا میں ادھر ادھر ہوتی ہوں تو آذر سے پتا نہیں کیا' کیا کہتا رہتا ہے۔ کچھ دن پہلے اسے کہہ رہا تھا' اپنی ماما پر نظر رکھا کرو۔"

"واہ... ایک بچے سے کہہ رہا تھا۔ داد دیتی ہوں نادر کو۔ ابھی بھی عقل پکڑ لو۔ سانپ ہے نادر۔ تمہارے بچے کو زہر پلا رہا ہے۔"

"پھر کیا کروں؟" وہ اور الجھی۔

"چلتا کرو... آذر کا دماغ خراب کردے گا۔ نامعلوم اور کیا' کیا کہتا ہے اسے۔ اپنے ہاتھوں آذر کو دوسرا نادر مت بناؤ۔"

"کیسے چلتا کروں۔" وہ بے بسی سے گوگی کو دیکھنے لگی۔ طلاق کے نام سے ہی اس کی روح فنا ہوتی تھی۔

ان ہی دنوں وہ کمزوری اور نقاہت سے گودام کے اسٹور میں کام کرتے ہوئے چکرا کر گر گئی۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد اسے گودام کے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ ایک بنگالی ڈرائیور تھا اور اس کے ساتھ فریال کی اچھی دعا' سلام تھی۔ مروتاً چائے کے لیے وہ اسے گھر کے اندر لے آئی۔ چائے پی کر وہ جا ہی رہا تھا کہ نادر آگیا۔ اس نے بنگالی کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی اس بات پر نادر ضرور لڑے گا۔ لیکن وہ لڑا نہیں' بلکہ اس کی گردن دبوچ لی اور اسے زمین پر پٹخ دیا... اپنے بھاری جوتوں سے اسے مارنے لگا۔ وہ نشے میں تھا اور اس کی سرخ آنکھیں باہر آنے کو تھیں۔ وہ اسے گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔

"مجھے شک تھا... ذلالت دکھا دی نا! ایسے ہی تو اتنی زبان نہیں چلتی' بہت سوں کی شہہ ملی ہوئی ہے نا' بہت سہارے... بہت پیسے' بہت عیش..."

اس نے اپنے بھاری جوتے سے اس کا منہ مسلا۔ وہ اس کے ہونٹوں اور گالوں پر اپنے جوتے کے تلوے رگڑ رہا تھا۔ فریال کے دانتوں اور ہونٹوں سے خون نکلنے لگا۔

"دیکھ آذر! اپنی ماں کے کرتوت۔ آج اپنے یار کو گھر لے آئی۔ اسی لیے یہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے منہ نہیں لگاتی۔" غصے اور توہین کے احساس سے فریال کا منہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بمشکل اٹھ کر ہر وہ چیز اس پر پھینکنی شروع کر دی جو اس کے ہاتھ آئی۔ اس سے پہلے وہ صرف خود کو بچاتی تھی۔ آج پہلی بار اس نے مدافعت کی کوشش کی۔

"مجھے ہاتھ لگا کر دکھا نادر! اب تو..."

پندرہ منٹ کے اندر اندر پولیس نادر کو لے گئی۔

"بھاگ جا آذر... اس عورت کے شر سے نجات حاصل کر لے۔" پولیس کے آنے کے باوجود وہ زخمی کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔

"یہ تیرے ساتھ بھی یہی کرے گی جو میرے ساتھ کیا۔"

آذر ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ فریال نے اسے اندر کمرے میں لے جانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔

وہ آخری منظر تھا جو آذر نے دیکھا اور وہ آخری مار تھی، جو فریال نے اس دن کھائی۔ گوگی کی مدد سے اس نے طلاق بھی لے لی۔

اس کا خیال تھا کہ نادر اسے تنگ کرے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ویسے بھی کورٹ کے آرڈر کی وجہ سے اسے فریال سے ایک ہزار گز دور ہی رہنا تھا۔ فریال نے اپنے گھر والوں کو سب کچھ بتا دیا۔ صرف ایک آذر تھا، جو سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ آذر تو وہ جانتا تھا جو اس کے پاپا اسے بتایا کرتے تھے۔

"تمہاری ماما کام کرنے نہیں جاتی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے جاتی ہے۔"

آخری بات جو اسے معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ ماما اپنا دوست گھر لے آئی تھیں، جس پر پاپا ناراض ہو گئے اور ماما نے پولیس کو بلوا لیا۔

آذر نادر کو یاد کر کے بہت روتا تھا۔ روتی وہ بھی تھی اس سے اپنے بیٹے کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ پھر آذر اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ بہت ضرورت کے وقت ہی وہ فریال سے بات کرتا۔ وہ بہت بد مزاج اور چڑچڑا ہو گیا۔

میں چاہتی ہوں نادر، آذر سے ملنے آجایا کرے، لیکن میرے پاس نادر کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔ کیسے رابطہ کروں اس سے؟

"اتنا ہی پیار ہوتا اسے آذر سے تو خود آکر ملتا۔"

"آذر بہت اداس رہتا ہے نادر کے لیے... بہت روتا ہے۔"

آج کا رونا کل کے رونے سے اچھا ہے۔

"آذر کو یہ کیسے سمجھاؤں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"مجھ سے تو بات ہی نہیں کرتا۔"

"بچہ ہے، سمجھ جائے گا۔" گوگی نے تسلی دی۔

گزرتے وقت نے آذر کی ناپسندیدگی کو اس پر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے چھوٹے بڑے سارے کام خود ہی کرتا تھا۔ اپنے لیے کھانا خود بناتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس سے کچھ نہیں کہتا تھا، مگر اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں۔

"تمہارے ماموں آرہے ہیں آذر!" اس دن وہ بہت خوش تھی۔ پہلے تو اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے سنا ہی نہیں، پھر کمرے کی طرف جاتے جاتے رک کر پلٹا۔

"پاپا ٹھیک کہتے تھے۔ جو عورت اپنے خاندان کو پالتی ہے، وہ اپنی اولاد کو ڈستی ہے۔"

آذر کی اس بات نے اسے سن سا کر دیا۔ اسے اپنے باپ کی کہی باتیں یاد تھیں۔

آہستہ آہستہ آذر نے ضرورت کے لیے اس سے پیسے لینے بھی بند کر دیے تھے۔ وہ جو کچھ اس کے لیے خرید کر لاتی، وہ ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے، وہ نادر سے ملتا ہے باہر کہیں۔"

"شاید... اس کا یہ رویہ بلاوجہ نہیں۔" فریال بہت پریشان تھی۔

"لیکن نادر کا تو کچھ اتا پتا ہی نہیں کہ کہاں ہے۔"

"ہو سکتا ہے، آذر نے اسے ڈھونڈ نکالا ہو۔" فریال یہ سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

"آذر! تم اپنے پاپا سے ملے کبھی؟" فریال نے پیار سے ہی پوچھا تھا۔

"مل لیتا... اگر آپ نے ملنے کے لائق چھوڑا ہوتا۔" آذر نے نفرت سے کہا۔ "آپ کی وجہ سے ان کی اتنی بدنامی ہوئی کہ انہوں نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا، آپ نے انہیں جیل بھیج دیا۔ وہ شاید پتا کرتا رہا تھا نادر کا۔

"وہ مجھے مار دیتا۔ تب تم خوش ہوتے؟" اس نے دکھ سے آذر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے بھی بہت بار جتا چکا تھا آذر کا جیل جانا۔

"بری عورتوں کو مار ہی دینا چاہیے۔" آذر نے اتنی سفاکی سے کہا کہ وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔

"میں تمہاری ماں ہوں آذر! کیا غلط کیا ہے میں نے آج تک؟"

"کیا غلط کیا تھا پاپا نے... آپ کو روکتے ہی تھے نا... دن رات آپ باہر رہتی تھیں، اپنے دوستوں کے ساتھ۔"

"اب تم اتنے بھی بچے نہیں ہو کہ یہ جان نہ سکو کہ تمہاری ماں دوست رکھنے کی شوقین نہیں ہے۔"

"اور وہ جو صدیقی آتا ہے؟"

"انکل کہو انہیں... بھائی ہے وہ میرا۔ ہر برے وقت میں مدد کی ہے اس نے میری۔"

"ہونہہ... بھائی... بچہ نہیں ہوں میں۔"

آذر کے اس رویے سے وہ اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ اس کے دل میں درد رہنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے اپنا خیال رکھنے کو کہا۔ گوگی نے آذر کو بہت سمجھایا۔ ماضی کی بہت سی باتیں بتائیں، لیکن جیسے وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر کسی بھی بات کا اثر نہیں ہوا تھا۔

اٹھارہ سال کا ہوتے ہی اس نے گھر چھوڑ دیا۔ شاید گھر چھوڑنے کے جن انتظامات میں وہ لگا ہوا تھا، وہ ہو چکے تھے۔ اپنے لیے کسی اور جگہ انتظام کر چکنے کے بعد اس نے گھر چھوڑ دیا۔ فریال کے نام اس نے ایک چٹ تک لکھنا گوارا نہیں کی۔

چند دن پہلے جب وہ گھر آیا تو نادر کی طرح ہی اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کر دیں۔

"آج پاپا کو دیکھا میں نے۔" وہ تنفر سے فریال کو جتا کر بولا۔ "اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ ان کی دوسری بیوی پہلی بیوی فریال جیسی جو نہیں ہے۔"

اس دن اسے معلوم ہوا کہ کوئی بھی فریال جیسا نہیں۔ سب نادر جیسے ہی تھے۔

اور پھر آذر چلا گیا... اور دوبارہ اس سے کبھی نہیں ملا۔

فریال نے اپنا ہر ذریعہ استعمال کر لیا، مگر وہ نہیں ملا۔ شام ہونے لگی تھی۔ چار کب کے بج چکے تھے۔ اسکاٹ لینڈ سے ٹرین بہت پہلے آچکی تھی۔ مگر آذر نہیں آیا تھا۔ آذر بھیڑ میں کہیں بھی نہیں تھا۔ خود کو سنبھالتی وہ لوگوں کے رش میں چلنے لگی۔ کاؤنٹر پر آکر اس نے ٹرین کا پوچھا، پھر آذر کا نام بتایا۔

"کیا اس نے میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہے۔"

کاؤنٹر مین فریال کی شکل دیکھنے لگا۔ ٹرینیں آجا رہی تھیں، مگر آذر نہیں آیا۔ اس نے ثانیہ کو فون کیا۔

"آنٹی! آذر لندن میں ہی ہے۔ وہ آپ کو نہیں ملا؟ کچھ دیر پہلے ہی اس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ لندن پہنچ چکا ہے۔ وہ نظر نہیں آیا آپ کو؟"

"نہیں..." فریال نے اپنی ہچکی دبا کر کہا۔

"میں آذر کو فون کرتی ہوں، پھر آپ کو بتاتی ہوں۔"

فریال نے بمشکل چند منٹ انتظار کیا، پھر فون کیا۔ فون مصروف تھا۔ پانچ منٹ بعد، سات منٹ، دس، پندرہ... وہ مسلسل فون کیے جا رہی تھی۔

"آنٹی! وہ لندن ہی میں ہے... میرے اصرار پر بھی مجھے کچھ نہیں بتایا کہ کہاں ہے... بہت جلدی میں تھا۔"

"مجھے تو اسٹیشن پر وہ کہیں نظر نہیں آیا... وہ کیسے یہاں آگیا؟"

"وہ جہاز سے..."

"تم نے تو کہا تھا، وہ ٹرین سے آرہا ہے؟" اسے دکھ سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ وہ ایئرپورٹ پر اس کا انتظار کر لیتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یقین کیجیے! آذر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ شاید کسی مسئلہ کی وجہ سے اسے جہاز سے اتارا پڑا ہو۔"

اس نے بے دلی سے فون کو کوٹ کی جیب میں رکھا اور بے دم سی ایک طرف چلنے لگی۔ کس طرف؟ اسے نہیں معلوم تھا۔ معلوم کرکے کرنا بھی کیا تھا۔ لندن سینٹرل اسٹیشن کی بھیڑ میں وہ تنہا سی ہو گئی۔

کیسا لگتا ہے منزل کے بغیر سفر کرنا... سفر بھی دکھ اور تکلیف سے پُر... اس نے بھی وہی سفر کیا تھا۔

"تم نہیں آئے نا آذر!" چلتے چلتے وہ بڑبڑانے لگی۔ ایک عرصہ ہوا وہ خود سے اور آذر سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگی تھی۔

"تم سے ایک بار ملنے کے لیے میں جہنم کی آگ میں کود سکتی ہوں، لیکن تم تو نادر ہی بن گئے... میرا بیٹا نادر کا بیٹا بن گیا... آذر میرا بیٹا۔"

وہ رونے لگی۔ آنسو اس کے لانگ کوٹ کے کالر میں جذب ہونے لگے۔

"تم تو ملے نہیں، کاش! آج مجھے موت مل جائے... اگر تم کسی کونے سے لپک کر میری طرف نہ آؤ تو موت آجائے۔" وہ اسٹیشن کی حدود سے باہر اب سڑک پر تھی۔ گھر جانے کے لیے اسے بس میں چالیس منٹ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ پیدل ہی سمت کا تعین کیے بغیر چلنے لگی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کمزوری اور نقاہت سے زیادہ اسے صدمے نے نڈھال کر دیا تھا۔ اس کا پچیس سالہ بیٹا اس ماں سے ملنا نہیں چاہتا تھا، جس نے اٹھائیس سال اپنے پیاروں سے دور صرف اس کے لیے یہاں اکیلے گزار دیے تھے۔ کیسا لگتا ہے۔ اٹھائیس سال کی ریاضت اور دکھ کے بعد ناکام ہونا۔ ساری محنت، محبت اور ایمان داری کے بعد ناکام ہونا۔

وہ مین روڈ پر بنی ان دکانوں کے آگے سے گزر رہی تھی، جن میں لوگ خوشی خوشی چیزیں خرید رہے تھے۔ کاش! وہ بھی آذر کہیں سے خرید سکتی۔

لندن شہر جگمگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھی۔ قریب سے گزرنے والے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ نومبر کی سرد راتوں کے گرم آنسو۔

☼ ☼ ☼

"میری ٹیسٹ رپورٹ پر سائن آپ نے کیے ہیں؟" آذر اس وقت نویں جماعت کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کچن میں کام کر رہی تھی، جب وہ دروازہ زور سے بند کرکے اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ خود سے تو وہ اپنی ڈائری، رپورٹس تو کیا دکھاتا نہیں تھا اسے... وہ خود ہی بیگ چیک کرتی رہتی تھی۔

"ہاں...!"

"کیا میں نے آپ سے کہا تھا سائن کرنے کے لیے؟"

"تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں میرے ہی سائن ہونے تھے۔"

"یہاں میرے ڈیڈ کے سائن ہونے تھے۔"

"سائن میں ہی کرتی رہی ہوں۔"

"آپ تو بہت کچھ کرتی رہی ہیں۔ تب میں بچہ تھا، اب نہیں۔"

"کیا کرتی رہی ہوں میں...؟" آذر نے اپنی رپورٹ پھاڑ کر پھینک دی۔

"میری کسی چیز کو ہاتھ مت لگایا کریں۔"

"تمہیں معلوم ہے آذر! تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو...؟ اپنی ماں کے ساتھ۔"

"آپ کو معلوم ہے آپ نے کیا کیا، میرے اور ڈیڈ کے ساتھ؟"

"کیا کیا... بتاؤ مجھے۔"

"آپ نے ہر وہ کام کیا جس سے ڈیڈ نے آپ کو منع کیا۔"

"اس نے کبھی مجھے پیسے کما کر گھر چلانے اور تمہیں پالنے سے تو منع نہیں کیا۔"

"پیسے آپ اپنے گھر والوں کے لیے کماتی تھیں۔ جن عورتوں کے دل اپنے گھروں میں نہیں لگتے، وہ ساری دنیا کو اپنائے رکھتی ہیں۔"

"اکیلے ہی زندگی گزار رہی ہوں۔ کون ہے جسے اپنایا ہے؟"

"مجھ سے اپنی ذاتیات کی تفصیل مت پوچھے... میں گناہ گار عورت کے گناہوں پر بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"جس عورت نے مردوں کی طرح حلال رزق کمایا۔ اپنے بیٹے کے لیے اکیلے زندگی گزار دی۔ وہ گناہ گار ہے؟"

"آپ کو شوق تھا سنگل ہونے کا... آزاد رہنے کا۔"

"آزاد رہنے کا نہیں، مار پیٹ سے بچنے کا شوق تھا۔"

"برے کاموں سے کوئی آپ کو روکے بھی نا؟" آذر کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔

"گوگی ٹھیک کہتی تھی۔ نادر تمہارے اندر زہر بھر رہا ہے۔"

"دنیا آپ سے ٹھیک کہتی ہے۔ آپ کو ٹھیک نہیں کہتی۔" آذر نے زہر میں بجھا طنز کیا۔ وہ طنز کرتا تھا اور طنز بھری نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اسے لے کر پاکستان چلی جاؤ۔" گوگی نے مشورہ دیا۔

"کس کے پاس... اپنے ماموں، نانا، نانی سے وہ ملے بغیر ہی اتنی نفرت کرتا ہے۔ اسے بس نادر چاہیے۔"

"تو بھیج دو اسے نادر کے پاس۔ چار دن رہے گا اس کے پاس تو سب سمجھ جائے گا۔"

نادر کہیں ملتا تو وہ کچھ کرتی۔ بیوی کے نام پر وہ ماں بنی اور ماں کے نام پر گناہ گار۔

"آذر مجھے نادر کی نظروں سے دیکھتا ہے گوگی! تنفر اور حقارت سے۔ مجھ جیسی ماں سے پوچھو، اولاد کی نفرت کا دکھ۔ پہلے باپ مارتا تھا۔ اب بیٹا لفظوں کی مار مارتا ہے۔" گوگی کے سامنے وہ کھل کر رونے لگی۔

"یہ سب تمہاری کمزوریوں کا نتیجہ ہے فریال! عورت میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ وہ بگڑی بات کو سنوار سکے۔ آخر تم کب اپنے ڈر اور خوف سے نجات حاصل کرو گی؟"

"ساری عمر ڈرتی رہی ہوں سب سے... پہلے اپنے باپ سے، پھر شوہر سے، پھر طلاق سے۔ اب آذر سے، اس کی نفرت سے، اس کی حقارت سے۔"

"جہاں ڈرنا سیکھا ہے، کچھ اور بھی سیکھ لو۔ تمہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ تم خود ہارتی ہو۔"

چلتے چلتے جب وہ تھک گئی تو ایک پارک میں آکر بیٹھ گئی۔ پارک میں اکا دکا لوگ ہی تھے نومبر کی سردی میں لوگ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ ایسے گھر جہاں بچوں کا پیار ہوتا ہے اور ماں باپ کا احترام۔

☼ ☼ ☼

آذر سولہ سال کا ہوا تو فریال سے چھوٹا بھائی نعمان لندن پڑھنے اور کام کرنے کے لیے آیا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ نعمان ایئرپورٹ سے فریال کے گھر ہی آیا تھا۔ فریال نعمان کے آنے پر بہت خوش تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ کسی سے ملنے والی تھی۔ کسی اپنے سے۔ لیکن آذر کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ کھیلنے کے بعد باہر سے آیا تو اتنی نفرت سے نعمان کی طرف دیکھا کہ وہ اٹھ کر اسے پیار بھی نہیں کر سکا۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے اپنے کمرے کی چیزیں پھینکنی شروع کر دیں۔ نعمان سب سمجھ گیا۔ فریال گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"یہ مغرب ہے۔ یہاں کے بچے..." وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"وجہ مشرق، مغرب نہیں ہے آپی!" وہ بھی اتنا ہی کہہ سکا۔

نعمان، فریال کے ساتھ ہی رہنے آیا تھا اور فریال بھی اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی مگر... وہ ایسا کیسے کرتی۔

"یہ شخص دوبارہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔" نعمان کے جاتے ہی آذر چلانے لگا۔

"وہ تمہارے ماموں ہیں۔" اس نے تحمل سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ صرف آپ کا بھائی ہے۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

نعمان، آذر کی موجودگی میں پھر نہیں آیا۔ ویسے بھی وہ رات دن کام کرتا تھا۔ اسے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی تھی وہ اتنا مضبوط ہونا چاہتا تھا کہ پھر اس کی کسی بہن کو نادر نہ مل سکے۔

گزرتے وقت نے فریال کے لیے کچھ نہیں بدلا۔ خوشی کا کوئی لمحہ اسے نصیب نہیں ہوا۔ جاتے ہوئے آذر اپنے کمرے میں لگی نادر کی تصویر لے کر گیا بس۔۔۔

تین دن اسپتال میں رہ کر گوگی اسے اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ اس کے ہر ملنے جلنے والے نے آذر کو ڈھونڈنا چاہا، مگر وہ نہیں ملا۔

اپنے فارغ وقت میں نعمان بھی یہی کام کرتا تھا۔ سارا لندن، سارا برطانیہ کھنگال ڈالا، مگر آذر نہیں ملا۔۔۔

فریال کی بگڑتی جسمانی اور ذہنی حالت کی وجہ سے نعمان، فریال کے ساتھ رہنے لگا۔

"ایک بار آذر کو لے آؤ۔ اس سے کہو، مجھ سے نفرت ہی رکھے، مگر میرے سامنے رہے۔ اس کی ماں اس کے بغیر مر جائے گی۔"

وہ ہر وقت تڑپتی رہتی۔ ہر ایک کے سامنے روتی رہتی۔ نعمان چاہتا تھا کہ وہ پاکستان چلی جائے، مگر وہ نہیں جاتی تھی۔

"میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ نادر سب لے گیا۔" نادر نام کا "حیوان" اس کا سب کچھ کھا گیا۔

اگر گوگی اور نعمان نہ ہوتے تو شاید وہ خود کشی کر لیتی۔ اس نے جاب چھوڑ دی۔ سارا وقت وہ آذر کو ہی نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی رہتی۔ نہ جانے کہاں کہاں، کن کن لوگوں سے ملتی۔ پھر وہ ایک سیاہ فام گروپ سے ملی، جو آذر کو تلاش کرنے کے لیے تیار تھا، مگر وہ اتنے زیادہ پیسے مانگ رہے تھے کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں رکھے تھوڑے سے پیسوں سمیت گھر کی ہر چیز بک جاتی تو بھی وہ رقم ادا نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے دوبارہ ڈبل جاب شروع کر دی۔ ہفتہ، اتوار دوسری جاب۔ اس نے ایک ایک پاؤنڈ بچانا شروع کر دیا۔ انتہائی ضرورت کے علاوہ پیسہ خرچ کرنا بند کر دیا۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ سیرپ۔۔۔ فوڈ سپلیمنٹ، کبھی کبھار کے لیے جانے والے کپڑے، جوتے، وہ صرف تین وقت کے سادہ کھانے پر آ گئی۔

ایک عرصہ لگا فریال کو ایڈوانس کی رقم جمع کرنے میں، گوگی سے بھی ادھار لیا۔ نعمان سے بھی پیسے لیے گھر کا کچھ سامان بیچ کر حاصل شدہ رقم شامل کی۔ ایڈوانس لینے کے تین ماہ بعد فریال کو آذر کے بارے میں معلومات ملنے لگیں۔

لندن سے وہ سیدھا فرانس گیا تھا۔ فرانس کی یونیورسٹی سے دو سالہ ڈگری لینے کے بعد اس نے وہیں کسی کمپنی میں ڈیڑھ سال تک جاب کی۔ پھر وہ سوئیڈن چلا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد وہ وہاں سے بھی چلا گیا۔ کہاں چلا گیا، وہ معلوم کر رہے تھے اور ظاہر ہے یہ معلومات حاصل کر کے "اب وہ کہاں ہے" کی معلومات فریال کو مکمل رقم کی ادائیگی کے بعد ہی ملنی تھی۔

نعمان اور گوگی کا خیال تھا کہ وہ اپنی رقم ضائع کر رہی ہے، ان لوگوں کو دے کر۔ وہ لوگ اسے الو بنا رہے ہیں۔

"بننے دو مجھے الو۔ ماں بن گئی ہوں۔ اب دیکھنا! کیا کیا نہیں بنتی۔"

اس کی صحت دن بدن گرتی ہی جا رہی تھی۔ اسے اتنا زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ نعمان نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاب کرے، مگر وہ مانتی ہی نہیں تھی۔

"آپی! آپ نے اپنا آپ برباد کر لیا ہے۔ بس کر دیں اب۔"

"آذر کے ملنے تک مجھے اور کر لینے دو۔۔۔ میں اس سے ملے بغیر نہیں مروں گی۔ وہ میری جمع پونجی ہے۔ ایسے کیسے اسے میں دنیا میں بانٹ دوں۔"

جب فریال نے مکمل ادائیگی کر دی تو چند ہفتوں میں ہی انہوں نے بھی مکمل معلومات دے دیں۔

وہ جرمنی میں تھا، اپنی بیوی ثانیہ اور ایک آٹھ ماہ کی بچی نمل کے ساتھ وہاں وہ ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اسے فون نمبر اور گھر کا ایڈریس دونوں دے دیے گئے۔ فون نمبر اور ایڈریس ملتے ہی وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آذر مل چکا ہے۔

چھ سال اور چند ماہ بعد آذر اسے مل چکا تھا۔ اس نے پہلے فون کیا۔ یہ گھر کا نمبر تھا۔

"تمہاری ماں۔۔۔!" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"میری کوئی ماں نہیں۔" اتنے سالوں بعد بھی آذر نہیں بدلا تھا۔

آذر فون بند کر چکا تھا۔ ساری رات، اگلا سارا دن وہ فون پر فون کرتی رہی، مگر اس نے پھر فون نہیں اٹھایا۔

فریال کے پاس مزید ایک پاؤنڈ نہیں تھا کہ وہ جرمنی جا سکتی۔ وہ سب سے ادھار لے چکی تھی، نعمان، فریال کو انکار نہیں کرتا تھا، مگر اس نے اپنا سب کچھ ارسہ، نمو کی شادیوں پر لگا دیا تھا۔ چند ماہ پہلے اس نے سادگی سے برطانیہ کی ہی ایک پاکستانی نژاد لڑکی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ وہ فریال کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا تھا جو کچھ تھا فریال کے سامنے ہی تھا۔ اس نے فریال سے کچھ چھپا کر الگ نہیں رکھا تھا۔ وہ نعمان کے سامنے رونے لگی۔

"کسی بھی طرح مجھے جرمنی بھیج دو، اپنے گھر سے دھکے دے کر نکال تو نہیں دے گا نا۔ پھر تو اسے مجھ سے ملنا ہی پڑے گا۔" فریال نے ٹھوس دلیل دی۔

نعمان نے اپنا سب کچھ نکال کر اپنی بہن کے سامنے رکھ دیا۔ اپنی گھڑی، لیپ ٹاپ، اپنی بیوی کے گولڈ کے ایئر رنگز، جو جو کچھ بک سکتا تھا سب۔۔۔

نعمان اس کے جرمنی جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران وہ مسلسل اس کے گھر فون کرتی رہی۔ اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا جاتا۔ ایک دن ثانیہ فون اٹھا لیا۔

"آذر نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ وہ سختی سے مجھے منع کرتا ہے آپ سے متعلق کوئی بھی بات کرنے سے۔" وہ نرمی اور تحمل سے فریال سے مخاطب تھی۔

فریال نے رو رو کر ثانیہ کو اپنی زندگی کے واقعات سنائے۔ اس نے یقین کیا یا نہیں، مگر وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"آپ کی وجہ سے وہ یہ گھر شفٹ کر رہا ہے آنٹی۔۔۔!"

"کب۔۔۔؟" فریال کو لگا، آذر ایک بار پھر سے گم ہونے جا رہا ہے۔

"آج کل میں۔۔۔"

"میں جرمنی آ رہی ہوں ثانیہ۔۔۔!"

"ابھی مت آئیں آنٹی۔۔۔ میں کوشش کرتی ہوں آذر کو منانے کی اور سمجھانے کی۔ اس وقت تک تھوڑا انتظار کر لیں۔"

"کتنا انتظار اور ثانیہ۔۔۔!" وہ رونے لگی۔ "کر سکتی تو کر لیتی۔"

"وہ میری کوئی بات نہیں سنتا آنٹی۔ آپ یہاں آئیں تو مایوس ہوں گی۔۔۔ دکھی بھی۔"

دکھی تو وہ اور ہو ہی گئی تھی۔ آذر گھر شفٹ کر چکا تھا۔ ثانیہ کو اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ فریال سے بات نہیں کرے گی، پھر بھی کبھی کبھار ثانیہ چپکے سے فریال کو فون کر لیتی تھی۔

اور آج تین ماہ بعد اس نے ہی فون کر کے آذر کے لندن آنے کا بتایا تھا۔ جرمنی سے دو دن پہلے وہ اسکاٹ لینڈ آیا تھا۔ آج اسے لندن آنا تھا۔

وہ لندن آیا، مگر اس سے نہیں ملا۔

شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ وہ پارک میں ایک ہی انداز سے بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں کو رگڑتی ہوئی اٹھی اور پارک سے باہر آ گئی۔ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ اس کا دکھ اور تکلیف آج بے حد بڑھ چکی تھی اتنی کہ اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلتے وہ ایک دم سے سڑک پر گر گئی۔ آس پاس چلنے والے لپک کر اس کے قریب آئے۔ دکھوں کے عجیب انداز ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

آذر کو آفس کے کام سے اسکاٹ لینڈ بھیجا گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

برطانیہ سے باہر رہ کر بھی اس نے ہمیشہ نادر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے کچھ خبریں ملیں کہ وہ پاکستان جاچکا ہے۔ اس نے وہاں بھی معلوم کروانا چاہا مگر ناکام رہا۔ اسے نادر کی دوسری بیوی کے بارے میں کچھ معلومات ملی تھیں کہ وہ لندن میں ہی ہے۔ اس نے قیاس لگایا کہ اگر وہ لندن میں ہیں تو نادر بھی ہوگا۔

لندن آکر اسے کچھ وقت لگا گھر ڈھونڈنے میں مگر اسے مل ہی گیا۔ وہ ایک بڑا اور شان دار گھر تھا۔ اس کے ڈیڈ کا گھر' نادر کا گھر' اس کا گھر جس کے لیے وہ روتا رہا تھا۔ جس کا اس نے پاگلوں کی طرح انتظار کیا تھا۔

گھبرائے ہوئے انداز میں اس نے بیل بجائی۔

خوب صورت اور اسمارٹ سی عورت دروازے پر آئی۔ اس نے صرف مسکرا کر سوالیہ شکل بنائی۔ یہ وہی عورت تھی جسے آذر نے نادر کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں دیکھا تھا۔ جب تک وہ بھاگ کر فرسٹ فلور سے گراؤنڈ فلور تک آیا۔ وہ اس کی نظروں سے گم ہوچکے تھے۔ اسے پھر کبھی نادر نظر نہیں آیا۔

"میں آذر ہوں۔" آذر گھبرایا۔ "پاپا ہیں؟" اسے یقین تھا' پاپا کی یہ بیوی اسے ضرور جانتی ہوں گی۔

"کون پاپا۔۔۔؟" وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔

"نادر جمال۔" آذر بھی مسکرایا۔ خاتون کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"وہ یہاں کیوں ہوگا؟" اس بار وہ مسکرائی نہیں مگر جواب تحمل سے ہی دیا۔

"آپ ان کی بیوی۔۔۔؟" آذر تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"تھی۔۔۔ ایک عرصہ ہوا' ہماری طلاق ہوگئی۔" آذر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طلاق پر افسوس کرے یا نادر کا پوچھے۔

"اور ڈیڈ۔۔۔؟"

"اندر آجاؤ۔" وہ اسے اندر لے آئی۔ گزرتے ہوئے آذر نے لاؤنج میں دو کم سن لڑکا لڑکی کو فلم دیکھتے دیکھا۔

"تم اس کے کون سے بیٹے ہو؟" سوال تھا یا اقرار۔۔۔ آذر سمجھا نہیں۔

"کون سے۔۔۔؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں! کس بیوی کے کون سے بیٹے؟"

"پہلی بیوی کا پہلا بیٹا! میں ان کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ آپ کے بچوں کے علاوہ۔۔۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم اس کے اکلوتے بیٹے ہو۔ میری ایک بیٹی کے علاوہ۔۔۔"

"جی۔۔۔" آذر نے ساتھ سر بھی ہلایا۔

"اور تمہیں یقین ہے کہ تم اس کی پہلی بیوی سے ہو؟" آذر کو غصہ آگیا۔

"میں فریال کا بیٹا ہوں۔ وہ ان کی پہلی بیوی تھیں اور آپ دوسری۔۔۔"

"میں اس کی آٹھویں بیوی تھی آذر۔۔۔" وہ تحمل سے بولی۔

اس طرح کے صدمے سے آذر پہلی بار دوچار ہوا تھا۔ اسے سامنے بیٹھی عورت کی عقل پر گمان ہوا۔

"اب بتاؤ' اپنی مدر کا نمبر؟"

آذر ایسے خاموش ہوگیا تھا' جیسے نہ کچھ بولے گا' نہ پوچھے گا۔

سوال اتنی تکلیف دیتے ہیں۔ جواب اتنا غضب ڈھاتے ہیں۔

"میں نے ایک دوبار نام سنا تھا فریال کا۔۔۔ شاید وہ تیسری بیوی تھی نادر کی۔۔۔" وہ خود سے بتانے لگی۔

"وہ کہاں ہیں؟ کس بیوی کے گھر؟" آذر کو یہی سوال مناسب لگا۔

"گھر؟" وہ حیران ہوئی "وہ حکومت کے گھر میں۔۔۔ جیل میں ہے" اتنا بڑا صدمہ۔۔۔ آذر کا سر گھوم گیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔

وہ دانستہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ آذر کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی جذباتی حالت ٹھیک نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ کافی لے کر آئی۔

"جب میں نے اس کے ساتھ شادی کی تھی' اس وقت میں بھی اس کی پہلی بیوی ہی تھی۔ پہلی سے شاید نادر کا مطلب تھا' پہلی برطانوی شہری خاتون۔ باقی سب پاکستانی تھیں۔ اس وقت میرا ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔ دو سال پہلے ہی میں بیوہ ہوئی تھی۔ مجھے وہ اچھا لگا تھا۔ وہ روزانہ میرے ریسٹورنٹ آتا تھا۔ میرا اپنا گھر تھا۔ ریسٹورنٹ تھا۔ مجھے صرف ایک شوہر ہی چاہیے تھا' لیکن اسے صرف ایک بیوی نہیں چاہیے تھی۔ اسے پیسوں کی مشین چاہیے تھی۔ نہ جانے کیسے میں اس کے جال میں آگئی۔ اتنا عیاش اور بے غیرت انسان میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ریسٹورنٹ کے اکاؤنٹ میں ہیر پھیر کرتا تھا۔ پوچھا تو مجھ پر ہاتھ اٹھالیا۔ اصلیت سامنے آنے لگی تھی اس کی۔ میں نے مزید معلومات کروائیں تو مجھے اس کے ایک اور گھر کا پتا چلا جہاں وہ اپنی ساتویں بیوی کو بیاہ کرلایا تھا اور جسے وہ جانوروں کی طرح مارتا تھا۔ تنزیلہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی اور سمجھ دار بھی۔ ہم دونوں کو زیادہ وقت نہیں لگا نادر کی اصلیت کا پتا لگانے میں۔۔۔

وہ پاکستان سے لڑکیاں بیوی بنا کرلاتا تھا۔ یہاں ان سے رات دن کام کرواتا تھا اور ان کے سارے پیسے اپنے پاس رکھتا تھا۔ لڑکیاں کم پڑھی لکھی ہوتی تھیں' جنہیں ٹھیک سے اپنا پاسپورٹ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پولیس کے پکڑنے سے پہلے ہی نادر بیرون ملک بھاگ گیا۔ اپنی بیویوں کو ماں تو وہ بننے ہی نہیں دیتا تھا' پھر بھی وہ چار بچوں کا باپ بن گیا۔ ان میں سے ایک میری بیٹی بھی ہے۔

اس دوران فریال کا نام سننے میں بھی آیا تھا' مگر فریال سے ملاقات نہیں ہوسکی۔"

"فریال۔۔۔!" آذر کے دل ودماغ میں یہ نام گونجنے لگا۔

"اس پر شادی کے نام پر لڑکیوں کو ایکسپورٹ کرنے کا ہی الزام نہیں' وہ ڈرگ سپلائر بھی تھا۔ خدا نے صرف شکل ہی اچھی دی تھی' ورنہ کوئی اس پر تھوکنا بھی پسند نہ کرے۔"

آذر نے پسند کیا تھا اسے چاہنا۔۔۔ اور اپنی ماں کو دھتکارنا۔ اتنے سال وہ فریال نامی عورت سے نفرت کرتا رہا۔

"کچھ عرصہ پہلے مجھے خبر ملی کہ وہ امریکا کی کسی جیل میں ڈرگ کے کسی کیس میں عرصے سے قید کاٹ رہا ہے۔ کیس کوئی بھی ہو' سزا وہ ظلم کی بھگت رہا ہے۔۔۔ اپنے گناہوں کی۔"

"اور فریال نے کس جرم کی سزا بھگتی؟" اس کا دماغ الٹ پلٹ ہونے لگا۔

"میں چند ماہ پہلے ہی لندن شفٹ ہوئی ہوں' بیٹے کی یونیورسٹی کی وجہ سے۔ ورنہ اس شہر سے میری بہت تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ خاص کر وہ پہلی مار جو میں نے نادر کے ہاتھوں کھائی۔"

"صرف ایک بار مار۔۔۔" آذر نے سوچا۔۔۔ اور یہ سب کچھ اس نے بہت دیر سے سوچا۔

"کس کے لیے کھائی مار۔۔۔ جبکہ میں اس کی ایک پائی کی بھی محتاج نہیں تھی۔ اس کے جوتے کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھی میں۔ میں تمہارے لیے اس کی مار بھی کھالیتی آذر! اگر وہ تمہارا ذہنی سکون نہ چھین رہا ہوتا تو۔ میں کھاتی رہتی وہ مار بھی۔۔۔"

آذر کو فریال کی بات یاد آئی۔ آذر نے نم آنکھوں سے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی خوب صورت اور پرسکون نظر آرہی تھی۔ مگر اس کی ماں وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہوچکی تھی۔

"ہائے۔۔۔ ہائے!" وہ سات سال کا تھا' جب فریال

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ پگلی سی دیوانی سی	-/600 روپے
آرزو نکھر آئی	-/500 روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	-/400 روپے

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/45 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

نادر کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد اس کے ساتھ سوتے ہوئے کراہ رہی تھی۔

"ہائے نی ماں۔۔۔!" وہ بڑبڑاتی رہتی۔ ساری رات کراہتی رہتی۔

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لاؤنج میں چلتی فلم کی چنگھاڑتی آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔

"آذر! آنٹی کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔" ثانیہ کی آواز۔ "صرف ایک بار مل لو ان سے۔"

"جس دن تمہاری اصل نادر سے ملاقات ہوگی، اس دن تم دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روؤ گے۔" گوگی کی آواز۔

"کاش! تم ایک بار اپنی ماں کو ماں کی نظر سے دیکھ لو۔۔۔ اپنی ماں کو گالی دے دو آذر! ان نظروں سے مت دیکھو۔" فریال کی آواز۔

مگر اس نے دیکھا۔

آگہی عذاب ہے، اس صورت میں اگر اسے دیر سے جانا جائے۔

وہ بمشکل خود کو قابو میں رکھ کر کھڑا ہوا۔

"امریکن جیل میں فون کر کے میں نے معلوم کیا تھا نادر کا۔۔۔ چاہو تو تم بھی۔" اس کے کھڑے ہوتے ہی وہ "فوراً" بولی۔

آذر نے ایک زخمی سی نظر اس پر ڈالی اور وہ خاموش ہو گئی۔

ان کے گھر سے نکل کر وہ بمشکل کچھ دور تک چل سکا۔

سڑک روشن، لیکن سنسان تھی اور وہ کھل کر رو سکتا تھا۔ دیواریں نہیں تھیں جن سے وہ لپٹتا ہاں پچھتاوا ضرور تھا۔

"ثانی۔۔۔!" کچھ دیر بعد اس نے ثانیہ کو فون کیا۔ "ماں کا نمبر ہے تمہارے پاس؟ مجھے سینڈ کرو۔" کچھ دیر بعد وہ کچھ اور کرنے کے قابل ہو سکا۔

فریال کے فون پر بیل جا رہی تھی۔

"ماما۔۔۔!" کال ریسیو ہوتے ہی وہ بولنے لگا۔

"اب کون سا حساب کتاب لینے کے لیے فون کیا ہے تم نے؟" نعمان کی کرخت آواز اسے سنائی دی۔ "آئی سی یو میں ہے وہ۔۔۔"

✲ ✲ ✲

فریال کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ آئی سی یو میں تھی نعمان نے ایک شکایتی نظر اس پر ڈالی اور بنا بات کیے ایک طرف ہو گیا۔ آذر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زمین میں زندہ ہی گڑ جائے۔ اس نے کتنے رشتوں کو زندہ گاڑ دیا تھا۔ گوگی آنٹی، ان کے شوہر حتیٰ کہ ان کے بچے تک اسپتال میں تھے۔ وہ سب اس کی ماں کے لیے پریشان اور فکر مند تھے۔ اتنے سارے لوگ اس کی ماں سے پیار کرتے تھے۔ ایک وہ ہی نہیں کر سکا۔

اولاد کے نام پر تنہا زندگی کیسے گزاری جاتی ہے اس ہجر کی تصویر بنی فریال اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔

آذر نے جرمنی فون کر کے ثانی اور نمل کو آنے کے لیے کہہ دیا۔

دو دن بعد جب فریال نے ہوش میں آکر دیکھنا شروع کیا تو اسے آذر اپنا ہاتھ چومتا نظر آیا۔ وہ بار بار اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔

"ماما!" وہ محبت سے پکار رہا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ آذر سے لپٹ جائے گی، مگر آذر اس سے لپٹ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کا ماتھا چومے گی اور آذر اس کا ماتھا چوم رہا تھا۔ سوچ کی تعبیر الٹ ہوئی، مگر بہت خوب ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں، مائیں معاف کر ہی دیتی ہیں۔ انہیں معاف کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں جو وہ اپنی اولاد سے کرتی ہیں۔ ماں وہ تختی ہے جس پر اولاد کچھ بھی لکھ سکتی ہے، مگر ماں صرف "محبت" لکھتی ہے۔

✲

تسنیم شریف

ایسا بھی ہوتا ہے

"بھابھی! حرا گھر پر ہے؟" حرا نے حنا کی آواز سنی تو چونک اٹھی۔

"الٰہی خیر! یہ آج الٹی گنگا کیسے بہہ نکلی۔ حنا میرے بارے میں پوچھے اور وہ بھی میرے گھر آکر۔۔۔" ابھی حرا حیرت کے سمندر میں غوطہ لگا ہی رہی تھی کہ حنا اس کے کمرے میں آن ٹپکی۔ اس کی اڑی اڑی رنگت اور چہرے پر بارہ بجتے دیکھ کر حرا کے حواس بھی جواب دینے کی تیاری کرنے لگے۔

"کہیں ہمارا رزلٹ تو نہیں آگیا۔۔۔ مگر پیپر دیے ہوئے ابھی صرف دو ہی مہینے تو گزرے ہیں۔۔۔ اتنی جلدی رزلٹ کیسے آسکتا ہے۔" اس نے ایک ہی لمحے میں اتنی لمبی چوڑی سوچ بچار کی اور اس سے پہلے کہ اس کی سوچ کا یہ سلسلہ مزید دراز ہوتا، حنا بول پڑی۔

"حرا! مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

"مدد اور وہ بھی میری۔۔۔؟" حرا کے لہجے میں بجا طور پر تمام جہاں کی حیرت سمٹ آئی۔

"ہاں۔۔۔ تمہاری مدد کی۔ تمہیں پتا ہے امی نے میری شادی کی ڈیٹ فکس کر دی ہے اور اگلے ماہ کی چار تاریخ کو میری شادی ہے۔"

"لعنت ہو۔" حرا جھلائی۔ "سارے سین کا ستیاناس کر دیا۔ نالائق! شادی ہے تو اس میں اتنا روتا ہوا چہرہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ غضب خدا کا، میں سمجھی ہمارا رزلٹ آگیا۔ صاف صاف نہیں کہہ سکتیں کہ پارلر چلنا ہے، نئے نئے کپڑے خریدنے ہیں۔"

"ارے بھاڑ میں گیا پارلر اور جہنم میں گئے کپڑے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مصیبت سر پر آن پڑی ہے اور تمہیں کپڑوں کی سوجھی ہے۔"

"کیسی مصیبت' صاف صاف کہو۔" حرا کے لہجے میں تشویش در آئی تو حنا کو سخت ٹینشن کے باوجود ہنسی آگئی۔

"بدھو ہو تم تو... دیکھو میری امی نے شادی کی تاریخ اتنی قریب کی رکھ دی ہے اور تم تو جانتی ہو شادی کے گھر میں کتنا کام پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اب امی بے چاری اکیلی کیا کیا کریں۔ انہوں نے تو روز روز بازار کے چکر لگانا شروع کر دیے ہیں اور تم تو جانتی ہو کہ مجھے تو کھانا پکانے کی الف' ب بھی نہیں معلوم' اب چونکہ تم اس فن میں طاق ہو تو سوچا کیوں نہ تم سے کھانے بنانا سیکھ لوں۔"

حرا منہ پھاڑے حنا کی یہ نان اسٹاپ تقریر سن رہی تھی کہ حنا نے اچانک بولتے بولتے حرا کے گال پر ایک چپت رسید کی اور حرا کا منہ آپوں آپ بند ہو گیا۔

"سن بھی رہی ہو یا میں یونہی بکواس کیے جا رہی ہوں؟"

حرا نے فوراً" عالمانہ انداز میں سر کو اثبات میں ہلایا۔ حالانکہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دے کہ "بی بی! آپ نے سچ کہا آپ واقعی بکواس فرما رہی ہیں۔" مگر بے چاری کہہ نہ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ابھی انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں اور حرا کو گریجویشن کرنے تک حنا کی مدد کی ضرورت تھی۔

"تم کیا پکانا سیکھنا چاہتی ہو۔" حرا نے لہجے کو مدبرانہ بنانے کی کوشش کی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے خود بھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔

"سب کچھ... وہ سب کچھ جو تم کالج میں ہمارے لیے پکا پکا کر لاتی تھیں' پزا' بریانی' شامی کباب' گاجر کا حلوہ۔"

حنا نے چٹخارے لے کر فرمائشیں گنوائیں تو حرا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ یہ تو سچ تھا کہ اس نے اپنے گھر کی بنائی ہوئی' بہت ساری چیزیں اپنے دوستوں کو کھلائی تھیں اور ڈینگیں یہ ماری تھیں کہ وہ سب چیزیں خود اس نے بنائی ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ سب کچھ اس کی بھابھی نے بنایا ہوتا تھا۔ اسے تو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ گاجر کے حلوے میں گاجر کے علاوہ اور کیا ڈالا جاتا ہے۔

"اتنی ساری چیزیں سیکھ کے کیا کرو گی؟ اور ویسے بھی نئی دلہن سے کون پکواتا ہے۔" حرا نے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر حنا تو گویا آج تہیہ کر کے آئی تھی' جھٹ سے بولی۔

"آج کل کی نئی دلہن کتنے دن نئی رہتی ہے۔ ہفتہ بھر بعد ہی اس بے چاری کو باورچی خانے میں جھونک دیا جاتا ہے اور تمہیں کیا پتا۔ امی نے میرے سسرال والوں کے سامنے میری کیسی کیسی تعریفیں کی ہیں اب اگر انہیں یہ پتا چلے گا مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا تو ذرا سوچو امی کی ان سب لوگوں کے سامنے کیسی سبکی ہوگی۔"

اور حرا نے فوراً" سوچنا شروع کر دیا "تو یہ سارا قصور شیخی بگھارنے کا ہے۔ اگر حنا کی امی اس کے سسرال والوں کے سامنے جھوٹی تعریفیں کر کے اپنی بیٹی کے نمبر نہ بڑھاتیں اور نہ میں بھابھی کی پکائی ہوئی چیزوں کو اپنے نام سے منسوب کرتی تو یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔"

"یہ سارا قصور تمہاری امی کا ہے۔ انہیں کیا ضرورت تھی تمہارے بارے میں جھوٹ بولنے کی؟" حرا نے فوراً" ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

"اچھا اب سچ کی فضیلت اور جھوٹ کی مصیبت پر فلسفہ نہ بگھارنے بیٹھ جانا۔" حنا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

"تمہیں نہیں معلوم آج کل لڑکیوں کی شادی کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ ماں باپ کو نجانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ میری امی نے تو محض ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا ہے۔ بس! تم مجھے یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے تم مجھے کیا پکانا سکھاؤ گی۔"

حنا کی یہ بات سن کر حرا سوچ میں پڑ گئی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ پہلے وہ خود بھابھی سے بنانا سیکھے اور پھر حنا کو سکھائے مگر اس سارے مسئلے میں قباحت یہ تھی کہ صبح ہی اس کی بھابھی سے ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی اور دونوں کی بات چیت فی الحال منقطع تھی۔ اگر بندش کا یہ سلسلہ حرا کی جانب سے ہوتا تو وہ انا وغیرہ پر تین حرف بھیج کر بھابھی سے دوستی کر لیتی مگر مسئلے کا دردناک پہلو یہ تھا کہ اس دفعہ بات چیت بھابھی نے بند کی تھی اور حرا کی خودداری اور انا فی الحال کافی بلند تھی۔ حرا نے یہ ساری باتیں سوچیں مگر حنا پر ظاہر یہ کیا جیسے کھانے کے متعلق سوچ رہی ہو۔

"ایسا کرتی ہوں' تمہیں سب سے پہلے آسان سی چیز بنانا سکھاتی ہوں۔ ایسا کرو' فٹافٹ ایک دیسی انڈا لے کر آؤ۔ میں تمہیں سب سے پہلے انڈا ابالنا سکھاتی ہوں۔"

"مگر ہمارے گھر تو فارمی انڈے آتے ہیں۔" حنا منمنائی۔

"فارمی؟" حرا نے ناک بھوں چڑھائی۔ "چلو وہی لے آؤ مگر دو لے کر آنا۔"

حرا کی یہ بات سن کر وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی اور حرا نے ایک دیگچی پانی سے بھر کر چولہے پر رکھ دی۔

"اب میں ایسی بھی نالائق نہیں ہوں۔ انڈا تو ابال ہی لوں گی۔" اس نے بارہا بھابھی کو انڈا ابالتے دیکھا تھا۔ اگرچہ سرسری نگاہوں سے دیکھا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ وہ یہ کام آسانی سے کر لے گی۔

حنا کا گھر پڑوس میں ہی تھا' وہ فوراً" دو انڈوں سمیت کسی جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ اور حرا نے دونوں انڈے احتیاط سے دیگچی میں ڈال دیے اور چولہے کی آگ دھیمی کر دی۔ دس منٹ گزرے... بیس منٹ گزرے مگر پانی تو گویا وقت کی طرح ٹھہر گیا تھا۔ ابلنا تو درکنار اس میں فی الوقت کسی بھی طرح کے بلبلے بھی بننا شروع نہیں ہوئے تھے۔ حنا پرجوش نگاہوں سے اور حرا تشویش کی نگاہوں سے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

"آخر یہ ابلنا کیوں شروع نہیں ہو رہے؟" حرا جواب دینے کا سوچ ہی رہی تھی' کہ بھابھی کی کچن میں آمد ہوئی اور دونوں کا انہماک ٹوٹ گیا۔

"بھئی آنچ تیز کرو... یوں موم بتیوں میں پکاؤ گی تو پکا چکیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولیں تو حرا نے خاموشی سے چولہے کی آگ بڑھا دی مگر سچ تو یہ ہے کہ بھابھی کے انداز نے اس کے وجود کو بھی دہکا دیا تھا۔

پانی تھوڑی ہی دیر میں ابلنے لگا اب چونکہ حرا نے دیگچی لبالب بھر رکھی تھی' لہٰذا وہ ابل ابل کر نیچے گرنے لگا تو حرا گھبرا اٹھی۔

بھابھی جب انڈے ابالتی ہیں تو پانی یوں تو نہیں گرتا... یہ کیا ہوا۔

پانی کی چھن چھن کرتی آواز نے اسے مزید بدحواس کیا اور اس نے گھبرا کر چولہا بند کر دیا۔ چولہے کا بٹن گرم پانی گرنے کے باعث خود بھی گرم ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے چھونے کے باعث اس کے ہاتھ پر ایک ننھا سا پھپھولا بن گیا۔ یہ دیکھ کر حنا گھبرا گئی۔

"اچھا حرا! میں پھر آؤں گی شاید امی بازار سے آگئی ہیں۔" وہ تو یہ کہہ کر چلتی بنی اور حرا پھونکیں مار مار کر ہاتھ کی جلن کم کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد حرا' اس کے گھر گئی تو اس نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی نوٹس مانگنے اس کے گھر جاتی تو بے زاری اس کے چہرے پر صاف لکھی نظر آتی تھی۔

"آج تم مجھے کیا بنانا سکھاؤ گی؟" حنا نے بڑی امید سے پوچھا۔

"آج میں تمہیں لیموں کا شربت بنانا سکھاؤں گی اس دن تو بھابھی نے آکر سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ اب ہم باقی کی کوکنگ تمہارے گھر پر کریں گے ٹھیک...؟"

حنا نے حرا کی بات سن کر سر ہلایا اور حرا کی ہدایتیں شروع ہو گئیں۔

"ایسا کرو ایک جگ پانی لو۔ اب اس میں چار کپ چینی اور دو کھانے کے چمچے نمک ملا دو... اب اس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

چار لیموں نچوڑو۔۔۔ اب برف بھی ملا دو۔ گڈ! شربت تیار ہو گیا ہے۔"

حرا نے ہدایات کے مطابق من و عن حنا کو کام کرتے دیکھا تو خوش ہو کر بولی۔

"لاؤ! اب ایک گلاس شربت مجھے بھی دو۔"

مگر پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

حنا کے چہرے کے زاویے بھی بگڑ کر رہ گئے تھے مگر حرا کے ڈر کے مارے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حرا نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا۔

"تم نے اصل میں پہلی دفعہ بنایا ہے نا اس لیے ۔۔۔ بناتے بناتے آئے جائے گا۔"

اگلے روز حنا پھر حرا کے کچن میں موجود تھی۔

"آج ہم کیک بنائیں گے۔"

"بنانا آتا ہے؟" حنا نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

"آج ہم اس میں سے پڑھ کر بنائیں گے۔" حرا نے اس کے سامنے کک بک لہرائی۔

"اور ویسے بھی آدمی غلطیوں ہی سے تو سیکھتا ہے۔ تجربے ہی اسے عقل مند بناتے ہیں۔ ہر چیز خود بخود تھوڑا ہی آجاتی ہے۔ ایک دفعہ غلطی ہو گئی تو تم کیا سمجھتی ہو ہمیشہ غلطی ہو گی۔ چلو شاباش یہ سارا سامان منگوالو۔"

حرا نے ترکیب کے مطابق فہرست اس کے سامنے رکھی تو حنا نے بادل نخواستہ سارا سامان منگوالیا' حرا نے احتیاط سے پڑھ پڑھ کر ہر چیز اس کے وزن اور ناپ تول کے مطابق گھی اور میدہ تیار کرکے سانچے میں ڈال کر حنا کو تھمایا۔

"لو اسے اوون میں رکھ دو۔" حنا متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تو حرا جھلا اٹھی۔

"یہ ہونقوں کی طرح لے کر کیوں کھڑی ہو' جاؤ ۔۔۔ اوون میں رکھو۔"

"لیکن تمہارے کچن میں اوون کہاں ہے' مجھے تو نظر نہیں آرہا۔" حنا نے بے بسی سے اپنی مشکل بیان کی تو حرا کو یاد آیا کہ اس کے گھر میں تو اوون ہے ہی نہیں۔"

"اوہ! ہمارے گھر میں تو اوون ہی نہیں۔" اب حنا کی شکل دیکھنے والی تھی۔

"نالائق! اوون نہیں تھا تو کیک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تو مجھے کیا پتا تھا کہ کیک اوون میں بنتا ہے۔"

"کیوں تم نے ترکیب نہیں پڑھی تھی؟"

"تو وہ تو میں اسٹیپ بائی اسٹیپ پڑھ رہی تھی اب سب سے آخر میں لکھا ہے کہ اسے اوون میں رکھو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ پہلے تمہیں پوری ترکیب پڑھنی چاہیے تھی۔ میرے اتنے سارے پیسے ضائع کروا دیے۔" حنا غصے سے بولی اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور حرا افسوس سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" وہ بڑبڑائی۔

ایک ہفتے بعد حرا نے پھر حنا کو بلا بھیجا۔ اس کا خیال تھا کہ حنا کا غصہ اب تک ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔

"آج لیموں کا اچار بنائیں؟" حنا جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"سچ! آج کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ میں نے پہلے سے پوری ترکیب پڑھ لی ہے۔" حرا نے پھر کک بک اس کے سامنے لہرائی۔

"حرا! تم کتنی بار کہہ چکی ہو کہ آدمی غلطی سے سیکھتا ہے۔ میں بھی غلطی کر رہی تھی مگر اب سمجھ گئی ہوں کہ تمہاری دوستی جی کا جنجال ہے۔ میں نے سب کچھ امی سے سیکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑ گئی اور دروازے تک پہنچ کر گویا اسے کچھ یاد آیا تو پلٹ کر حرا سے بولی۔

"تم چاہو تو تم بھی آسکتی ہو۔"

حرا پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ کچھ بول ہی نہ سکی صرف سر ہلا کے رہ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

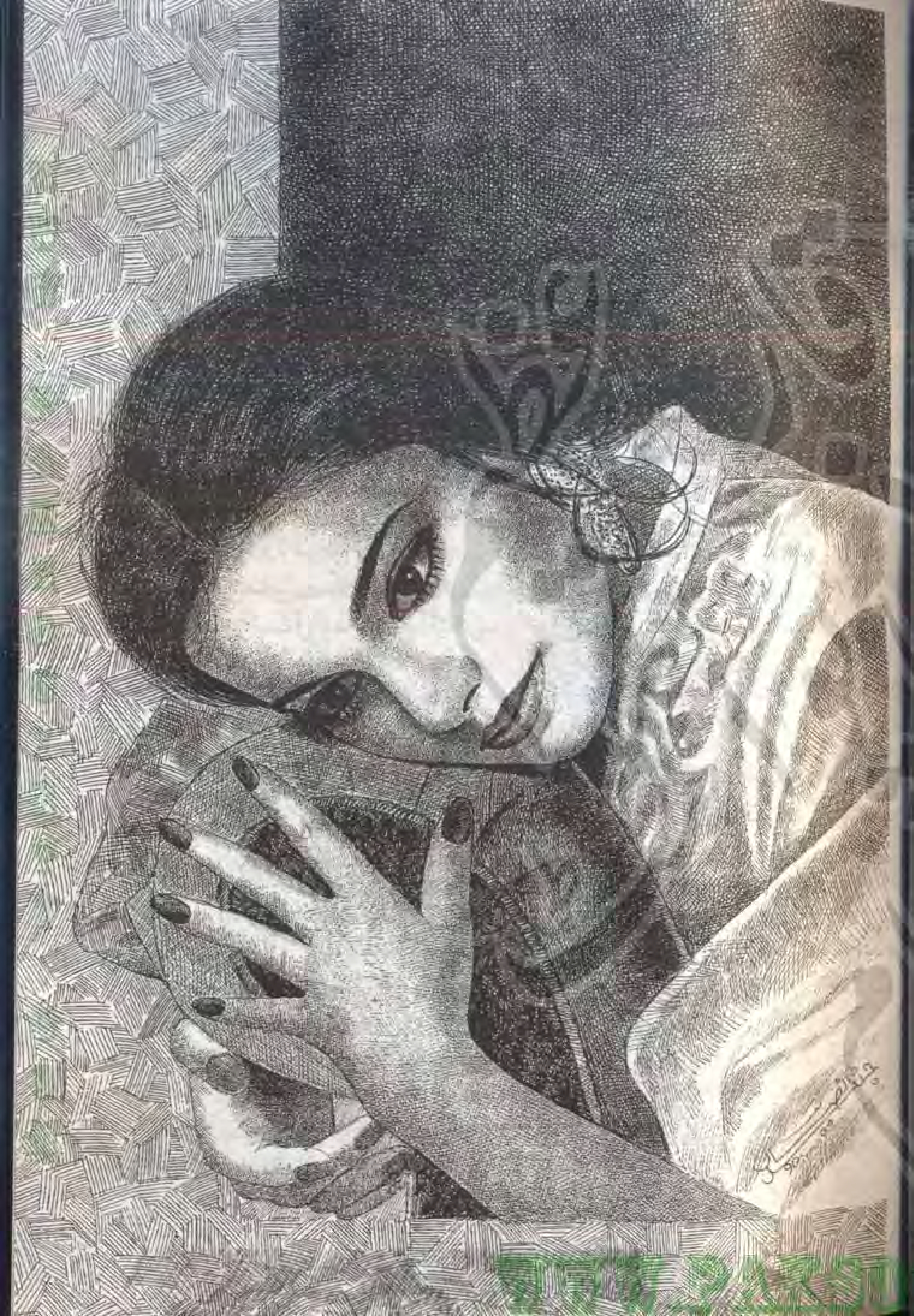

نعیمہ ناز سلطان

رائیگی کی کہانی

"اف یار کم بخت۔۔۔"

ابو اور بھائی کے منہ سے بیک وقت محکمہ بجلی کی شان میں گستاخانہ کلمات نکلے، ڈھائی گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے بعد بجلی آئے ہوئے ابھی بمشکل دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے اور محترمہ پھر غائب ہو گئیں۔

امی نے ایک آہ بھری اور سلائی مشین ایک طرف کھسکا دی۔ اگرچہ مشین چلنے کے لیے بجلی کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ہاتھ کی مشین تھی مگر سلائی کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور بمشکل ساٹھ گز لمبائی اور چالیس گز چوڑائی کے اس گھر میں قدرتی روشنی اور ہوا کا گزر بہت کم کم ہی تھا، ہاں ایک صورت تھی کہ ان کا مسئلہ حل ہو جاتا کہ اگر وہ بالائی منزل کے اس کمرے کی واحد کھڑکی پر پڑا موٹا سا پردہ ہٹا دیتیں، جو اس پر لگا ہوا تھا تو پچھلی سڑک کی جانب کھلنے والی اس کھڑکی کے ذریعے دھوپ، روشنی اور ہوا کا گزر ٹھیک ٹھاک ممکن تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ شوہر اور بڑے بیٹے کی موجودگی میں وہ اس پردے کو سرکانے کی جرأت کر سکتیں۔

دونوں باپ بیٹوں کو یہ بات سخت ناپسند تھی کیونکہ سڑک پار میدان میں بیچوں بیچ تین رہائشی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ میں سے ایک اسکول تھا۔ باپ بیٹے کی

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک منطق تھی کہ اگر ان عمارتوں کی بالائی منزلوں پر کوئی کھڑا ہو کر ادھر دیکھے تو اندرونی منظر صاف نظر آئے گا اور ویسے بھی ان کے خیال میں کھڑکیوں میں لڑکیوں کو کھڑے ہونے کی عادت نہیں ہونی چاہیے۔

"بڑی آوارگی ہے یہ عادت۔" ابو اکثر و بیشتر بیٹیوں اور بیوی کو یاددہانی کرواتے رہتے تھے۔

"جب ان بلڈنگز میں کھڑا کوئی بھی فرد ہمیں واضح نظر نہیں آتا تو ہم یہاں کھڑے یا بیٹھے کسی کو کیسے نظر آئیں گے۔" ثانیہ بہنوں کے درمیان بیٹھی اعتراض کرتی۔

"ہو سکتا ہے ابو اور بھائی کا خیال ہو کہ ان کی حسین و جمیل بیٹیوں کو گھور گھور کر کوئی نظر نہ لگا دے۔"

فروا انتہائی کڑوا منہ بنا کر اپنے جی کی بھڑاس نکالتی اس کا موڈ ویسے تو تقریباً ہر وقت ہی خراب رہتا تھا مگر دن میں دوبار اس وقت تو ضرور ہی خراب ہوتا تھا جب خوب اچھی طرح صابن سے رگڑ رگڑ کر منہ دھونے کے بعد رنگ گورا کرنے کی ایک کریم لگا کر آئینہ اس امید سے دیکھتی کہ شاید آج کچھ فرق پڑا ہو مگر یہ آئینے بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ اس کی رنگت کی سیاہی اور عام سے نقوش بغیر کسی تبدیلی کے دکھا دیتے، اس کی تلخیاں کچھ اور بڑھ جاتیں، ہر گزرتا دن اندر کی کڑواہٹ میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔

"کیا پتا کوئی دوربین لگا کر یہاں کا یا ہمارا نظارہ کر لے۔" سائرہ دور کی کوڑی لے کر آتی۔

"ایک بار دوربین لگا کر نظارہ کر لیا تو آئندہ دیکھنا تو درکنار وہاں کوئی کھڑا بھی نہیں ہوگا، کالی پیلی، سڑی بسی شکلوں سے کسے دلچسپی ہوگی۔" فروا کا لہجہ نیم ہو جاتا اور باقی بہنوں میں سے اس کی باتوں کو کوئی ہنسی میں اڑا دیتا اور کوئی خاموشی کا زہر چپ چاپ اپنے اندر اتار لیتا۔

"اتنا ہی پردے اور چاردیواری کا خیال ہے تو کھڑکی بند کیوں نہیں کروا دیتے۔"

عمیرہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی گھر بھر میں سب سے زیادہ اسے ہی گرمی ستاتی تھی۔

"کھڑکی کیوں بند کروائیں گے۔ رات کو خود جو سوتے ہیں اس کمرے میں، ہمیں ہوا کی ضرورت نہیں مگر انہیں تو ہے؟" مائرہ کو اور بہنوں کے مقابلے میں باپ اور بڑے بھائی سے زیادہ پرخاش تھی۔ وہ پڑھائی میں اچھی تھی۔ آگے پڑھنے کا شوق تھا۔ کچھ بننے کا عزم تھا مگر میٹرک بہت اچھے نمبروں سے کلیئر کرنے کے بعد اس نے کالج میں داخلے کے لیے کہا تو ابو نے صاف منع کر دیا۔ کچھ ماہ پہلے محلے کی ایک لڑکی جو کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی، اس کو اور اس کے اس فعل پر لعنت ملامت کرنے کے ساتھ کالج اور اس کے ماحول کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

"ہزاروں لڑکیاں پڑھتی ہیں کالج میں، ایک کی غلط حرکت سے ساری لڑکیاں خراب اور پورا کالج بدنام۔" مائرہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ مگر خیر بقول فروا "اگر عظمیٰ کسی کے ساتھ گھر سے نہ بھی بھاگتی، تمہارا کالج میں ایڈمیشن پھر بھی خوش فہمی ہی تھا۔ ہمارے گھر میں اس خواب کی تعبیر کسی نے پائی ہے؟ ابو کسی اور بات کو جواز بنا کر انکار کر دیتے۔"

"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے گھر والے دنیا سے الگ ہی کوئی زندگی جیتے ہیں اور ہمیں بھی ان ہی سانچوں میں فٹ کر رکھا ہے۔" رابعہ ان سب میں سب سے زیادہ حساس تھی، سوچتی بہت زیادہ تھی اور بولتی کم۔

اس کے اندر کی لڑکی نے اپنے ماحول کے حبس اور گھٹن سے سمجھوتا نہیں کیا تھا، ٹی وی اور ڈائجسٹوں کی کہانیوں میں جو خوب صورت لوگوں کی دنیا وہ دیکھتی پڑھتی اور سنتی تھی، اس کے تصورات اور خواب آنکھوں میں سجنے لگے تھے، اگرچہ یہ خواب کوئی بہت انوکھے اور یہ خواہشات لامحدود نہیں تھیں مگر عمیرہ کا کہنا تو یہی تھا کہ جب ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں جانا ہے تو بلاوجہ آزادی اور خوش گمانیوں کے خواب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

"اگر میری آنکھوں سے میرے خواب چھن جائیں تو میں تو مر ہی جاؤں۔" رابعہ دہل کر سوچتی۔

"اللہ جانے اب یہ منحوس ماری کب آئے گی۔" ابو بڑبڑاتے ہوئے اٹھنے لگے۔

"دو چار گھنٹے سے پہلے کیا آئے گی۔" بھائی بھی مایوسی سے بولتا ہوا جیب سے موبائل نکالنے لگا، اچھا خاصا اپنی پسندیدہ مووی دیکھ رہا تھا کیبل پر، کم بخت بجلی کے کھیل نے سارا موڈ غارت کر کے رکھ دیا۔

"چل اٹھ فرحان! ذرا یہ پردہ تو ہٹا دے کھڑکی کا۔ کچھ تو ہوا آئے گی۔" ابو اور فرحان کی موجودگی میں کھڑکی پر سے پردہ ہٹانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا، اس لیے کہ پھر اس کمرے میں صرف وہی دونوں یا زیادہ سے زیادہ امی ہوتی تھیں۔ لڑکیاں سب دوسرے کمرے میں پائی جاتی تھیں۔

فرحان نے اٹھ کر موٹا اور بھاری سا پردہ ہٹا دیا، پورا کمرا روشنی اور ہوا سے بھر گیا۔ اس رخ سے بڑی اچھی ہوا آتی تھی۔ وہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ فرحان نے جیب سے گٹکا نکالا۔ کھول کر منہ میں رکھا اور بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا ہوا باہر چل دیا، امی نے موقع غنیمت جان کر سلائی مشین دوبارہ کھسکالی۔ رابعہ کی قمیص میں تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اتوار تھا، فرحان کی تو خیر فیکٹری کی چھٹی تھی اور شوہر کا کام تو ہفتے کے ساتوں دن کا تھا، وہ برگر کا ٹھیلہ لگاتے تھے۔ چالیس سال ہو گئے تھے یہ کام کرتے ہوئے۔ جب یہ کام شروع کیا تھا تو اس وقت بن کباب کے نام سے بکتے تھے پھر یہ بن کباب "برگر" کے روپ اور نام میں ڈھل گیا، آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی پھر وہ محنتی بھی تھے سو لڑکوں کے بڑے ہونے اور روزگار سے لگنے تک بخوبی گھر کی گاڑی گھسیٹتے رہے۔ یکے بعد دیگرے دس بچوں کی پیدائش میں سات لڑکیاں ہونے پر بھی دونوں میاں بیوی اتنا نہیں گھبرائے اور بوکھلائے جتنا پچھلے چند سالوں میں مہنگائی کے ہاتھوں عاجز آ گئے تھے۔

فرحان فیکٹری میں لگا تو انہوں نے کچھ سکون کا سانس لیا، چار پیسے کا سہارا تو مزید ہوا فرحان نے تو خیر انہیں اتنا مایوس نہیں کیا مگر اس سے چھوٹے عدنان کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔

چھٹی ساتویں جماعت تک تو وہ ٹھیک رہا پھر اس کے بعد بتدریج اس کے مزاج میں گرمی اور تیزی آتی چلی گئی، محلے سے اسکول کے بچوں کے ساتھ روز کا لڑائی جھگڑا، مار کٹائی، گالم گلوچ، آئے دن کی شکایتیں۔ کئی بار انہوں نے تنگ آ کر بے تحاشا اسے پیٹا، مگر مار کھا کھا کر وہ اور ڈھیٹ ہو گیا، اسکول سے خیر اس نے خود ہی قطع تعلق کر لیا تھا، محلے اور علاقے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا، جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا اور بھی سرکش اور بدتمیز۔ بری صحبت رنگ لائی، ایک روز موبائل چھینتے ہوئے پکڑا گیا، باپ کو تھانے بلایا گیا۔ پولیس نے رہائی کے بدلے کچھ نذرانہ مانگا تھا۔

"اس کو جیل میں ڈال دو، اچھا ہے، عقل ٹھکانے آجائے گی۔" باپ نے ٹکڑا توڑ جواب دیا اور گھر واپس آگیا۔

پولیس والوں نے چھ ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ وہاں عقل تو کیا ٹھکانے آتی اور دماغ کیا ٹھیک ہوتا اور نئے گر اور ہتھکنڈے سیکھ لیے جو اب تک باہر کی دنیا میں بھی نہیں سیکھے تھے۔ مستزاد یہ کہ چرس پینے کی لت بھی لگا لی، سگریٹ پہلے بھی پیتا تھا مگر خالی، جیل آیا تو بھری ہوئی سگریٹ کے مزے بھی سیکھ لیے۔ جیل سے چھوٹ کر آیا اور یہ نئی سوغات ساتھ لایا۔ باپ کو پتا چلا تو پہلے اپنا سر پیٹ کر پھر بیٹے کو پیٹ کر رہ گیا۔

ماں سوائے آنسو بہانے اور پریشان ہونے کے اور کیا کرتی، بیٹے کی عادت بد چھڑانے کی تگ و دو میں لگی، کسی نے ایک اسپتال کا بتایا جہاں نشے کے عادی افراد کا علاج کیا جاتا تھا، ماں نے پیار محبت سے سمجھایا،

WWW.PAKSOCIETY.COM

مگر وہ کسی طور وہاں جانے پر راضی نہ ہوا پھر ماں نے روایتی حربہ استعمال کیا اور اپنا دوپٹا بیٹے کے قدموں میں ڈال دیا' بیٹا اک دم بوکھلا گیا۔
"کیا کر رہی ہو امی!" شرمندہ چہرہ لیے اس نے دوپٹا اٹھا کر ماں کے سر پر ڈالا۔
"تیری بھلائی اور بہتری چاہتی ہوں بیٹے! کون ماں چاہے گی کہ اس کا بیٹا زہر پینے کی عادت ڈال لے۔"
باپ کا گرجنا برسنا اور مار پیٹ تو ایک طرف رہ گئی ماں کی منت سماجت' رنگ لے آئی۔ وہ نشہ چھوڑنے اور اپنا علاج کروانے پر راضی ہو گیا۔
اسپتال میں خلاف توقع اس نے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا' ڈاکٹروں سے تعاون' ہر دوا' پرہیز اور ہدایت پر عمل' ماں خوش ہو گئی' باپ کچھ مطمئن اور باقی گھر والوں نے سکون کا سانس لیا' وہ صحت یاب ہو کر گھر آیا تو اس کایا پلٹ کی وجہ بھی ماں کو بتا دی۔
اسپتال میں ایک لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے نشئی باپ کے علاج کے لیے وہاں موجود تھی' دن بھر وہیں رہتی۔ شام ڈھلے گھر چلی جاتی' بھائی ایک ہی تھا' شادی شدہ' بیوی بچوں میں مگن' سالوں سے بھولے بیٹھا تھا کہ اس کی چار بہنیں اور ایک نشے باز باپ بھی ہے' سو اب بیٹے کی ذمہ داریاں بھی بیٹیاں سنبھال رہی تھیں۔ تین بہنیں کسی فیکٹری میں نوکری کرتی تھیں یہ سب سے چھوٹی تھی مدیحہ' گھر اور باپ کو سنبھالتی تھی' بمشکل اٹھارہ سال کی ہوئی تھی۔
چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں نہیں تھیں مگر خود کو سنوارنے اور خوب صورت دکھائی دینے کے فن میں طاق تھی' اسپتال میں باپ کے برابر والے بیڈ پر لیٹے عدنان میں اپنے پسندیدہ ہیرو کی بے پناہ شباہت دیکھی تو وہیں دل دے بیٹھی' نظریں ملیں' دل ملے پھر ایک دوسرے کے موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہو گیا۔ محبت کی قسمیں کھاتے ہوئے اس نئے نشے میں چور عدنان نے اس کی فرمائش پر دل و جان سے عہد بھی کیا اور وعدہ بھی کہ تمام بری حرکتیں چھوڑ کر ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارے گا۔

"ہماری منگنی کر دو ماں! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" گھر آ کر ماں سے سب سے پہلی فرمائش اس نے یہی کی۔
"کوئی کام دھندا تو کر بیٹے! میں تیری منگنی بھی کروں گی اور دھوم دھام سے شادی بھی۔ تو فکر مت کر۔" ماں نے چمکارا' وہ تو یہ دیکھ دیکھ کر ہی نہال ہو رہی تھی کہ صبح کا بھولا شام ڈھلے گھر لوٹ رہا تھا۔
باپ اگلے روز سو کر اٹھا۔ اپنے معمول کے مطابق ٹھیلا لگانے کی تیاری کرے تو حیران رہ گیا' ٹھیلا لگ چکا تھا اور بالکل تیار تھا اور عدنان بھی۔
"ابے کیا کر رہا ہے یہ؟ کہاں لے جا رہا ہے اسے"
"ابو! تم گھر پر آرام کرو' آج ٹھیلا میں لے جا رہا ہوں۔" زندگی میں شاید پہلی بار عدنان نے اتنے تمیز دار لہجے میں انہیں مخاطب کیا تھا' وہ حیران پریشان کھڑے کے کھڑے رہ گئے' عدنان ٹھیلا لے کر چل دیا۔
"کوئی مجھے بتائے گا' یہ معاملہ کیا ہے؟" انہوں نے مشکوک نظروں سے بیوی کو گھورا جو ان کے لیے چائے نکال رہی تھیں۔
"ناشتا کر لو پہلے' پھر آرام سے بتا دوں گی۔" انہوں نے شوہر سے نظریں چرائیں' ابھی ایک نئے طوفان کا سامنا کرنا تھا انہیں۔
"لے کر لیا ناشتا' اب بتا' کیا بات ہے؟" انہوں نے دو چار گھونٹوں میں چائے کا پیالہ خالی کر کے بیوی کے آگے رکھا۔ لڑکیاں اردگرد اپنے اپنے کاموں میں یوں مشغول تھیں جیسے نہ ان کے پاس آنکھیں ہوں نہ کان' انجان' بے نیاز۔
ماں نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی' پھر اپنی دانست میں مناسب اور مختصر لفظوں میں عدنان کا معاملہ یوں بیان کیا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔
"ہوں' لونڈیا کا معاملہ ہے۔ جب ہی تو میں کہوں شیطان سے فرشتہ کیسے بن گیا۔" خلاف توقع ان کا ردعمل ایسا گھن گرج والا نہیں تھا' جس میں طوفان کے آثار پائے جاتے ہوں۔
"سالے کو گھر میں بیٹھی بہنیں نظر نہیں آ رہیں جو عشق و عاشقی کے چکر میں پڑ گیا' اوپر سے منگنی کی فرمائش' کل کو کہے گا کہ ابھی شادی کر دو' کہاں رکھے گا اسے' اپنے سر پہ؟ کھلائے گا کیا' خاک دھول؟" وہ بیوی سے سوال کر رہے تھے جن کا جواب شاید بیٹے کے پاس بھی نہ تھا۔
"اب جو ہو گیا وہ ہو گیا' آگے کی بتاؤ کیا کرنا ہے۔" بیوی نے شوہر نامدار کا مزاج کچھ بہتر پایا تو آگے بات کرنے کی جرأت کی۔
"میں کیا بتاؤں عورت! تو خود دیکھ لے' پانچ پہاڑ ابھی سامنے کھڑے ہیں' انہیں کون سرکائے گا؟ چھوٹے کی شادی کرے گی تو بڑا کیا چپ بیٹھ جائے گا وہ شور نہیں مچائے گا کہ میری بھی کرو۔" غصہ کرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے۔
"اس کی بھی کر دیں گے۔" وہ سادگی سے بولیں۔
"واہ' واہ بھئی واہ' دونوں بیٹوں کی شادی کر دے اور ہاتھ پاؤں کٹوا لے اپنے۔ وہ کالے سر والیاں آئیں گی اور ان دونوں کو لے کر چلتی بنیں گی تو بیٹھی اپنا سر پیٹتی رہنا' شادی کرنے کے لیے یہ مخلوق تجھے نظر نہیں آ رہی؟" انہوں نے بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو یوں گھورا جیسے ابھی ابھی کچا چبا جائیں گے۔
"یہ تو نصیب کے کھیل ہیں' کوئی مناسب رشتہ ہو تو ان کی بھی کر دیں گے۔ دو لڑکیوں کی بھی آخر شادی کی ہے۔ انہیں بھی کوئی بٹھا کر تھوڑی رکھیں گے۔" امی نے رسان سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔
"رشتہ تو رشتہ ہوتا ہے۔ مناسب' غیر مناسب کیا ہے' ایک ایک کر کے جلدی جلدی جان چھڑا اپنی۔ پتا نہیں کون سے شہزادوں کے سپنے دیکھ رہی ہے اپنی لڑکیوں کے لیے۔" عدنان کا معاملہ ایک طرف رکھ کر وہ نئے قضیے میں الجھ گئے۔
"ایسے کیسے کسی کے ہاتھ پکڑا دوں' کوئی رشتہ ہو تو کروں۔" امی نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور دھونا شروع کر دیے۔ مختصر سا کچن تھا جو بقول لڑکیوں کے راستے میں بنا ہوا تھا' یہاں پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں تھا۔ نل کے نیچے خالی بالٹی رکھ کر برتن دھوتی جاتیں' بالٹی بھر جاتی تو کوئی بھی لڑکی یا لڑکا اسے نیچے باتھ روم میں ڈال آتا۔
"شمسہ بوا نے جو رشتہ بتایا تھا۔ اس پر بھی تو نے کوئی توجہ نہیں دی۔" انہوں نے اپنی تفتیش کا دائرہ اور وسیع کیا۔ اس رشتے کی بات بیوی نے تو انہیں نہیں بتائی تھی' کل رات شمسہ بوا سے اتفاقاً" ٹکراؤ ہو گیا تو وہی بات نکال بیٹھی تھیں۔
"کچھ خدا کا خوف کرو' وہ دو بچوں کا باپ' پینتیس چالیس سال عمر بتا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے' زیادہ کا ہی ہو' فروا کے لیے کہہ رہی تھیں' ابھی تو وہ مشکل سے انیسویں سال میں لگی ہے' ایسے کیسے آنکھیں بند کر کے بیاہ دوں۔"
"رنگ دیکھا ہے اس کا' یہ رشتہ آ گیا غنیمت ہے

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میں عبدالقادر ہوں
ثروت نذیر
قیمت -/225 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور کون ارمان لیے بیٹھا ہے شہزادے کے؟" انھوں نے طنز کے تیر چلائے۔ کمرے میں ڈسٹنگ کرتی فروا کے چہرے کی سیاہی اور گہری ہو گئی جب سگا باپ ہی ایسے باتیں کرے تو غیروں سے کیا امید کریں، اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔

"کالی ہے تو کیا اسے ایسے ہی کنویں میں دھکا دے دیں؟"

وہ کسی معاملے میں تینوں کے آگے نہیں بولتی تھیں مگر بس بیٹیوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں وہ شوہر کے آگے ڈٹ جاتی تھیں۔

"گھر میں سجا کے رکھے گی مہارانیوں کو؟ تیری میری آنکھیں بند ہو گئیں تو رل جائیں گی۔ کون دیکھے گا انہیں، کون فکر کرے گا، جتنی جلدی ہو سکے اپنے سامنے انہیں گھر بار کا کر دیں تو اچھا ہے، اس جھونپڑے میں کہاں تو اچھے رشتوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جو اللہ بھیجے، اسی کے سنگ رخصت کر دے۔" ان کی باتیں شاید معقول تھیں، امی چپ ہو گئیں۔

"مجھے تو ان لڑکیوں کی فکر کھائے جا رہی تھی، یہ کمینہ بدذات بھی بیچ میں کود پڑا۔ اللہ جانے کس کے گھر کا گند خانہ سمیٹ کر لائے گا۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بیٹے کو مغلظات سے نوازنے لگے۔

"یہ کیا کم ہے کہ نشہ چھوڑ دیا۔ یار دوستوں میں اب نہیں بیٹھتا، کام دھندے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اب اس کے اچھے مستقبل کے لیے تھوڑی بہت قربانی ہمیں بھی دینی پڑے گی۔" امی دبے لفظوں میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ہاں، یہ خوب کہی تو نے "قربانی" ہم دیں اس درخت کے لیے اور پھل کوئی اور آ کر کھائے۔" ان کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔ "اپنے لاڈلے سے بول دینا، دھندا کرتا ہے تو اپنے ٹھیلے کا انتظام کر لے، میرے جمے جمائے کام پہ کیوں ہاتھ صاف کر رہا ہے، میں گھر بیٹھ کر کیا اس کی شادی کی تیاریاں کروں گا؟ اپنی روزی روٹی نہ کماؤں؟" انہوں نے اٹھتے ہوئے بیوی کو تنبیہہ کی۔

"اچھا میں کہہ دوں گی۔" انھوں نے ایک گہ... سانس لی۔ "خدا خیر کرے۔" ان کا ممتا بھرا دل اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

مختصر سے کمرے میں دو الماریوں اور ایک سنگل... بعد بس اتنی جگہ بچتی تھی کہ وہ پانچوں اپنی ما... ساتھ بیٹھے بیٹھے اس میں سما جائیں۔ عمیرہ اور ثانیہ کڑھائی کے فریم ہاتھوں میں لیے اپنے جہیز کی چادر... کاڑھنے میں مگن تھیں، میٹرک کرکے ان کی... مصروفیات اور مشاغل بس یہی تھے۔ گھر کے کام کی... اور سلائی کڑھائی بنائی۔ اس فن میں لڑکیوں کو طاق کر... ان کی برادری اور خاندان میں بہت ضروری سمجھا جا... تھا، جب تک لڑکی کے جہیز میں اس کے اپنے ہنر کا کمال نہ ہو، اس گھرانے کو ایویں ہی سمجھا جاتا تھا۔

خاندان اور برادری میں لڑکوں والے بہت سے گھرانے ایسے تھے جہاں ان کی لڑکیوں کی کھپت ہو... تھی۔ لہٰذا امی نے لڑکیوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے... کوشش کی جو ان گھرانوں کی عورتوں کے لیے... ہو۔ تقریباً سب کے خیالات ہی کچھ معاملات میں... یکساں تھے اور رسم و رواج کے معاملے میں سب لکیر... کے فقیر، میٹرک کے بعد حصول تعلیم کو غیر ضروری او... فضول سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو آگے چل کر گھر سنبھا... ہوتا ہے، بچے پالنے ہوتے ہیں۔ گھرداری کا طریقہ او... سلیقہ آنا چاہیے، سلائی کڑھائی بنائی، کھانا پکانا... سب میں طاق ہونا چاہیے۔ زیادہ پڑھ لکھ کر تو لڑکیا... کسی کام کی نہیں رہتیں، یہی سوچ تھی جس... خاندان، برادری کی لڑکیوں پر عموماً طور پر تعلیم کے... دروازے بند کر رکھے تھے۔ جو نکمی تھیں، وہ مشکل... سے آٹھ دس جماعتیں پڑھ کر جان چھوٹنے پر خدا... شکر ادا کرتیں، گھر بیٹھے اپنے جہیز بناتیں اور ا... استعمال کرنے کے سنہری سپنے دیکھتیں جنہیں پڑھنے... شوق تھا، وہ اپنا دل مار کر گھر بیٹھ جاتیں اور قربانی... طرح یہ قربانی بھی صنف نازک کے حصے میں ہی...

ہے۔ باقی رہے لڑکے تو انہیں بھی گھر کے معاشی حالات اور خوفناک مہنگائی کے سبب پڑھائی میں زیادہ وقت ضائع کرنے کے بجائے چھوٹی عمروں میں ہی کسی نہ کسی ہنر کو سکھانے بٹھا دیتے۔ کچھ بڑے ہوتے تو گھر کی گاڑی کھینچنے میں انہیں بھی باپ بھائی کے ساتھ جوت دیا جاتا، سب کے سب کولہو کے بیل کی مانند ایک دائرے میں سفر کر رہے تھے، جہاں سے چلتے وہیں پہنچ جاتے۔

"یہ ابو فروا کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟" رابعہ نے دھیمی آواز میں ماں سے سوال کیا جو ٹانگیں پھیلائے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"وہ جو شمسہ بوا نے رشتہ بتایا تھا، اسی کی بات کر رہے تھے، تمہارے باپ سے جانے کیا تعریفیں کی ہیں بوا نے۔" امی نے پیشانی کو ہاتھ کی ہتھیلی سے مسلا، اتنے مسائل تھے کہ صرف ایک ہی سوچنے بیٹھتیں تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔

"اتنا ہی اچھا رشتہ ہے تو بوا اپنی نواسیوں میں سے کسی ایک کا کیوں نہیں کروا دیتیں، وہ کون سی سفید آٹے کی بوریاں ہیں۔ کالی بھینسیں۔ وہ نظر نہیں آئیں بوا کو؟" رابعہ کا دل حساس تھا پھر بہن سے محبت بھی تھی، جلے دل کے پھپھولے ماں کے سامنے پھوڑنے لگی۔ صبح ابو کے باہر جانے کے بعد فروا کا بلک بلک کر رونا اسے تڑپا گیا تھا۔

"ایسی باتیں کہہ دو تو لڑائی ہے اور برے بھلے جیسے بھی، رشتے تو بتا ہی دیتی ہیں۔ لوگوں کو گھر تک لے آتی ہیں، وہ بھی بغیر کسی غرض اور لالچ کے آخر سمیرا اور تمیرا کا رشتہ بھی تو وہی لائی تھیں، اللہ کا شکر ہے، دونوں اپنے اپنے گھر سمیٹ کر بیٹھی ہیں۔" امی نے اسے سمجھایا۔

"پتا نہیں اللہ نے ہمیں ایسے گھروں میں ایسی شکلوں اور ایسے نصیبوں کے ساتھ کیوں پیدا کیا ہے؟ سانس بھی لو تو گھٹ گھٹ کر۔ خواب بھی دیکھو تو ڈر ڈر کر نہ زندگی میں نہ گھروں میں کوئی ایسا روزن بھی تو نہیں کہ باہر سے ایک ننھی کرن ہی اندر آ سکے۔"

رابعہ جو کچھ سوچتی اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیتی، دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ طریقہ اس نے ان ڈائجسٹوں اور کہانیوں سے سیکھا تھا جنہیں وہ بہت شوق سے پڑھتی تھی، جانے کچھ کہانیوں کا اثر تھا یا حساس طبیعت کہ باقیوں سے کچھ الگ مزاج تھا اس کا جو کچھ کہانیوں میں پڑھتی، فلموں، ڈراموں میں دیکھتی، اسے اپنے گھر، زندگی اور حالات میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی، مایوس ہوتی تو ڈائری اور قلم لے کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت بھی وہ لکھنے بیٹھ گئی کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

"محبت، ایثار، ہمدردی، قربانی، کتنے خوب صورت جذبوں اور احساسات کو گوندھ کر کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ خوب صورت لوگ، حسین مناظر، اعلا انسانی جذبے، عمدہ خیالات، اچھی اچھی باتیں، ان سب کا گزر فقط کہانیوں میں ہی کیوں ہوتا ہے؟ ہماری زندگی میں کیوں نہیں؟

ہماری زندگیاں، محرومیوں سے عبارت ہیں۔ بہترین طور طریقے، ادب آداب اور اخلاقیات کا گزر ہمارے ہاں کم ہی ہے۔ خوب صورتی انسانوں کی ہو یا رویوں کی ڈھونڈنے سے بھی مشکل سے ملتی ہے اور محبت؟ یہ تو شاید وہ نایاب جنس ہے جسے ہم اپنا آپ مول دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتے، ہر رشتہ کسی نہ کسی ضرورت سے بندھا ہے، ہم ایسے کیوں ہیں؟ ایسے ماحول میں کیوں ہیں؟ اللہ نے ہمارے لیے ایسا ماحول، ایسے لوگ اور ایسا گھرانہ کیوں پسند کیا؟ ہم جیسے لوگوں کی کہانی کون لکھے گا؟ جو خود تو کیچڑ میں پڑے ہوئے ہیں مگر چاند کو دیکھ کر اسے پانے کی تمنا کر بیٹھتے ہیں، ہمارا نوحہ کون لکھے گا کہ ہم اپنی ہی سانسوں کے قیدی ہیں، انہیں چھوڑ کر جائیں تو کہاں جائیں؟ کیا کریں؟"

لکھتے لکھتے وہ رک گئی۔ ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ قلم ڈائری کے درمیان ہی رکھ کر ڈائری بند کر دی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"ٹانگیں ہٹاؤ اپنی۔" ثانیہ نے کروٹ لے کر اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹانگیں فروا کے اوپر رکھ دی تھیں۔ وہ بھنا کر اٹھ بیٹھی۔

"ٹھیک سے نہیں لیٹا جاتا تم سے؟ اپنی ٹانگیں اپنے پاس ہی رکھا کرو۔" اس نے فروا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا مصیبت ہے۔" فروا آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔

"یہاں کروٹ لینے کی جگہ نہیں ہے اور تم سوتے میں لوٹ لگاتی رہتی ہو۔"

ثانیہ نے اسے غصے سے گھورا۔ ایک تو گرمی سے ویسے ہی برا حال تھا۔ اوپر سے چھوٹے سے کمرے میں چھ نفوس برابر ایسے لیٹے تھے کہ کروٹ بھی بہت احتیاط سے لینی پڑتی تھی' بازو پورا پھیلاتے تو برابر والے کے منہ پہ پڑتا' چھت کا پنکھا ہوا تقسیم کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا' مگر حبس اور گھٹن کی فضا میں وہ بھی کیا کرتا۔ یہی غنیمت تھا کہ بجلی موجود تھی اور وہ چل رہا تھا۔

عدنان دوسرے روز بھی باپ کا ٹھیلا لے گیا تھا۔ حالانکہ ماں نے باپ کی وارننگ اس تک پہنچادی تھی' تو اس نے ہفتہ دس دن کا کہا تھا کہ وہ اپنے ٹھیلے کا بندوبست کرے گا "جب تک تو یہی لے جاتا ہوں۔" وہ ماں سے بولا تھا' باپ نے سنا مگر جانے کیا سوچ کر خاموش رہے۔ اس دن خلاف توقع عدنان جلدی گھر آگیا تھا۔

"اتنی جلدی کیسے آگیا؟" باپ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"مال ختم ہوگیا تھا' اس لیے آگیا۔"

"ابے' مال بیچ کر آیا ہے یا بانٹ کر؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

"بیچ کر آیا ہوں۔ گرلز کالج کے باہر کھڑا ہوگیا تھا۔ یوں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔" واش بیسن میں ہاتھ منہ دھو کر اب وہ آئینہ دیکھتے ہوئے اپنے بال سنوار رہا تھا۔

"وہاں تو پولیس والے کھڑا نہیں ہونے دیتے' تو کیسے کھڑا ہوگیا؟"

"انہوں نے ہی کھڑا کیا تھا' جس تھانے دار نے جیل میں ڈالا تھا۔ وہ گشت پر تھا' میں نے جا کر سلام کر لیا اور کہا کہ صاحب' یہاں کھڑے ہونے کی اجازت دے دیں' پتا نہیں کس موڈ میں تھا۔ ہنسنے لگا پھر بولا "تمہیں سدھرا ہوا دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے' دوبارہ تو جیل نہیں آؤ گے۔"

"میں نے کہا کہ صاحب! دوبارہ جیل جانا ہوتا تو ٹھیلا لگا کر دھوپ میں کیوں پھرتا؟ کہنے لگا کہ چل وہاں جا کر کھڑا ہو جا' کوئی پوچھے تو میرا نام لے کر کہہ دینا کہ میں نے کھڑا کیا ہے۔" مگر سو روپے چائے کے لیے لیے۔" عدنان نے تفصیل سے بات بتائی۔

"نصیب ہے تیرا جو سو روپے پہ معاملہ پٹ گیا ورنہ تو۔۔۔ خیر آج کتنے کا دھندا ہوا؟" عدنان روز کی آمدنی لا کر ان ہی کے ہاتھ پہ رکھ رہا تھا وہ خوش تو بہت ہوئے مگر انہوں نے اس خوشی کو ظاہر نہیں کیا کہ آسمان پہ چڑھ جائے گا۔ بولے گا کہ آج ہی نکاح کرا کے رخصتی کروالو۔ انہوں نے دل میں سوچا۔

دو ہفتے بعد عدنان نے اپنا ٹھیلا سیٹ کر لیا تو وہ دوبارہ اپنے دھندے سے لگ گئے۔ عدنان کو کام کرتے بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ اس نے اپنی شادی کی رٹ لگالی۔ ادھر باپ کو اس رشتے کی فکر ہو رہی تھی جو شمسہ بوا نے فروا کے لیے بتایا تھا۔ بیوی منع کر رہی تھیں اور وہ خود ابھی عدنان کی شادی سے انکاری تھے۔ گھر میں تقریباً" روزانہ ہی لڑائی جھگڑا ہو رہا تھا' مگر فروا کے معاملے میں جیت باپ کی ہوئی' انہوں نے شمسہ بوا کے توسط سے ان لوگوں کو گھر بلا لیا' فروا کا رویا ہوا اور سوجی ہوئی سرخ آنکھیں نظر انداز ہو گئیں! جب ایک جیتی جاگتی لڑکی نظر انداز ہو رہی تھی تو اس کے جذبات و احساسات کی پروا کون کرتا۔ یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں تھیں۔

فروا سے شادی کے امیدوار کی عمر تقریباً" اڑتیس سال تھی۔ ایک بیٹا نو سال کا اور دوسرا چھ سال کا تھا۔ موصوف کی ماں اور تین بہنیں لڑکی دیکھنے آئی تھیں۔ مستقبل کے دولہا کی ماں کی بس ایک کمزوری تھی۔ ہونے والی بہو کم عمر ہو۔ شکل و صورت چاہے جیسی ہو' ان کے خیال میں کم عمر بہو میں جلدی اور آسانی سے

قابو میں آجاتی ہیں۔ اسی لیے فروا کی جی بھر کے کالی رنگت نظر انداز کر کے انہوں نے اس رشتے کی ہامی بھرلی۔

"ابھی اس سے بڑی ثانیہ اور رابعہ ہیں۔ انہیں چھوڑ کر ایسے کیسے کر دوں فروا کی' وہ بھی دوہاجو سے۔" امی جتنا اور جیسا احتجاج کر سکتی تھیں۔ شوہر کے آگے کر رہی تھیں۔ عدنان اپنے ہی چکروں میں لگا پڑا تھا' وہ چاہ رہا تھا کہ فروا کی بارات کے دن اس کا ولیمہ بھی نمٹ جائے۔ بڑا فرحان جان بوجھ کے خاموش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک ایک کر کے کم از کم دو' تین' پہاڑ کھسکیں تو شاید اس کی باری آجائے۔

تین ماہ بعد اس کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ فروا کے سسرال والے آئے۔ مٹھائی کھلا کر ہاتھ پہ شگن کے کچھ نوٹ رکھے اور رشتہ پکا ہو گیا۔ شادی کے انتظامات ابو اور فرحان کے ذمے تھے' دونوں نے کمیٹیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ جہیز کا کچھ سامان امی تھوڑا تھوڑا کر کے لاتی رہتی تھیں' شادی بہرحال ٹھیک ٹھاک ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼

"یہ گنے کا رس ہے۔ سب کو دے دے گلاسوں میں ڈال کر۔" ابو رات گئے ٹھیلا لے کر آئے تو واپسی پہ بڑے بڑے دو شاپر مائرہ کو پکڑائے' ان کا معمول تھا رات جب بھی گھر آتے' اکثر ہی کچھ نہ کچھ لے آتے' کبھی پھل' کبھی چاٹ' سموسے' گول گپے' رنگ برنگے شربت' جس دن بکری ذرا زیادہ ہوتی' اس دن مٹھائی' نمکو' روسٹ یا تکے جیسے آئٹم بھی آجاتے' ایک روز رابعہ کو عادت کے مطابق بیٹھے بٹھائے خفقان ہو رہا تھا۔

"اگر ہمارے گھر کی آبادی کچھ کم ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا' کچھ تو بہتری آتی' تین' چار بچے بھی کافی ہوتے ہیں ایک فیملی بنانے کے لیے۔" وہ اپنی بہنوں سے مخاطب تھی۔

"ہم جتنے بھی ہیں۔ اور ہمارے ابو جیسے بھی ہیں' کم از کم کھانے پینے کی تو کوئی تنگی نہیں ہے نا' ہم یہ فلمی ڈائیلاگ نہیں مار سکتے کہ۔"

"کھلا نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟" سائرہ نے جواب دیتے ہوئے بڑی مہارت سے نقل اتاری' سب کی سب کھلکھلا اٹھیں۔

"اللہ بیٹیوں کے نصیب سے بہت دیتا ہے۔" امی نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"غربت' محرومیاں اور تلخیاں بھی تو ہمارے ہی نصیب سے آتی ہیں شاید۔" فروا نے نہایت کڑوا منہ بنا کر سوچا مگر اپنی سوچ زبان تک نہ لائی' اسے بھی چپ رہنے اور اندر ہی اندر گھٹنے کی عادت تھی۔

جب سے شادی کی تیاریاں شروع ہوئی تھیں' فروا کے ہونٹوں پہ تو جیسے چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ ماں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان تھی۔ رابعہ کا دل کبھی دہل جاتا۔

"خدانخواستہ کچھ کر کرا نہ لے۔" وہ فروا کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے اندر ابلتے آتش فشاں کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ تو خیر کیا کچھ کرتی' اس سے پہلے عدنان نے دھماکہ کر دیا۔ فروا کی بارات میں ٹھیک دو ہفتے باقی تھے' جمعے کے روز وہ آدھے دن میں ہی گھر واپس آگیا تھا۔ اپنا ٹھیلا اور اس کی چیزیں ٹھکانے لگائیں اور نہا دھو کر اپنا عید کا نیا کرتا شلوار پہن کر باہر نکل گیا۔

"اس وقت نئے کپڑے پہن کر کس کی بارات میں جا رہے ہیں بھائی؟" مائرہ نے یونہی زور سے کہا۔

"اپنی۔" بھائی کی طرف سے با آواز بلند جواب ملا۔

"ہمیں نہیں بلایا اپنی بارات میں؟" عمیرہ نے جوڑے کی پیکنگ کرتے ہوئے اس میں آل پن گھسیڑی۔

"چھوڑو' تم لوگ کیا کرو گی جا کر' میں یہیں لے آؤں گا تمہاری بھابھی کو' تم لوگوں کے کپڑوں' جوتوں اور زیور کا خرچ بچا دیا میں نے۔" عدنان بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ قہقہہ لگا کر عمیرہ کی بات کا جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

شام ڈھلے اس کی واپسی ہوئی تو رنگ برنگی کڑھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نگوں اور موتیوں سے آراستہ سیاہ برقعے میں ملبوس ایک اور ذی نفس اس کے ہمراہ تھا' ماں اور بہنیں سب کی سب حیرانی سے دیکھ رہی تھیں کہ یہ اپنے ساتھ کسے اور کیوں لایا ہے۔ ابو اور فرحان کی واپسی میں ابھی کافی دیر تھی۔

"یہ میری امی ہیں' جا انہیں سلام کر۔ ان کی دعائیں لے۔ جھجک مت' یہ تیرا اپنا گھر ہے' برقع اتار' آرام سے بیٹھ۔" عدنان برابر میں بت بنی کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوا جو چہرے کا نقاب ہٹا کر ایک نظر گھر اور گھر والوں پہ ڈال کر پھر سے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ بیوٹی پارلر کا خوب صورت میک اپ نتھ اور بندیا چہرے پہ سجے نظر آرہے تھے۔ سب کا ماتھا ٹھنک گیا۔

"امی! یہ مدیحہ ہے میری بیوی' ہم نے آج ہی نکاح کیا ہے۔ اب دو ہفتے بعد فروا کی بارات والے دن ہمارا ولیمہ کر دینا۔" عدنان یوں بول رہا تھا جیسے ماں سے پراٹھا یا چائے بنانے کی فرمائش کر رہا ہو۔ ماں کے ساتھ ساتھ بہنیں بھی چیخ پڑیں۔

"یہ کیا کیا بیٹا تو نے۔" ماں نے اپنے کانپتے دل پہ ہاتھ رکھا۔ "تو جانتا نہیں ہے کیا اپنے باپ کو' جان سے مار ڈالے گا۔ تجھے اوپر سے فروا کی شادی سر پہ کھڑی ہے ناہنجار' کچھ تو سوچا ہوتا' لوگ کیا کہیں گے۔" امی روہانسی ہو گئیں۔

"کچھ نہیں ہو گا امی! سب ٹھیک ہو جائے گا' تم فکر مت کرو اور لوگوں کا کیا ہے' دو چار دن میں سب بھول بھال جائیں گے۔" عدنان لاپروائی سے پان چباتے ہوئے ہوا بولا پھر برابر میں ایستادہ بت کو کہنی مار کر مخاطب ہوا۔

"تجھ سے کہا کہ امی کے پاس جا کر بیٹھ' انہیں سلام کر' سنتی نہیں ہے کیا۔"

"جی اچھا۔" وہ بڑی فرماں برداری سے سیدھی چلتی ہوئی امی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم جی!" نظریں جھکا کر وہ اپنے مہندی' نیل پالش اور انگوٹھیوں سے سجے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔

"آ۔۔۔ ہائے عدنان! یہ تو نے کیا کیا۔" امی نے نئی نویلی بہو کی جانب متوجہ ہوئے بغیر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"امی! سلام کا جواب تو دے دو' اس کے سر پہ ہاتھ رکھو' اپنا گھر بار' سب کچھ چھوڑ کر تمہاری خدمت کے لیے آئی ہے۔ اپنے دل میں کیا سوچے گی۔" عدنان بھی ماں کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"ارے کم بخت' میری خدمت کے لیے یہ اتنی جانیں کافی ہیں' تجھ سے کس نے کہا تھا یہ کارنامہ دکھانے کو' میں نے کہا تو تھا تجھ سے کہ سال کے اندر اندر تیری شادی کر دوں گی۔ صبر نہیں ہوا تجھ سے۔ ماں کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔"

"تمہاری تو ہر بات کا اعتبار ہے ماں! پر ابو بڑی الٹی کھوپڑی کے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے دو تین کو سر کائے بغیر وہ میری شادی کا نہ تو نام لیں گے نہ ہونے دیں گے' تب ہی تو میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔"

"آگے کا کچھ سوچا تو نے' تیرا باپ کیا حشر کرے گا' کچھ اندازہ ہے؟" امی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"بڑا اچھا سواگت کر رہی ہو بہو کا۔ ایک گلاس پانی کو بھی نہیں پوچھ رہیں۔" عدنان ان کے خدشات کی پرواہ کیے بغیر اپنی ۔۔۔ ہی ہانک رہا تھا۔ ساری بہنیں کمرے میں اکٹھی چپ چاپ ان تینوں کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔

"ابھی تو میں اس کو نیچے کے کمرے میں چھوڑ رہا ہوں' ابو آئیں تو ذرا تم طریقے سے سمجھا لینا۔" عدنان نے لجاجت سے کہتے ہوئے ماں کے گھٹنے چھوئے۔

"تم ہی سمجھانا انہیں' میرے بس کے نہیں ہیں وہ جانتا تو ہے ان کا غصہ۔" امی نے کورا جواب دیا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔" عدنان اٹھ کھڑا ہوا اور دلہن کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

رات میں باپ سے پہلے فرحان گھر واپس آیا تھا۔ آتے ہی ماں سے مخاطب ہوا۔

"عدنان کسی لڑکی کو گھر لایا ہے؟"

"خبر مل گئی تجھے۔" امی نے گہری سانس لی۔

"گلی کے لڑکوں سے پتا چلا ہے' کونے پہ کھڑے سب کے سب باتیں کر رہے ہیں کہ یہ کسی لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔" فرحان نے پنکھے کے نیچے کھڑے ہو کر شرٹ کے بٹن کھولے۔

"نکاح کر کے لایا ہے۔" امی نے بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

"نکاح کر کے بھگائے یا بھگا کے نکاح کرے۔ ایک ہی بات ہے۔ اگر لڑکی کے گھر والے پولیس لے کر پہنچ گئے نا تو ساری عشق و عاشقی ناک سے نکال دیں گے۔" فرحان کے تیور خراب ہو چلے تھے۔

"پولیس تو بعد میں آئے گی' اس سے پہلے تمہارے ابو آئیں گے۔ ان کا سوچو۔" امی کے صرف چہرے سے ہی نہیں' لفظوں اور لہجے سے بھی پریشانی اور خوف جھلک رہے تھے۔

"جو کر کے لایا ہے وہی نمٹے گا ان سے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔" فرحان نے نسبتاً" نرم لہجے میں انہیں تسلی دی اور خود واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہو کر ہاتھ منہ دھو کر آیا تو رابعہ کھانا گرم کر کے اس کے لیے دسترخوان لگا چکی تھی۔ فرحان نے بمشکل دو چار لقمے ہی کھائے تھے کہ نیچے سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ فرحان نے تلخ مسکراہٹ سے ماں کو دیکھا۔

وہ بھلا کیا کر سکتی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھی وہ شور شرابا سن رہی تھیں۔ جس میں شوہر کی مغلظات اور ڈانٹ پھٹکار کی آواز نمایاں تھی۔ عدنان کی بھی تیز آواز آرہی تھی جو وہ برابر سے جواب دے رہا تھا۔

فرحان کھانا کھا کر پانی پی رہا تھا جب دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتے ابو اوپر آئے' سانس چڑھی ہوئی' چہرہ اور جسم پسینے میں تر بتر' کمرے میں آکر دھپ سے نیچے بیٹھ گئے اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

"یہ لو ابو! پانی پی لو۔" فرحان نے ٹھنڈے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے گلاس پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا' کچھ پانی چھلک کر نیچے گرا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ گہرے گہرے سانس لیتے رہے پھر گلاس اٹھا کر غٹاغٹ پانی چڑھا گئے۔

"دل تو ایسا چاہ رہا ہے کہ اس الو کے پٹھے کو جان سے مار دوں۔" وہ بیوی کی جانب دیکھ کر غرائے۔

"اس سے بول دینا فروا کی شادی سے پہلے پہلے یہاں سے دفعان ہو جائے اس لونڈیا کو لے کر ورنہ میں دونوں کو اگلے جہاں میں پہنچا دوں گا۔"

"ایسے تو اور بدنامی ہو گی۔ سب کو پتا تو چل ہی جائے گا۔ اب معاملے کی ڈھکا چھپی کر کے ولیمہ کر دیں گے۔ کچھ تو عزت رہ جائے گی۔" وہ منمنائیں۔

"سالے نے پہلے ہی کون سی عزت بخشی ہے ہمیں جو اس کی وجہ سے ہماری بدنامی ہو گی۔ کمینہ پہلے جیل یاترا کر کے آگیا' اب لونڈیا بھگا کر لے آیا' آگے چل کر جانے کیا کارنامے دکھائے گا۔"

ابو کے منہ سے ایک بار پھر مغلظات کا سیلاب بہہ نکلا' رات گئے تک وہ بیٹے کو ایسے ہی صلواتیں سناتے رہے۔ اسی غم و غصے میں کھانا بھی نہیں کھایا ایسے ہی پڑ کر سو گئے۔ اللہ جانے سوئے بھی تھے یا جاگتے ہی رہے' امی کی تو ہمت نہیں ہوئی ان سے دوبارہ کچھ کہنے کی۔ لڑکیاں بھی چپ چاپ رات گئے تک اپنی اپنی سوچوں میں الجھی الجھی جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گئیں۔

اگلے روز امی نے سمیرا' حمیرا دونوں کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے بلا لیا' دوپہر میں ہی دونوں بھاگی بھاگی چلی آئیں۔

"ارے ہائے امی یہ کیا کر دیا اس کمینے نے۔" سمیرا نے گود کے بچے کو عمیرہ کے حوالے کیا اور ماں سے مخاطب ہوئی۔ باقی بچوں کو خالائیں پہلے ہی اپنی حفاظتی تحویل میں لے چکی تھیں۔ کمروں میں چاروں طرف شادی بیاہ کے حوالے سے کپڑے اور دیگر سامان پھیلا ہوا تھا۔ بچے سب سے پہلے ان کی طرف لپکے تھے۔

"جو کرنا تھا وہ تو کر دیا' اب ذرا اپنے ابو کو سمجھاؤ'

WWW.PAKSOCIETY.COM

شادی سر پر کھڑی ہے۔ وہ بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں۔" امی خاص طور پر حمیرا سے مخاطب ہوئیں۔ سب سے بڑی ہونے کے ناتے وہ باپ کی ذرا زیادہ لاڈلی تھی' ان کے آگے بات کرنے کی جرأت بھی رکھتی تھی اور کبھی اپنی منوا بھی لیتی تھی۔

"ویسے وہ ہے کہاں؟" دونوں کے لہجے میں تجسس در آیا۔

"رات کو تو عدنان نیچے لے گیا تھا۔ آج تو اس نے ٹھیلا بھی نہیں لگایا' اللہ جانے نیچے ہی ہے یا اسے لے کر کہیں چلا گیا' میں تو ڈر کے مارے نہ خود نیچے گئی ہوں نہ لڑکیوں کو جانے دیا۔ تمہارے ابو کو پتا چل گیا تو ہم سب کا گلا گھونٹ دیں گے۔" امی نے اس کے تجسس کے غبارے میں سے ہوا نکالی۔

"ارے کوئی پتا نہیں چلے گا انہیں' میں بس یوں گئی یوں آئی۔"

حمیرا تیزی سے نیچے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد دوبارہ اوپر آئی تو سمیرا سمیت ساری بہنیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

"نیچے ہی ہیں دونوں' میں گئی تو دروازہ بند کیے سو رہے تھے۔ میں نے جا کر جگایا ہے' میرے سامنے ہی ہاتھ منہ دھو کر آئی ہے' شکل و صورت تو کوئی خاص نہیں ہے۔ باتوں سے بھی کافی تیز اور چلتر لگ رہی ہے۔" حمیرا روایتی باتیں کرنے لگی۔

"چلتر نہ ہوتی تو اتنے ہینڈسم لڑکے کو کیسے قابو کرتی' ایسی لڑکیاں ہی اس طرح کے کارنامے دکھاتی ہیں۔" سمیرا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"عدنان تو حلوہ پوری لینے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ باجی اس کے پاس بیٹھی رہنا۔ میں ابھی آ رہا ہوں' تم بھی یہیں ناشتا کر لینا' میں نے کہا کہ بھیا جی ہمارا تو اب کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ تم کرو ناشتا اور اپنی دلہن کو کرواؤ۔ میں تو اوپر آ گئی۔"

"یہ کچھ لائی بھی ہے اپنے ساتھ یا ایسے ہی خالی ہاتھ بھاگ آئی گھر سے؟" سمیرا نے امی سے سوال کیا۔

"ہاں! ٹرک بھر کے جہیز لائی ہے۔ میں نے چھپا کر رکھ دیا اتنے بڑے گھر میں۔" امی اس کے اس بے سروپا سوال سے جھلا کر بولیں۔ سب کی سب ہنس پڑیں۔ سمیرا خفیف ہو گئی۔

کھانا کھا کر وہ دونوں تو اپنے اپنے بچوں کو لے کر لمبی غفیل ہو گئیں' امی لیٹی تھیں مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' سائرہ عمیرہ اور مائرہ باقی رہ جانے والے جوڑے اور بیڈ شیٹ پیک کر رہی تھیں' ثانیہ اپنے دوپٹے میں ستارے' موتی ٹانکنے میں منہمک ہو گئی۔ فروا آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چپ چاپ لیٹی تھی' خدا جانے سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ رابعہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ڈائجسٹ میں بھی دل نہ لگا تو اسے ایک طرف ڈال کر قلم اور ڈائری فوراً اٹھالی۔

"ہم جیسے لوگوں کی خوشیاں ادھوری اور غم پورے ہوتے ہیں' نہ جانے تقدیر ہمارے ساتھ ایسے بھیانک کھیل کیوں کھیلتی ہے جس میں ہم کمزور اور بے بس لوگوں کی ہار یقینی ہے' جب شکست ہی مقدر ہے تو یہ آنکھیں کیوں یہ خواب کیوں؟ یہ دل کیوں؟ یہ خواہشیں کیوں اور یہ زندگی؟ کیوں یہ امیدیں کیوں؟ ایک پھول کی آرزو میں اتنے کانٹے کہ روح تک لہولہان ہو جائے۔ یہ کیسے زخم ہیں جن کے بھرنے کے آثار نہیں' یہ کیسی موت ہے جو بار بار آتی ہے اور نیم جان کر کے چھوڑ جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"چھوڑو نا ابو! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا' ابھی فروا کی شادی سر پر ہے۔ تم ایک نئے پھڈے میں ٹانگ اڑا رہے ہو' فروا کی بارات کے دن ان دونوں کو بھی اسٹیج پہ بٹھا کے ولیمہ کر دو۔ اللہ اللہ خیر صلا' اچھا ہے خود ہی کر کے لے آیا' ہم کرتے تو کتنا پیسہ خرچ ہوتا' اب وہی رقم کسی لڑکی کی شادی میں کام آ جائے گی' ہمارے گھر تو ویسے بھی لائن لگی ہوئی ہے' یہ بھی تو دیکھو' بیوی بچوں کے بہانے لگ کر تو کمائے گا۔ آوارہ دوستوں سے جان چھوٹے گی۔" حمیرا پورا زور بیان صرف کر رہی تھی کہ کسی طرح باپ کو قائل کر لے۔

"اچھا بھئی جو تمہاری مرضی ہو کرو۔ سب کی الگ الگ بولیاں ہیں۔ میرا ساتھ کون دے گا۔" وہ جھلا کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شکر' یہ اپنی ضد سے کچھ تو ہٹے۔" امی نے طمانیت کا سانس لیا۔

"سوچ رہا ہوں میں بھی تم لوگوں کی مشکل آسان کر دوں۔ بغیر رقم خرچ کیے شادی کرنے کا کتنا آسان نسخہ ہے۔" باپ کے جانے کے بعد فرحان شروع ہو گیا۔

"کیوں کوئی دیکھ رکھی ہے کیا؟" سمیرا چہک کر بولی۔

"نہیں دیکھی تو دیکھ لیں گے' اس میں کیا مشکل ہے۔" فرحان تفاخر سے گویا ہوا۔

"ارے بیٹا! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اب ایسی باتیں کر کے میرا دل مت دہلاؤ تم لوگ؟" امی لجاجت سے کہنے لگیں۔

"ارے امی! فکر کیوں کرتی ہو' مذاق کر رہا ہوں میں۔" فرحان ہنس پڑا۔

☼ ☼ ☼

خوب صورت لائٹنگ اور بہترین آرائش و زیبائش نے ہال کو بقعہ نور بنایا ہوا تھا۔ حمیرا سمیرا کی شادیوں کی طرح فروا کی شادی پہ بھی دل کھول کے رقم خرچ کی گئی تھی۔ جہیز دولہا کا سامان پہناؤنیاں' کھانا' ہر انتظام بہترین اور ہر شے خوب سے خوب تر تھی۔ رشتے دار' محلے دار سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"اے لو' کہنے کو اتنا ذرا سا گھر جیسے ماچس کی ڈبیا' جوان جہان لڑکیوں سے گھر بھرا ہوا اور شادی میں ٹھاٹ باٹ دیکھو۔" محلے کی خواتین پلیٹوں میں بوٹیوں کی چوٹیاں کھڑی کیے حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

"تو خالہ! یہ لوگ اپنا گھر بنانے میں پیسہ ضائع نہیں کرتے دو ہی تو لڑکے ہیں وہ اوپر نیچے رہ لیں گے یا اپنا انتظام خود کر لیں گے۔ لڑکیاں تو آنگن کی چڑیاں ہیں۔ ایک ایک کر کے اڑ جائیں گی' پھر یہ بھی تو ہے کہ ایسی شادی اور جہیز دیکھ کر ہی تو دوسری لڑکیوں کے رشتے بھی آئیں گے۔"

سب کی سب کھاتی جا رہی تھیں اور بولتی جا رہی تھیں' فروا کی اتنے دنوں کی چپ رخصتی کے وقت بھی نہ ٹوٹی تھی۔ بغیر روئے دھوئے وہ یونہی خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ "اپنے اندر ہونے والی برسات کس کو نظر آتی ہے' یہ دنیا' یہ رسم و رواج' یہ خیالات کیسے ایک جیتے جاگتے انسان کو کسی اژدہے کی طرح نگل لیتے ہیں۔" دلہن کے روپ میں رخصت ہوتی فروا کو دیکھ کر رابعہ نے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

فروا کی شادی کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا جب ایک دن بڑی پھوپھی کی تشریف آوری ہوئی' رابعہ سے نیچے ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کپڑے دھل چکے تھے۔ بس تھوڑے سے ہی باقی تھے۔ اس نے پانی کی موٹر چلا کر بڑا والا ڈرم بھرا جو تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

"السلام علیکم پھوپھی!"

"وعلیکم السلام بیٹا! دلہن نیچے ہے یا اوپر؟" انہوں نے کھڑے کھڑے سوال کیا۔

"دلہن؟" ایک لمحے کو رابعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر وہ مسکرا دی "نیچے ہی ہیں۔"

"دروازہ تو بند ہے کمرے کا' ٹی وی کی آواز آ رہی ہے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر جھانکا۔

"بتاؤ ذرا' مہمان کی آواز سن کر بھی نہ دروازہ کھولا نہ باہر آئی۔ توبہ توبہ کیسی دیدہ ہوائی بہوئیں ہیں آج کل کی۔ ایک ہمارا دور تھا ہا۔۔۔ صبح سے لے کر رات گئے تک سسرال والوں کی نظروں کے سامنے ہی سب کام کاج کرتے رہتے تھے۔ رات میں بھی اپنی کوٹھری میں سب کے سونے کے بعد جاتے تھے۔ اب تو دن دہاڑے کمرہ بند کیے پڑی رہتی ہیں۔" زور زور سے بولتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگیں۔

رابعہ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بولتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی تو کیا، نئی بہو کا مزاج کچھ اور ہی تھا۔ شروع شروع دنوں میں ابو کی باتوں کی وجہ سے ہی وہ کچھ کٹی کٹی سی رہتی تھی۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تب بھی وہ زیادہ تر نیچے اپنے کمرے میں ہی پائی جاتی تھی۔ دوپہر میں امی کھانا کھانے کے لیے بلواتیں۔ کبھی آجاتی، کبھی نہیں، رات میں یا ابو کے سامنے وہ کبھی اوپر نہیں آئی تھی۔ عدنان بازار سے ہی کچھ نہ کچھ لے آتا فی الحال دونوں کا گزارا ہو رہا تھا۔

"فروا کے کیا حال ہیں؟ ٹھیک رہ رہی ہے؟" اوپر پھوپھی، امی سے باتیں کر رہی تھیں۔ مائرہ نے شربت کے گلاس ان کے آگے رکھے۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ پرسوں، ترسوں آگئی تھی ذرا دیر کو میاں کے ساتھ، پھر واپس چلی گئی۔" امی نے شربت کا گھونٹ بھرا۔

پھر دوپہر کا کھانا لگنے تک وہ عدنان کی بیوی کے بارے میں تفتیش اور قیاس آرائیاں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر لیٹیں تو ذرا سی دیر میں ہی ان کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔

"توبہ ہے، خود تو مزے سے سو گئیں اور ہم بیٹھ کر ان کا آرکسٹرا سنیں۔" عمیرہ نے بڑبڑاتے ہوئے تکیے سے اپنے دونوں کان دبائے، مگر خراٹوں کی آواز تھی کہ تیز سیٹی کی مانند کانوں میں گھسی جا رہی تھی۔ شام میں اٹھیں، فریش ہو کر ہاتھ منہ دھو کر ایک بار پھر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر انہوں نے سیٹ سنبھال لی۔ "اری زہرہ پان تو لگا دے ذرا، منہ ایسا کسیلا کسیلا سا ہو رہا ہے۔" با آواز بلند جمائی لیتے ہوئے انہوں نے اپنی بھاوج سے فرمائش کی۔

"مائرہ چائے بنا رہی ہے آپا! چائے پی لیں، پھر لگا دوں گی۔" انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔

"ارے ان لڑکیوں کو تو اچھی خاصی سلائی آتی ہے۔ سلائی پہ کپڑے کیوں نہیں سیتیں، باپ بھائی کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔" کچھ دیر بعد انہوں نے بات نکالی۔

"ہم تو بہتیرا اسی لیں، سلائی کے کپڑے، کئی بار میں نے کوشش بھی کی مگر آپ کے بھائی اور بھتیجے منع کرتے ہیں۔"

"اے وہ کیوں؟" وہ تعجب سے بولیں۔

"بس ان لوگوں کو برا لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم کس لیے کما رہے ہیں، جس چیز کی یا پیسوں کی ضرورت ہے ہم سے کہو۔ ہم پورا نہ کریں تو بات ہے۔" امی نے دکھڑا انہیں سنایا۔

"ہمارے خاندان کے مرد بھی عجیب کھوپڑیوں کے ہیں، اے ہمارے میاں بھی ایسی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہم تو دن بھر ان سے چھپ چھپا کر اپنی سلائیوں کے کام کرتے تھے۔ ان کے گھر آنے سے پہلے سب کچھ سمیٹا اور رکھ دیا۔ تم لوگ بھی ایسے ہی کر لیا کرو۔"

پھوپھی نے کئی بار کی سنائی ہوئی اپنی رام کہانی ایک بار پھر سنائی اور ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔ رات میں ابو آئے تو پھوپھی نے تب ان سے وہ مقصد بیان کیا جس کے لیے وہ یہاں آئی تھیں۔

"میں اپنے بھائی سے کچھ مانگنے آئی تھی آج۔" کھانے کے بعد پان لگاتے ہوئے وہ ابو سے مخاطب ہوئیں۔

"ابھی ابھی تو شادی کر کے بیٹھا ہوں بیٹی کی۔ اس وقت تو ہاتھ بالکل خالی ہیں آپا! تم جانتی تو ہو سب کچھ۔" ابو نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"اے ہے میں کوئی ادھار مانگنے تھوڑی آئی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچھ مانگنے آئی ہوں۔" پھوپھی بھی پہیلیاں بجھوا رہی تھیں، امی کا ماتھا ٹھنک گیا ان کی بات سن کر۔

"ارے میں یہ کہہ رہی تھی کہ ثانیہ کو مجھے دے دو میرے پپو کے لیے۔" انہوں نے پان کا بیڑا اپنے کلے میں دبایا اور انگلیوں پہ لگا کتھا چونا چاٹ لیا۔

"چرسی موالی تو ہے تمہارا بیٹا۔ کچھ سدھرا بھی یا نہیں؟" ابو بغیر کسی لحاظ کے اپنی عادت کے مطابق ان سے مخاطب ہوئے۔

"ارے لو، تمہیں یہی نہیں معلوم، جہاں سے

عدنان کا علاج ہوا۔ ہم نے وہیں سے پورا علاج کروایا ہے۔ اللہ قسم، اب تو ایسی ویسی چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، کام پر بھی پابندی سے جا رہا ہے۔ روز کی کبھی تین سو کبھی چار سو کی دیہاڑی بنا لیتا ہے تب ہی تو یہاں آئی ہوں۔ ورنہ مجھے کیا شوق ہے اپنی بچی کی زندگی خراب کرنے کا۔" وہ قسمیں کھا کر اپنی بات کا یقین دلانے لگیں۔

"سوچ کے بتائیں گے آپا!" ابو کچھ دیر بعد بولے۔

"ہاں ہاں سوچ لو، خوب اچھی طرح سوچ لو، مگر فیصلہ میرے حق میں ہی کرنا ہاں، بھتیجی ہے میری، پہلا اور سب سے زیادہ حق تو میرا ہی ہے۔"

"بڑے دو بیٹوں کی شادی کرتے وقت یہ بھتیجیاں اور رشتہ یاد نہیں آیا۔ بیٹے قابل تھے تو چھانٹ کر خوب مال دار گھرانوں سے حسین و جمیل بہوئیں لے کر آئیں، اب ناکارہ، نکمے بیٹے کے لیے بھتیجی اور پھوپھی کا رشتہ یاد آگیا۔" امی نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھوپھی تو نیا شوشا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں، مگر ثانیہ کی نیند اور سکون برباد کر گئیں، امی بھی پریشان تھیں، شوہر ابھی خاموش تھے، نہ انکار کیا تھا نہ ہی اقرار۔

فرحان نے البتہ دو چار بار باپ سے استفسار ضرور کیا، اس کی رائے تھی کہ یہ رشتہ کر دینا چاہیے۔

"ویسے تو ہمارے دیکھے بھالے ہی ہیں۔ آخر پھوپھی کا گھر ہے پھر بھی میں نے محلے والوں سے اور معلومات کی ہیں۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ پپو نے نشہ چھوڑ دیا ہے۔ ذمہ داری اور پابندی کے ساتھ روزانہ اپنے روزگار پہ جا رہا ہے پھر ابو! رشتے داری کا معاملہ ہے، ایسے منع کریں گے تو بلاوجہ بات خراب ہو گی۔ پھوپھی الگ ناراض ہوں گی۔" وہ ایک روز بیٹھا باپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو کیوں ہتھیلی پہ سرسوں جما رہا ہے، نہ ہم کہیں بھاگے جا رہے ہیں نہ تیری پھوپھی۔ دے دیں گے جواب، تجھے کاہے کی جلدی ہو رہی ہے؟" باپ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"میں تو بس یونہی۔۔۔ آخر میری بہن ہے۔" فرحان گڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کی سیاہی نے چاروں طرف اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ کمرے میں موجود سارے نفوس سو چکے تھے سوائے ان دونوں کے، جن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اور بہنوں کی نسبت دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھیں اور ایک دوسرے کی ہمدرد و غمگسار بھی زیادہ تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ فرحان بھائی کو آخر میری شادی کی ایسی فکر کیوں ہو گئی ہے، وہ بھی پھوپھی کے ہی گھر، کبھی ابو سے، کبھی امی سے ایسے اصرار کر رہے ہیں جیسے کسی نشے باز کا نہیں بلکہ کسی کمشنر کا رشتہ آیا ہو۔" ثانیہ کی آواز رندھی ہوئی تھی، ایک تواتر سے بہنے والے آنسوؤں کو اس نے بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔

"ایسا لگتا ہے ہمارا تو کسی سے کوئی رشتہ ہے ہی نہیں، بس سب اپنی غرض کے غلام ہیں خود غرض مفاد پرست۔" رابعہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"ہم لڑکیاں ہی رہ گئی ہیں، ان سب کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے۔" ثانیہ کے آنسو پھر بہنے کو بے تاب تھے۔

"میں خودکشی کر لوں گی دیکھنا، اگر میرے ساتھ کسی نے زبردستی کی تو۔ میں فروا نہیں ہوں کہ چپ چاپ اپنی زندگی یوں تباہ کر لوں۔" ثانیہ کے لب و لہجے سے چھلکتی بغاوت اور عزم کو محسوس کر کے رابعہ سن رہ گئی۔

"کیا ہم لوگوں کے پاس بس یہی دو راستے ہیں یا تو اپنے ہاتھوں خود کو مار لو یا زندگی کے ہاتھوں، پتا نہیں ہمارے نصیبوں میں اتنی تاریکیاں کیوں ہیں۔" رابعہ آج دل کی بھڑاس قلم کے بجائے اپنی زبان سے نکال رہی تھی۔

"تم لوگ کیا آدھی رات کو کھسر پھسر کر رہی ہو،

WWW.PAKSOCIETY.COM

سونے دو گی یا نہیں۔" برابر سے سائرہ کی نیند میں ڈوبی جھلائی ہوئی آواز آئی۔ اس کی نیند بہت کچی تھی۔ معمولی سی آہٹ پر بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

"سو جاؤ، تم آرام سے سو جاؤ، اب کوئی کچھ نہیں بولے گا۔" ثانیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے جواب دے کر آنکھیں بند کرلیں، جہاں گرم گرم آنسو، پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلنے کو بے تاب تھے۔

☆ ☆ ☆

رنگ تو وہی پہلے جیسا ہی تھا، کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر بہرحال چہرے پہ ایک چمک اور رونق سی ضرور تھی جو پہلی نظر میں ہی دیکھنے والوں کو نظر آرہی تھی، گلابی جارجٹ کا ہلکی پھلکی کڑھائی والا سوٹ، کانوں میں سونے کی سادہ بالیاں، میچنگ چوڑیاں اور گھنے بالوں کی موٹی سی چوٹی باندھ کر اس میں گجرا لگایا ہوا تھا۔ کلائیوں میں بھی چوڑیوں کے ساتھ، موتیا اور گلاب کے کنگن مہک رہے تھے۔

"کہیں سے آرہی ہو، یا کہیں جارہی ہو؟" فروا شوہر کے ساتھ میکے آئی تو اس کی سج دھج دیکھ کر سائرہ نے سوال کیا، وہی سب سے پہلے ٹکرائی تھی فروا سے۔

"یہ آئس کریم کھلانے لے گئے تھے۔ وہیں سے آرہے ہیں، واپسی پہ یہ گجرے اور کنگن بھی انہوں نے لے لیے۔" فروا کچھ مسکراتے کچھ شرماتے ہوئے بتا رہی تھی۔

اس کا مطمئن اور خوش باش چہرہ دیکھ کر امی کے دل کو کچھ اطمینان ہوا تھا، ورنہ ہر بار اس کی میکے آمد پر وہ روایتی ماؤں کی طرح یہی سوالات کرتیں کہ میاں کیسا ہے، خیال رکھتا ہے؟ بچے یا سسرال میں کوئی اور تنگ تو نہیں کرتا، ساس کا برتاؤ کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

فروا کے کہنے کے مطابق شوہر اچھے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں۔ دونوں بچے زیادہ تر دادی پھوپھی کے لاڈ پیار میں رہتے ہیں، ساس ہنڈیا خود بناتی ہیں، باقی سارا کام بہو کے ذمے ہے، نند بھی کچھ کام کروا لیتی ہے۔ وہ ماں کو گاہے بگاہے ساری تفصیلات بتاتی رہتی۔

"لڑکیاں بھی چمک دمک کی چیزوں سے کتنی جلدی بہل جاتی ہیں۔" رابعہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"پتا نہیں بہلاوا ہے یا سمجھوتا؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔

اس عرصے میں پھوپھی دوبار آکر جواب کا تقاضا کر چکی تھیں۔

"جو بھی جواب دینا ہے، دے دو، بیچ میں کیوں لٹکایا ہوا ہے۔" فرحان بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ آج کل نہ جانے کیوں اس کا مزاج سوا نیزے پر ہی رہتا تھا۔

"ابے دے دیں گے جواب، تو کیوں مرچیں چبا رہا ہے۔" ابو الٹا اس پر بھڑک گئے۔ فرحان بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا، امی اس کے تیور دیکھ کر حیران تھیں۔

"خدا جانے اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔" انہوں نے پاندان اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

انہیں ابھی تک خبر ہی نہیں تھی کہ فرحان بھی اپنے چھوٹے بھائی کے نقش قدم پر چل نکلا ہے، فروا کی شادی کے دوران کیوپڈ کے تیر کا شکار ہوا اور ایسا شکار ہوا کہ مرغ بسمل بن گیا اور محبت میں تو یونہی انہونیاں ہوتی ہیں کہ سینکڑوں بار دیکھی ہوئی پھوپھی کی نائلہ، فروا کی مایوں سے لے کر ولیمہ تک ہر دن اپنی ہر سج دھج اور ناز و انداز کے ساتھ اس کے دل میں اترتی چلی گئی اس کا ہر روپ قاتل تھا، ہر بار چھب نرالی تھی، فرحان تو یوں گھائل ہوا کہ سیدھا پھوپھی سے حال دل کہہ بیٹھا، وہ ہنس پڑیں۔

"اے بیٹا! ایک دوں گی تو ایک لوں گی۔" انہوں نے فوراً "اپنے نکمے اور ناکارہ بیٹے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔

"تو آکر ابو سے بات کرلو نا۔" نئے نئے شکار نے بے قراری کا مظاہرہ کیا۔

"اور جو تیرے باپ نے منع کردیا تو؟" انہوں نے فرحان کی بے قراری سے حظ اٹھایا۔

"وہ میرا ذمہ، تم گھر تو آؤ۔" فرحان نے باپ کو منانے کا وعدہ کیا مگر ابھی تک ثانیہ کے معاملے میں

کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا تھا، اس کی جھنجلاہٹ، غصے میں بدل گئی تھی، نائلہ الگ شو مارتی رہتی تھی۔

"میرا فلاں جگہ سے رشتہ آیا ہوا ہے، فلاں گھر سے رشتہ آیا ہے جلدی کچھ کرو۔" موبائل پر اس کی کالز اور ایس ایم ایس وصول کر کر کے فرحان کا دماغ اور خراب ہو رہا تھا۔

معاملات اپنی جگہ کہ گھر میں عدنان نے ایک نیا قضیہ کھڑا کردیا۔ وہ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بقول اس کے یہاں نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ اس کی بیوی کی لہٰذا وہ یہاں مزید رہ کر خود کو اور بیوی کو ٹینشن میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ارے کل کا جاتا، آج چلا جائے، میری بلا سے جہنم میں جائے اس بھگوڑی کو لے کر، وہاں بہت عزت ہو گی دونوں کی، جانے دو، دو چار دن کرائے پر رہیں گے تو خود ہی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" باپ کے سامنے یہ معاملہ آیا تو وہ حسب عادت بھڑک اٹھے۔

"کرائے پر جا کون رہا ہے؟" نیچے عدنان نے ان کے چیخنے چلانے کی آواز سنی تو طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔

اس کی تینوں سالیاں جاب کرتی تھیں۔ گھر اور باپ کو مدیحہ سنبھالتی تھی۔ اس کی شادی کے بعد ان لوگوں کو بہت مشکل ہو رہی تھی۔ لہٰذا عدنان کو آفر کی گئی تھی کہ وہ برائے نام کرائے پر گھر داماد بن کر رہ لے، مدیحہ تو خیر خوش تھی کہ میکے میں ہی مستقل قیام پذیر ہو رہی تھی، ہر مہینے جب بھی تنخواہ ملتی، اس کی خدمات کے عوض بہنیں کچھ نہ کچھ کرم فرمائی ضرور کر دیتی تھیں، کبھی نقد کی شکل میں، کبھی چیزوں کی شکل میں، سو اس کے لیے وہاں رہنا اتنا مہنگا سودا نہیں تھا، عدنان یوں خوش تھا کہ باپ کے ساتھ آئے دن کے اور بڑی بہنوں کے ساتھ کبھی کبھار کے فضیحتوں اور لڑائی جھگڑوں سے جان چھوٹے گی، پھر برائے نام رقم جو گھر میں ماں کو دیتا تھا، اس کی بھی بچت ہو جائے گی، اور ان دونوں کے جانے سے فرحان یوں شاداں و فرحاں تھا کہ نیچے کا کمرا خالی ہو رہا تھا، اب کم از کم اسے اس ٹینشن سے تو نجات ملی کہ اگر اسے بھی عدنان کی طرح ایمر جنسی میں نکاح یا شادی کرنی پڑی تو بیوی کو لا کر کہاں رکھے گا۔ لہٰذا اس نے جھوٹے منہ بھی عدنان کو روکنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ماں نے تو بہت اصرار کیا تھا کہ وہ چھوٹے بھائی سمجھائے۔

"جب اس نے تمہارا اور ابو کا لحاظ نہیں کیا تو میرے کچھ کہنے یا سمجھانے کا کیا خاک اثر ہو گا، پہلے بھی اپنی من مانی کی تھی، اب بھی کر رہا ہے، کرنے دو، ٹھوکریں کھائے گا تو خود ہی واپس آجائے گا!" ماں کو ٹکا سا جواب دے کر اس نے تو صاف دامن چھڑا لیا۔

☆ ☆ ☆

گلابی اور ہرے رنگوں کے امتزاج سے بنے کامدار سوٹ میں ملبوس ہلکی پھلکی جیولری اور میک اپ سے آراستہ بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ کسی کٹھ پتلی کی مانند بیٹھی تھی۔ پھوپھی اور ان کی بہوؤں، بیٹیوں نے ہار پھول پہنا کر، مٹھائی کھلا کر ہاتھ پر شگن کی رقم رکھی اور اسے پپو کے ساتھ منسوب کردیا۔

"بہت جلد اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جاؤں گی میں۔" پھوپھی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

فرحان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، اس کے پیار کی منزل بہت قریب آگئی تھی۔ ثانیہ کی شادی تو ابھی ایک ڈیڑھ سال دور تھی تب تک کون انتظار کرتا۔ اس نے ماں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ باپ تک معاملہ پہنچا تو وہ خلاف توقع خاموش ہو گئے پھر کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔

"یہ تو وٹہ سٹہ ہو گیا۔ ہماری تو سمجھ سے باہر ہے اس قسم کے رشتے کرنا۔"

"تو یہ بھی تو سوچو کہ ان پر ہمارا رعب رہے گا، ایک لڑکی دے کر ایک لے رہے ہیں۔ ہماری بہن کے ساتھ کوئی برا بھلا کرتے وقت دس بار سوچیں گے وہ لوگ ابا!" فرحان نے انہیں قائل کرنے کے لیے دلیل دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ٹھہر جا بیٹا‘ ذرا سوچنے دے۔“ ابو نے معاملے کو آئندہ کے لیے ٹالا مگر فرحان کو بہت جلدی تھی ’ماں کے سر ہو گیا کہ جیسے بھی ابو کو سمجھائیں اور پھوپھی سے نائلہ کا ہاتھ مانگیں۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر نائلہ کے لیے رشتہ دیا تو پھوپھی جلدی شادی کے لیے اصرار کرنے لگیں۔

”ثانیہ کی شادی تو میں ابھی نہیں کر سکتا‘ میری کوئی تیاری نہیں ہے ’چند مہینے پہلے ہی تو فروا کی کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی دوسری کا کہاں سے کروں۔“ ابو نے عادت کے مطابق دو ٹوک بات کی۔

”ایسا کرو ‘ابھی نائلہ اور فرحان کی کر لو اور ثانیہ کا نکاح دے دو ’بعد میں رخصتی لے لوں گی۔“ پھوپھی نے تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے ’یہی کر لیتے ہیں۔“ ابو نے کچھ دیر سوچا اور ہاں کہہ دی۔

☼ ☼ ☼

”ہماری زندگیاں بھی بس مذاق ہی ہیں پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتے ہمارا یا اب زہر دے دیں ’ایک ہی بار مر جائیں گے۔ روز روز کا مرنا مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔“ ثانیہ ماں کے آگے چیخ رہی تھی۔

”اپنے یہ ڈائیلاگ ابو کو سنا ’ان ہی کا فیصلہ چلتا ہے گھر میں ’امی بھلا کیا کر لیں گی ’بلاوجہ انہیں پریشان کر رہی ہے۔“ سمیرا میکے آئی ہوئی تھی۔ ثانیہ کا رونا دھونا اور چیخنا چلانا سن کر ناگواری سے بولی۔

”میں کیا کروں بھلا کیا کر سکتی ہوں ’سمجھانے کی کوشش کی تھی تمہارے ابو کو ’مگر تم لوگ تو ان کا مزاج جانتی ہی ہو ’الٹا مجھے ہی چھتیس باتیں سنا دیں۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی اپنی بیٹیوں کے لیے ایسے فیصلے نہیں کرتی۔“ بے بسی سے بولتے بولتے امی کی آواز رندھ گئی۔

”اب ایک ہفتے بعد بھائی کا ولیمہ ہے ’اس کا نکاح ہے ’اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ یا تو جب ہی بولنا تھا جب رشتہ طے ہوا تھا۔ اب ہوش آ رہا ہے ’جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔“ سمیرا ہمدردی کرنے یا حمایت کے بجائے ان کے لتے لے رہی تھی۔

”تم تو آرام سے اپنے گھر بیٹھی ہو نا ’تمہیں کیا احساس ہو گا ہمارا؟“ ثانیہ کو اس کی باتوں پر بھی غصہ آنے لگا۔

”ہاں بہت آرام سے بیٹھے ہیں اپنے گھر ’قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے ’اب کس کس بات کو روئیں۔“ وہ شروع ہو گئی۔

”بیٹے کی پیدائش کے چکر میں پانچ بیٹیوں کو جنم دے کر میں تو ایسی گنہگار بن گئی کہ جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔ شوہر نے بیٹے کے لیے دوسری شادی کر لی۔ میری ساس کے طعنے پہلے ہی کیا کم تھے کہ یہ قصور بھی میرے کھاتے میں ہی لکھا گیا ’دوسری کے ناز نخرے اٹھانے میں ساری آمدنی خرچ کر کے گھر آتا ہے۔ میں سارا دن گھر کا کام بھی کرتی ہوں ’بچیوں کو سنبھالتی ہوں اور سلائی بھی کرتی ہوں تاکہ کم از کم ان پانچ جانوں کا دوزخ تو بھر سکوں ’نصیب کا لکھا سمجھ کر زندگی بھگت رہی ہوں ’یہی سوچ لیا کہ کم سے کم چھت کا آسرا تو ہے ’ورنہ پانچ بچیوں کے ساتھ کہاں جاؤں گی۔“

سمیرا بولتے بولتے ہانپ گئی ’کم عمری کی شادی اور اوپر تلے پانچ بچوں کی پیدائش۔ وقت اور عمر سے پہلے ہی وہ بیماریوں میں گھر گئی تھی۔

”ہم لوگوں کی زندگیاں کیا ہیں بس سمجھوتے ہیں۔ شادی نہ کرو تو زندگی کھائی ہے ’کر لو تو زندگی کنواں ہے اب تمہاری مرضی ہے کھائی میں رہو یا کنویں میں گرو۔“ سمیرا سچ بول رہی تھی اور سچ تو ایسا ہی ہوتا ہے سفاک اور تلخ ’سب چپ تھے۔ ثانیہ بھی خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

فرحان کے دل کی مراد بر آئی تھی اسے لگتا تھا دنیا میں اس سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہے۔ ساری دنیا جیسے اس کے قدموں تلے تھی ’وہ اپنا ہنی مون پیریڈ گزار رہا تھا اور نائلہ نے ان دو چار دنوں میں ہی اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے تھے۔

”گھر اتنا چھوٹا ’اتنا تنگ ہے ’دم گھٹتا ہے میرا نہ کہیں سے ہوا آتی ہے ’نہ روشنی ’نہ دھوپ۔ آئے دن پانی غائب ’روزانہ بجلی غائب ’گھر میں یہ سہولت نہیں ہے ’وہ سہولت نہیں ہے۔“ وہ روزانہ فرحان سے یوں شکایتیں کرتی جیسے شادی کے بعد ہی پہلی بار اس گھر میں آئی ہو یا اس گھر کو دیکھا ہو ’حالانکہ اپنے بچپن سے اس کا یہاں آنا جانا تھا ’کئی بار یہاں رہ کر بھی گئی تھی ’خوب جانتی تھی کہ کیسا گھر ہے اور کیسی سہولتیں ہیں ’گھر کے کاموں کی کوئی خاص ذمہ داری اس پر نہیں تھی ’پھر بھی اس کے نخرے اور گلے شکوے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

عدنان اپنی بیوی ’نئے نویلے بیٹے اور مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ گھر آیا تھا ’دادا بننے کی خوشی میں باپ نے فی الحال اس کے سارے قصور معاف کر دیے تھے ’ماں اور بہنیں بچے کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ دوبارہ جلدی آنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہوا تو سب سے زیادہ امی کا دل بے قرار تھا ’ابھی تو پوتے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا ’ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی اپنا دل مار کر رہ گئیں۔

”تم لوگ بہت خوش نصیب ہو جو یہاں سے نکل گئے۔ ہمیں دیکھو ’اس کال کوٹھڑی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ وہ بظاہر ہنس کر مدیحہ اور عدنان سے مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ کیا چاہتی ہے؟“ ابو بہرے تو نہیں تھے نہ گھر اتنا بڑا کہ ایک کی بات دوسرے کو سنائی نہ دے ’بہو کا تبصرہ سن کر کڑے تیوروں کے ساتھ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”کچھ نہیں ابو! اتنے چھوٹے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے نا اسے پھر آئے دن یہاں کچھ نہ کچھ مسئلہ رہتا ہی ہے بجلی اور پانی کے ساتھ ساتھ اب اکثر گیس بھی غائب ہونے لگی ہے۔ اس کو پریشانی ہوتی ہے یہاں۔“ فرحان نے کھوکھلے لہجے میں بات بنانے کی کوشش کی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
نئے بال اگاتا ہے۔
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت =/100 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/100 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوا لیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- =/250 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- =/350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ڈیفنس میں ایک گھر کرائے پر لے اور اپنی مہارانی کو وہیں لے جا‘ بہت بڑے گھر سے آئی ہے۔ یہ اس قید خانے میں کیسے رہے گی۔“ ابو نے دونوں کو طنز کے دو چار پتھر مارے اور تن فن کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نائلہ کی زبان درازیاں اور بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ گھر کے ہر فرد کے ساتھ ہی اس نے جھگڑا مول لیا ہوا تھا‘ اس پر مستزاد فرحان کا بدلتا رویہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے لب و لہجے میں بھی تلخی آتی جا رہی تھی۔ گھر کی صورت حال روز بروز کشیدہ ہو رہی تھی۔

ایک روز تو بات اتنی بڑھی کہ فرحان ماں اور باپ دونوں سے ہی الجھ پڑا۔

”جب یہاں کسی کو بھی میرا اور میری بیوی کا وجود برداشت نہیں ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے یہاں رہنے کی‘ میں اپنا الگ بندوبست کرلوں گا کہیں۔“ فرحان غصے میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور یہ محض دھمکی نہیں تھی‘ ایک ہفتے بعد وہ اپنی بیوی اور اس کے جہیز سمیت کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گیا تھا۔ نائلہ کے دل کی خواہش بڑی جلدی اور آسانی سے پوری ہو گئی تھی۔

پھوپھی آئی تھیں‘ چکنی چپڑی باتیں بنا کر رخصت ہو گئیں۔

”ارے یہ آج کل کی اولاد بڑی بے کہنی ہے‘ اللہ قسم‘ تم یقین کرو نہ کرو‘ میں نے تو دونوں میاں بیوی کو ہی بہت سمجھایا‘ اللہ جانے سمجھ میں آیا کہ نہیں لیکن تم فکر نہ کرو‘ وقتی غصہ ہے‘ کچھ دنوں بعد پھر اسی گھر میں دونوں لوٹ آئیں گے‘ ارے ناخن بھی کبھی ماس سے جدا ہوتا ہے۔“ وہ بھائی بھاوج کو تسلیاں دے کر اور ثانیہ کی جلدی رخصتی کا عندیہ دے کر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد ابو کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ گھر والوں پہ قیامت صغریٰ گزر گئی۔ سرکاری اسپتال میں وارڈ کے باہر لکڑی کی بنچ پر بیٹھی وہ اپنے ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی۔

دونوں بھائی اور بھاوجیں آئے تھے اور رسمی تسلیاں دے کر رخصت ہو گئے‘ عدنان تو اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات اور مہنگائی کا رونا ہی روتا رہا‘ البتہ فرحان نے کچھ رقم کے بندوبست کا وعدہ کیا تھا مگر کب اور کتنی یہ اس نے وضاحت نہیں کی‘ رشتے دار‘ محلے‘ پڑوس کے لوگ عیادت کر کر کے جا رہے تھے‘ رابعہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی‘ فی الحال تو امی کا ایک چین لاکٹ بیچ کر کام چلا لیا گیا تھا۔ مگر آگے ۔۔۔ آگے کیا ہو گا امی سمیت سب کے ذہنوں میں یہی سوال تھا۔

”کاش ہم لڑکیاں ہی کسی قابل ہوتے تو جیسے تیسے گھر کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتے۔“ رابعہ کے دل میں شدت سے ہوک اٹھی تھی۔ امی اور سائرہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئی تھیں‘ وہ گھر پہنچیں گی تو مائرہ اور ثانیہ آجائیں گی۔

”ہاں رابعہ بیٹی! کیسی ہو؟ ابو کیسے ہیں تمہارے؟“ اپنے بالکل قریب ایک جانی پہچانی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

ابو کے دیرینہ دوست اور پڑوسی‘ برکت اللہ اس کے پاس کھڑے تھے اس نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا‘ رابعہ کا دل بھر آیا‘ آنسو روکنے کے لیے وہ چہرہ نیچے کیے پلکیں جھپکنے لگی۔

”اللہ کا شکر ہے حالت خطرے سے باہر ہے‘ ڈاکٹروں نے امید تو دلائی ہے کہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ رابعہ نے ان کے استفسار پر بھیگی ہوئی آواز میں مختصر لفظوں میں جواب دیا۔

”شکر ہے اس پاک پروردگار کا۔ آگے بھی ان شاء اللہ وہ رحم کرے گا‘ تم پریشان مت ہونا بیٹی کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا جھجک بتانا۔“

”شکریہ چاچا! بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں‘ یہی کافی ہے ہمارے لیے۔“ رابعہ نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا‘ تمہارے ابو کو دیکھ کر آتے ہیں!“

”جی دائیں جانب تیسرا بیڈ ہے۔“

”اچھا‘ چلیں مولانا صاحب۔“ وہ اپنے ساتھ آئے کسی اور شخص سے مخاطب ہوئے جو رابعہ کی طرف پشت کیے دیوار میں لگی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

”چلیے برکت صاحب!“ وہ مڑے اور برکت صاحب کے ساتھ سامنے کھلے وارڈ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

رابعہ دوبارہ سر جھکا کر اپنے خیالات میں گم ہو گئی تھی اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ برکت چاچا کے ساتھ آنے والا نو وارد کون تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال سے ابو گھر آ گئے تھے‘ ان کا دایاں حصہ فالج سے متاثر ہوا تھا‘ علاج اور فزیوتھراپی سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے‘ اپنی ضروریات کے لیے کسی کے محتاج نہیں تھے لیکن بہرحال جسمانی و نفسیاتی کمزوری اور بیماری کے تھوڑے بہت اثرات اپنی جگہ تھے۔

”اللہ کا شکر ہے اس نے محتاجی سے دور رکھا۔“ ابو سمیت سب ہی نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ دونوں بھائی تو اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے اگر خدانخواستہ ابو محتاج ہو جاتے تو کون دیکھنے والا تھا؟

”کبھی دل چاہتا ہے اپنے سارے رسالے اٹھا کر ردی میں بیچ دوں۔“ رابعہ کے چہرے پہ مایوسی اور حزن و ملال کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مائرہ اور ثانیہ دونوں ہی اسے حیرت سے دیکھا‘ اپنے رسالوں کو وہ جی جان سے لگا کر رکھتی تھی۔ پرانے ہونے کے باوجود صاف ستھرے اچھی حالت میں تھے بچوں سے تو کیا ان بڑوں سے بھی دور رکھتی تھی جو پڑھتے وقت اس کا حلیہ بگاڑ دیں۔

”بس یونہی؟“ وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔ ”ویسے بھی ان کہانیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ سوائے خوابوں کی دنیا کے‘ ان افسانوں کی دنیا‘ ہماری حقیقی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ ہم انہیں پڑھ کر خواب دیکھنا سیکھ جاتے ہیں۔ مگر ان خوابوں کی تعبیر ہمارے بس میں نہیں ہوتی‘ پھر کیا فائدہ ایسی کہانیاں پڑھنے کا ایسے خواب دیکھنے کا۔“

وہ عادت اور مزاج کے برخلاف‘ بڑے کھوئے کھوئے لب و لہجے میں اپنے دل کی بات ان سے شیئر کر رہی تھی۔ ”کہانی کو کہانی سمجھ کر پڑھو‘ دل و دماغ پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ سائرہ نے حقیقت پسندانہ بات کی۔

رابعہ نے چپ کی بکل مار لی مگر خیالات پر روک کیسے لگاتی جو ایک کے بعد ایک آ رہے تھے۔

”جان بوجھ کے ایسا کوئی نہیں کرتا‘ بس خود بخود ہو جاتا ہے‘ کون نہیں چاہتا‘ وہ خوب صورت ہو‘ محبت سمیت بہت سی آسائشیں اور خوب صورتیاں اس کا مقدر ہوں‘ اس کے اردگرد اسے چاہنے والے‘ سراہنے والے ایثار و وفا اور قربانی کے پیکر رشتے ہوں۔ کون نہیں چاہتا زندگی اس کے لیے نرم اور آسان ہو جب اسے یہ سب کچھ رنگین اسکرین یا چھپے ہوئے لفظوں میں ملتا ہے تو وہ خود کو اس کردار کی جگہ رکھ کر یہی خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہر ایک کے ساتھ نہ ہوتا ہو مگر۔“ رابعہ نے ایک گہری سانس لے کر سوچا مگر ”میرے ساتھ تو ایسا ہوتا ہے میری کمزوری ہے یا پتا نہیں‘ پتا نہیں کیا ہے؟ شاید وہی لڑکیوں کی ایک عمومی عادت‘ خواب دیکھنے کی ہم ساٹھ گز کے چھوٹے سے گھر میں اپنے معمولی سے وجود کے ساتھ بیٹھے ایسے ایسے خوش رنگ خواب دیکھتے ہیں کہ کبھی اپنا ہی دل اپنا مذاق اڑانے لگتا ہے اور خاص طور سے جب چاروں طرف گھور اندھیرا ہو تو سورج‘ چاند اور ستاروں کی نہ سہی مگر ایک ننھی سی کرن کی آرزو کرنا کوئی انوکھی بات تو نہیں‘ طوفانوں کی زد میں آئے ہوئے لوگ کشتی اور ساحل کی تمنا نہ کریں تو کیا کریں‘ چپ چاپ خود کو مرتا ہوا دیکھتے رہیں؟“

☼ ☼ ☼

”ہائے ہائے! کیا ناک کٹواؤ گی ہماری توبہ توبہ!“ امی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”پورے خاندان بلکہ برادری

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں دیکھ لو کہیں کوئی ایسی مثال ہے کہ کوئی لڑکی نوکری کرنے کے لیے باہر نکلی ہو، تھوکیں گے لوگ ہم پر۔"

"مجھے صرف یہ سمجھا دیں کہ کب تک گھر کا راشن ادھار آئے گا اور کب تک اور کس کس سے قرضہ لے کر ابو کی دوائیاں منگوائیں گی اور یہ بھی سمجھا دیں کہ یہ سب قرضہ کب اور کیسے واپس ہو گا۔" ثانیہ کو ماں سے ایسی ہی باتوں کی توقع تھی، اس لیے اس نے بڑے آرام سے پوچھا تھا۔

بات نکالی تو رابعہ نے تھی مگر باقی تینوں بہنیں اس کی ہم نوا تھیں۔

"فرحان اور عدنان کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔ میں نے فون تو کیا تھا دونوں کو۔" امی نے جواب تو دیا مگر ان کو خود اپنے کھوکھلے پن کا احساس تھا۔

"جب سے ابو اسپتال گئے ہیں، تب سے لے کر آج تک بیسیوں بار ان دونوں کو فون کر کر کے سارے حالات بتا چکے ہیں، جو کہ وہ خود بھی جانتے ہیں، ایسے ننھے بچے تو نہیں ہیں دونوں پھر کیا جواب ملا، سوائے آئیں بائیں شائیں کے۔" سائرہ غصے سے بولی۔

"ارے وہ دونوں بڑی چنڈالیں ہیں، میرے بیٹوں پہ جانے کیا جادو کر دیا ورنہ ایسے تو نہ تھے وہ۔" امی نے بھی غصے میں جل کر جواب دیا، روایتی ماؤں کی طرح بیٹوں کی برائی ذرا سی بھی ان کی برداشت سے باہر تھی۔

"خوش فہمیوں میں رہنا چھوڑ دیں امی اور لوگوں سے ڈرنا بھی، اگر ہم کئی وقت کے فاقے سے ہوں یا ابو کی دوا اور علاج کے لیے ہمارے پاس پھوٹی کوڑی نہ ہو تو برادری اور خاندان کا کوئی فرد آگے بڑھ کر ہمارے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا، دیکھ چکے ہیں سب کو اور ہم کسی سے امید رکھیں بھی کیوں، جب ہمارے ماں جائے ہمیں اکیلا چھوڑ گئے تو کسی اور سے کیا توقع، کیا شکوہ۔" رابعہ سرد اور سپاٹ انداز میں گویا ہوئی۔

"میں نے جو بات کی تھی، اس کا جواب دیں۔"

"گھر بیٹھے کچھ کر لو، جس سے چار پیسے کا سہارا ہو جائے۔" کچھ دیر بعد وہ شکست خوردہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"گھر بیٹھے بھی کسی کام کا ملنا آسان نہیں ہے، اس کے لیے بھی باہر نکلنا یا لوگوں سے تعلقات ضروری ہیں، پھر ضروری نہیں کہ وہ اجرت ہماری ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو۔" رابعہ نے دو ٹوک جواب دیا۔

"تو گھر سے باہر کیا نوکری کرو گی، نہ کوئی خاص تعلیم ہے نہ ہنر۔" امی چڑ گئیں۔

"اللہ مالک ہے، قدم اٹھائیں گے تو وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔" رابعہ کے لہجے میں اتنا یقین اور اعتماد تھا کہ امی یک ٹک اسے دیکھے چلی گئیں۔

"اپنے ابو سے پوچھا؟" وہ دھیرے سے بولیں۔

رابعہ کی آواز بھرا گئی، اسے جانے کیوں رونا آ گیا، اسے اس وقت بھی رونا آ گیا تھا جب اس نے ابو سے یہ بات کی تھی۔

"ابو جی! اسے میری خود سری یا گستاخی مت سمجھیے گا، میں آپ سے اجازت نہیں مانگ رہی، صرف بتا رہی ہوں کہ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں، اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔" باپ نے فقط ایک نظر اس پر ڈالی پھر سر جھکا لیا۔ کتنی دیر وہ وہاں کھڑی رہی مگر نہ انھوں نے سر اٹھایا نہ کچھ بولے۔

"تم نے اس طرح بات کیوں کی؟" تینوں بہنیں متعجب تھیں۔

"ان کی انا اور خود داری بچانے کے لیے، اگر وہ ٹھیک ہوتے اور کام کرنے کے لائق ہوتے تو ہمیں کبھی بھی گھر سے باہر نہ نکلنے دیتے، میں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھا ہے ان پر نہیں۔" رابعہ بہت سنجیدگی سے جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت بڑا ہال تھا، مختلف عمروں کی خواتین اور لڑکیوں سے بھرا ہوا، بھانت بھانت کے چہرے وہاں موجود تھے، شوخ، خوب صورت، فیشن ایبل بھی، سادہ پُروقار بھی اور حالات، عمر، تھکن کی مار کھائے ہوئے چہرے بھی، ہر چہرے کی اپنی ایک الگ ہی داستان تھی مگر یہاں کسے فرصت تھی ان داستانوں کو کھوجنے یا پڑھنے کی، نظریں اپنے کام پر اور ہاتھ تیزی سے اسے نمٹانے میں مصروف تھے۔

ایک ہفتہ لگا تھا اسے کام سمجھنے میں اور مزید کچھ دن لگیں گے ہاتھوں میں روانی آنے میں، رابعہ کو اس گارمنٹس فیکٹری میں آئے آج نواں دن تھا۔ پانچویں دن سے ہی وہ خود کو کسی کی نظروں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی، کبھی اسے لگتا یہ اس کا وہم ہے مگر فیکٹری کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھی، گھر کی نزدیکی سڑک پر اترتی اور کچھ دور چل کر گھر آ جاتی مگر پھر بھی دن بھر کی تھکن جسم و جان کے ریشے ریشے میں گھسی ہوتی جسے دور کرنے کا بس ایک ہی نسخہ تھا کہ کپڑے بدل، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھائے اور نیند بھری آنکھوں کے ساتھ لیٹ جائے تاکہ اگلی صبح کی مشقت کے لیے جسم تیار ہو سکے۔

اف، باہر نکل کر محنت مشقت سے روزی کمانا کتنا کٹھن ہے، ایک روز اپنے دکھتے ہوئے تلوؤں کو دباتے ہوئے اس نے بے اختیار سوچا۔

کبھی گھر آتے یا فیکٹری جاتے، راستے میں اوباش اور آوارہ، فالتو بیٹھے لڑکوں کی طرف سے ایسے ایسے گھٹیا تبصرے اور ڈائیلاگز سننے کو ملتے کہ اس کا دل چاہتا، آج کے بعد گھر سے کبھی باہر نہ نکلے، اتنی بدصورت دنیا ہے باہر کی، اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مگر نہیں، اس دنیا میں اچھا خاصا حسن اور خوب صورتی بھی ہے۔ اسے تقریباً ایک ماہ بعد احساس ہوا تھا، کسی کی نظروں کی تپش، جو وہ محسوس کر رہی تھی وہ اس کا وہم نہیں حقیقت تھی۔

"بہت کم لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں جن کی عزت کرنے کو خود بخود دل چاہتا ہے یہ، جو ہمارے گھروں سے باہر کی دنیا ہے۔ سراسر کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ اس میں کہیں کہیں کنول کے پھول ملیں تو آنکھیں اور دل خود بخود تعظیم کے لیے جھک جاتے ہیں۔"

وہ عرفان تھا، ان کے ڈپارٹمنٹ کا سپروائزر، دراز قد، ہینڈسم، ہنس مکھ مزاج کا وہ شخص، وہاں موجود جانے کتنی لڑکیوں کا آئیڈیل تھا، مگر یہ گوہر نایاب چپکے سے رابعہ کی ہتھیلیوں میں یوں آن گرا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور خبر ہوئی تو اپنی خوش نصیبی پہ یقین نہ ہوا۔

ڈیوٹی آورز میں وہ فقط ایک سپروائزر تھا۔ پکا پروفیشنل۔ کسی دوسرے کو تو کیا خود رابعہ کو بھی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اس کے دل اور زندگی میں کوئی خاص مقام رکھتی ہے، موبائل نے بہرحال ایک دوسرے سے رابطے کو بہت آسان بنا دیا تھا۔ دونوں ہی بہت محتاط تھے۔ رات کو جب سب سو جاتے تو رابعہ اپنی ڈائری میں موبائل رکھ کر مصروف ہو جاتی اب تو تھکن اور نیند کا غلبہ بھی بہت کم ہوتا تھا۔ شاید محبت ایسا جادو اثر جذبہ ہے کہ بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ تھکن اور نیند کا احساس بھی کم ہی ہوتا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔" اس نے میسج کیا۔

"محبت خواب ہی تو ہے ایک خوب صورت خواب، جس کی تعبیر اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔" عرفان نے جواب میں لکھا تھا۔

"مجھے اپنی خوش نصیبی پہ یقین نہیں آتا، کبھی ڈر لگتا ہے کہ میں پنکھ پھیلائے جس فضا میں پرواز کر رہی ہوں۔ وہاں سے منہ کے بل نیچے نہ آن گروں۔"

"تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ محبت کو، اس کی خوب صورتی کو، اس کی لطافت کو محسوس کیوں نہیں کرتیں؟"

"جب انسان طویل عرصے تک اندھیرے میں رہ کر یکایک تیز روشنی میں آئے تو اس کی آنکھیں اتنی جلدی ان اجالوں سے مانوس نہیں ہوتیں، وہ اک دم گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ان بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرے کو محسوس کر کے سوچتا ہے کہ وہ روشنی واقعی ایک حقیقت ہے یا اس کا وہم۔"

"کبھی سوچتا ہوں، کس فلسفی لڑکی سے محبت کر بیٹھا میں روشنی کی بات کرتا ہوں تو وہ اندھیروں کا ذکر

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے لگتی ہے، میں پھولوں کا ذکر کرتا ہوں تو اسے کانٹے یاد آتے ہیں، میں آسمان کی جانب نگاہ کرتا ہوں اور وہ زمین پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹاتی، تم آخر اتنی قنوطی کیوں ہو؟"

"اگر تم نے اب تک وہ زندگی گزاری اور دیکھی ہوتی جو میں نے گزاری اور دیکھی ہے تو تم بھی شاید ایسی ہی باتیں کرتے۔" رابعہ نے سوچا مگر پھر لکھتے لکھتے رک گئی۔

"کیا ہوا؟ جواب دو۔" اسکرین پھر جگمگانے لگی۔

"کچھ نہیں۔"

"نیند آرہی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا میری یاد آرہی ہے؟"

"جو ہر وقت دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتے ہوں ان کے یاد آنے کا کیا سوال؟"

"کبھی کبھار ہی دل خوش کرنے کی باتیں کرتی ہو تم۔"

"دل تو چاہتا ہے باتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو مگر اپنی غرض کے لیے تمہیں مزید بے آرام نہیں کرنا چاہتا، اب تم سو جاؤ، صبح جلدی اٹھنا ہے، تمہیں بھی، مجھے بھی۔ ٹھیک ہے؟"

"جو حکم۔"

"حکم نہیں درخواست ہے میری ہماری۔" روز کی طرح ایک محبت بھرا گڈ نائٹ اسکرین کچھ دیر جگمگا کر تاریک ہوگئی۔

رابعہ نے سیل آف کرکے تکیے کے نیچے رکھا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر جن آنکھوں میں محبت کے خواب سجے ہوں ان میں نیند کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"خضر بھائی! شادی میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں، امی بہت پریشان ہیں، کہہ رہی تھیں کچھ آسرا بھی ہے یا بس آپ یونہی بے وقوف بنا رہے ہیں۔" لنچ ٹائم شروع ہوتے ہی وہ حسب معمول ایک چکر لگانے ادھر آیا تو صبا شروع ہوگئی۔

"صبر بی بی! صبر، میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لوگ پہلے ساری انویسٹی گیشن کریں گے کہ فیملی واقعی مستحق ہے یا نہیں پھر مدد کریں گے تو اب ان کی انویسٹی گیشن مکمل ہوگئی ہے ان شاء اللہ تین دن کے اندر اندر سارا جہیز پیکج آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔" خضر نے مفصل بات کرکے اسے اطمینان دلایا۔

"اب ذرا میری بھی عرض سن لو بیٹے!" فریدہ آنٹی نے اپنا ٹفن کھولتے ہوئے اسے پکارا۔

"جی، حکم۔" وہ وہاں جاکر کھڑا ہوا۔

"کھانا کھاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

"اللہ آپ کے رزق میں برکت دے، بہت شکریہ، کہیے کیا بات ہے۔" وہ متانت سے گویا ہوا۔

"وہی پوچھ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے کہا تھا تم سے تو کچھ کام بنا؟"

ان کے بیٹے نے ابھی بی کام کیا تھا۔ کئی جگہ نوکری کے لیے اپلائی کیا مگر ہر جگہ تجربہ مانگا جاتا تھا، بالآخر فریدہ آنٹی نے خضر سے اس کی نوکری کے لیے کہیں کوشش کرنے کو کہا تھا۔ خضر بھی یہاں کا ایک ملازم ہی تھا مختلف سماجی و مذہبی تنظیموں سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اس کی فطرت میں نیکی اور خلوص تھا، لہٰذا اپنے سوشل کانٹیکٹس کو اپنے مفاد کے بجائے ضرورت مند افراد کی مدد اور فلاح کے لیے استعمال کرتا تھا۔ کسی کی تعلیم کا مسئلہ ہو، شادی کے اخراجات کا، روزگار کا یا کوئی اور مسئلہ اس سے جو کوئی بھی اپنے کسی معاملے میں مدد مانگتا، وہ خلوص نیت کے ساتھ اس کے حل کے لیے کوشاں ہوجاتا۔

"اللہ پہ بھروسا رکھیں، اسی سے مدد مانگیں۔ ان شاء اللہ سب کام بن جائیں گے۔ آپ دعا کریں، میں کوشش کر رہا ہوں، اللہ ضرور مدد کرے گا ٹھیک ہے۔" اپنے مخصوص نرم اور دل نشیں لہجے میں انہیں تسلی دیتا وہ آگے بڑھ گیا۔

"اور عروج بی بی، آپ کی امی اب کیسی ہیں؟"

"پہلے سے بہت بہتر ہیں خضر بھائی! آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ اتنا مہنگا علاج ہم تو کبھی بھی افورڈ نہیں کرسکتے تھے، آپ کی وجہ سے آدھے سے بھی کم خرچا ہوا۔" عروج کا لہجہ اور الفاظ ممنونیت کے احساس سے بوجھل تھے۔

"شکر اور حمد اللہ کے لیے، جس نے مدد کی توفیق دی امی کا خیال رکھیے گا دنیا و آخرت دونوں کی جنت ان ہی کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔" بزرگانہ انداز میں نصیحت کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

رابعہ چپ چاپ اپنا لنچ ختم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان سوشل ورکر جو خضر بھائی کے نام سے مشہور تھا۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے کی عملی تفسیر بنا لوگوں کے مسائل، دکھوں اور پریشانیوں کو اپنی حتی الامکان مدد اور تعاون سے کم یا ختم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ سچائی اور خلوص نیت کا اثر تھا کہ وہ کسی حد تک اپنے مقصد یا مشن میں کامیاب بھی تھا۔

"پتا نہیں خضر بھائی کو یہ سب کرکے کیا ملتا ہے۔ نری خواری دوسروں کے کاموں کے لیے ادھر ادھر خوار ہوتے رہو، آج کل کی دنیا بڑی مطلبی ہے، اپنا کام نکلنے کے بعد احسان ماننا تو دور کی بات، کوئی کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔ خیر مجھے کیا، جس کی جو مرضی ہو وہ کرے۔" کئی بار کی سوچی ہوئی باتیں، ایک بار پھر سوچیں پھر ہمیشہ کی طرح انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ بھلا سوچنے کے لیے عفان کیا کم تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر کی فضا میں ننھی منی قلقاریوں کی آواز سریلی گھنٹیوں کی طرح ہر سو پھیلی تھی۔ فروا اپنی ننھی منی سی بیٹی کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پہ ممتا کا نور اور غرور لیے اس کی چھب الگ ہی تھی۔

"اس کے ابو کو بیٹی کی خواہش تھی، اللہ نے ان کی خواہش پوری کردی۔" بڑے مطمئن اور مگن انداز میں بیٹی کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ بتارہی تھی۔

"چلو کوئی تو ہے جسے بیٹی کی خواہش ہے ورنہ سب تو بیٹیوں کے نام پر یوں بدکتے ہیں جیسے خدانخواستہ کوئی آفت نازل ہوگئی ہو۔" عمیرہ نے باآواز بلند تبصرہ کیا۔

"ہاں تو اس کی پیدائش پہ اس کے ابو ہی خوش ہیں، دادی، پھوپھیوں نے تو کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بس اس تمنا کا اظہار کردیا کہ چلو، اگلی بار اللہ بیٹا دے۔" فروا نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انکشاف کیا۔

"لڑکے کی خواہش سب ہی کو ہوتی ہے۔ تمہارا میاں خوش ہے بس کافی ہے، باقی سب کی باتوں کو چھوڑو۔" امی بولیں۔

"میں تو بس یونہی بتا رہی تھی مجھے.....!" اس کی بات منہ میں ہی دب گئی۔

پھپھو سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتی کانپتی سامنے سے آرہی تھیں۔

کتنی دیر بیٹھ کر وہ اپنا سانس قابو کرتی رہیں، پھر سب کے سلاموں کا جواب دیا۔

"اللہ توبہ، جانے کیا ہوگیا ہے، دو قدم چلتی ہوں تو سانس پھول جاتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ لوں تو اور غضب۔" ٹھنڈے ٹھار پانی کا گلاس پی کر وہ تکیہ سر کے نیچے جما کر لیٹ گئیں۔

"ارے ثانیہ نظر نہیں آرہی، کیا کر رہی ہے۔" بڑی دیر بعد انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔

"وہ تو اسکول گئی ہیں۔" امی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سائرہ کھٹ سے بول پڑی۔

"اسکول؟ کیا دوبارہ داخلہ لے لیا اسکول میں۔" پھپھو نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔

"پڑھانے جاتی ہیں۔" سائرہ نے ماں کی تنبیہی نظروں کا نوٹس نہ لیتے ہوئے مختصر جواب دیا، کوئی چھپانے والی بات تو تھی نہیں آج نہیں تو کل، پتا تو چلنا ہی تھا۔

"اوئی، پڑھانے؟ کیا اس نے بھی نوکری کرلی۔" وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اٹھ بیٹھیں۔

"قریب میں اسکول ہے اور آدھے دن کی تو بات ہے پھر۔" امی گھبرا گھبرا کر وضاحتیں پیش کر رہی تھیں۔

"تم لوگوں نے برادری میں ہمارے ناک کٹوا دی' پہلے ایک کو باہر نکالا نوکری کے لیے' اب میری بہو صاحبہ بھی نکل پڑیں' نہ پوچھنا' نہ گچھنا' نہ بتانا' پتا بھی ہے' خاندان میں کیسی کیسی باتیں بن رہی ہیں۔" پھپھو غصے میں شروع ہو گئیں۔

"ضرورت کے تحت باہر نکلی ہیں آپا' سب کو نظر تو آ رہا ہے سب کچھ ورنہ ہمیں کوئی شوق تھوڑی ہے' بیٹیوں سے نوکری کروانے کا۔" امی دبی زبان میں صفائی پیش کرنے لگیں۔

"سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ بیٹیوں کی کمائی کھا رہے ہو تم لوگ' اب بتاؤ بے شرمی' بے غیرتی ہے یا نہیں۔" پھپھو نے ایسا تیر مارا کہ سب کی روحیں تک لہولہان ہو گئیں۔

"بیٹے کسی قابل ہوتے چھوڑ کر نہ جاتے تو یہ نوبت کیوں آتی' پہلے بھی تو بچیاں گھر میں ہی بیٹھی تھیں۔" امی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے ایک آہ بھری۔

"ارے سب کے بیٹوں کا یہی حال ہے یا تو الگ ہو جاتے ہیں' ساتھ رہیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ نکمے' نکھٹو' اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ لڑکیوں سے نوکری کرواؤ' گھر میں محنت مزدوری کے بہتیرے کام ہیں۔ گھر بیٹھے کچھ کر لیں کہ چار پیسوں کا آسرا ہو جائے۔ شریف بہو بیٹیاں تو سوکھی روٹی اور پیوند لگے کپڑوں میں بھی گزارہ کر لیتی ہیں' تر نوالوں کے لیے بن سنور کے باہر نکلنا ضروری ہے کیا؟" بھگو بھگو کر یوں جوتے مار رہی تھیں جیسے کسی جنم کی دشمنی کا بدلہ لے رہی ہوں۔

"السلام علیکم۔" ثانیہ اسکول سے آ گئی تھی' گاؤن اور اسکارف اتار کر دوپٹہ اوڑھا' مائرہ اس کے لیے پانی لے آئی۔

بلا کی گرمی پڑ رہی تھی' وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو کر آئی اور وہیں بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔

"باپ کہاں ہے تمہارا؟" پھپھو نے جانے کیوں موضوع بدل دیا۔

"نیچے ہیں۔ پڑوس کے برکت چاچا آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔" ثانیہ نے جواب دیا۔ وہ ابھی ان دونوں کو سلام کر کے اور حال احوال پوچھ کر ہی آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پھپھو ثانیہ سے کرید رہی تھیں کہ اسکول کا ماحول کیسا ہے؟ کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ مرد حضرات کتنے ہیں؟ لڑکیاں کتنی ہیں؟ ثانیہ میک اپ کر کے اسکول جاتی ہے یا بغیر میک اپ کے؟ ثانیہ نے اپنی جانب سے انہیں تسلی بخش جوابات دینے کی کوشش کی مگر لگتا یہی تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

"میں تو اس ارادے سے آئی تھی کہ تم لوگوں سے رخصتی کی بات کروں' کھانا کھا کر پان لگاتے ہوئے انہوں نے اپنے بھائی بھاوج کو مخاطب کیا۔

"سوچ کر بتا دیں گے۔" ابو نے تذبذب سے جواب دیا۔

"ارے بھیا! سوچنا کیا۔ نکاح تو ہو چکا ہے' شربت کے پیالے پہ رخصتی دے دو ہمیں' اب کیا لمبا چوڑا اہتمام کرو گے' حالات ویسے ہی ٹھیک نہیں ہیں تمہارے۔"

"پھر بھی' کچھ نہ کچھ تیاری تو کرنی ہے۔"

"ارے چھوڑو تیاری ویاری کو' میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ شربت کے پیالے پہ رخصتی دے دو' بس اب کی بار آؤں گی تو تاریخ لے کر ہی جاؤں گی۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بول کر کھڑی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

ہری مرچ' پیاز کا پھولا پھولا گرما گرم آملیٹ' نکال کر پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دستر خوان پر۔

"ناشتہ تیار ہے۔" وہ خوشگوار انداز میں چہکا۔

"اللہ خضر بھائی! میں ابھی بنا لیتی' آپ بھی بس۔" عائشہ منہ دھو کر سیدھی ادھر ہی آ رہی تھی۔

"ارے ہفتے کے چھ دن تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتا کھاتے ہیں' ایک دن تمہارے آرام کا سہی۔ آؤ' جلدی سے آ جاؤ' سب کچھ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" خضر دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ جہاں امی پہلے سے ہی موجود تھیں۔

"رات کو معاذ نے بہت ہی تنگ کیا' تین ساڑھے تین بج گئے اسے سلاتے سلاتے۔" عائشہ بولتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا طبیعت تو خراب نہیں ہے' زیادہ تو نہیں رویا۔" امی فکر مند لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"طبیعت بالکل ٹھیک ہے' موصوف کھیل رہے تھے بس دن میں اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں' رات میں پھر ہمیں جگاتے ہیں۔" عائشہ مسکرائی۔

"معاذ نہیں اٹھا؟"

"وہ بھی رات کو جاگتے رہے' بیٹے کے ساتھ ساتھ اب دونوں اپنی نیند پوری کر رہے ہیں۔ صبح فجر کے لیے اٹھے تھے' نماز پڑھ کر تھوڑی دیر بعد پھر سو گئے۔" عائشہ نے توس پہ مکھن لگایا اور ساس کے آگے رکھا۔

"نہیں بیٹا! میں بس آملیٹ کھا رہی ہوں' کافی ہے' بہت زیادہ چکنائی ہو جائے گی۔ عجیب طبیعت ہو جاتی ہے پھر۔" امی نے پیار سے اسے منع کیا۔

"پھر میرے بیٹے نے بڑے پیار سے میرا ناشتہ بنایا ہے' وہی کھاؤں گی۔"

محبت اور شفقت کی دھنک مسکراہٹ ان کے شفیق چہرے پہ بکھر گئی۔ ایسا سلجھا ہوا' تابعدار بیٹا خوش نصیب والدین کو ہی ملتا ہے۔ جو اپنے پرائے سب کی خوشیوں اور غموں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کو تیار رہتا تھا۔ اللہ کی رحمت کا شکر ادا کرتے وہ نہیں تھکتی تھیں۔ انہیں اپنے اس ہیرے بیٹے پہ بڑا فخر تھا جو آج کے اس پُر آشوب دور میں سچ مچ سورج کی ایک بہت روشن کرن بنا ہوا تھا' اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی۔

"خضر بھائی کی بیوی بڑی خوش نصیب ہو گی۔" عائشہ ان کی بہو بعد میں بنی' پہلے بھانجی تھی' ہم اپنے بچپن سے ہی خضر کو خضر بھائی کہہ کر پکارتی تھی' وہی عادت اب بھی برقرار تھی۔

"اس میں کیا شک ہے۔" امی نے لہجے میں غرور نہیں' انکسار بھرا فخر اور مان تھا جو ایسے بیٹوں پر ہر ماں کو ہوتا ہے۔

"ہر سنڈے' میاں کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ کھائے گی۔" عائشہ ہنسی۔ خضر چپ چاپ مسکراتے ہوئے ناشتہ کر رہا تھا۔

"بیٹے! زرمینہ آنٹی دو بار آ چکی ہیں' بے چاری بہت پریشان ہیں' تم دیر سے گھر آ رہے تھے' ملاقات بھی نہیں ہو سکی' اب جو بھی بات ہے' انہیں بتا دو۔" امی نے ناشتہ کرتے کرتے اسے مخاطب کیا۔

"جی امی! میں آج کل ان ہی کے کام کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہوں' اس لیے لیٹ نائٹ گھر آ رہا تھا۔ دراصل معاملہ ہے پیچیدہ۔ اب بقول ان کے اور ان کے بیٹے کے اس نے تنظیم چھوڑ دی تھی مگر تنظیم اتنی آسانی سے ایسے لڑکوں کو نہیں چھوڑتی' خاص طور سے وہ جو بہت اندر تک گھسے ہوئے ہوں' پولیس بھی ایسے ہی لڑکوں کی تاک میں رہتی ہے' اب سب کو علم ہے کہ اس پر ڈکیتی کا جھوٹا مقدمہ ہے مگر سب تنظیم اور پولیس والوں کی ملی بھگت ہے' ایک کو قربانی کا بکرا اور دوسرے کو ایک شہید کی لاش چاہیے' جس پر اپنی سیاست چمکا سکیں' اب میں نے کافی اوپر تک اپروچ تو کی ہے' امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ پھر یہ ہے کہ آنٹی زرمینہ جتنی جلد ہو سکے اسے اپنے بھائی کے پاس سعودیہ بھجوا دیں' تاکہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہ رہے۔" خضر نے تفصیل سے اپنی بات مکمل کی۔

"ارے بیٹا! وہ یہی تو بتا رہی تھیں کہ اس کے جانے کے سب انتظامات مکمل تھے' بس یہ ناگہانی آ گئی' اللہ اس کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے' پانچ بہنوں کا ایک بھائی ہے' اب الٹے سیدھے چکروں سے نکل کر سدھرنے لگا تھا تو اس مصیبت میں گھر گیا۔" امی دل سوزی سے بول رہی تھیں۔

"بدی سے نیکی کی طرف آنا آسان نہیں ہوتا'

WWW.PAKSOCIETY.COM

آزمائشیں تو آتی ہی ہیں، اللہ مشکلات کو آسان کرنے والا ہے۔ ویسے تو میں خود بھی انہیں فون کرلوں گا، اگر آپ سے ملیں تو تسلی دے دیجیے گا۔ ان شاء اللہ ان کا بیٹا بہت جلد چھوٹ جائے گا۔" خضر نے اپنے مخصوص نرم اور اطمینان بھرے انداز میں بات کی۔

"اچھا چلو، یہ بات تو ہو گئی، اب ذرا اپنا معاملہ بھی ایک طرف کرو، مجھے بیچ میں لٹکایا ہوا ہے۔" امی نے جگ سے تازہ جوس گلاس میں انڈیلا۔

"کون سا معاملہ؟" خضر ان کی بات سمجھ گیا تھا پھر بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"ارے بھئی، اتنی لڑکیاں تمہیں بتا چکی ہوں جاننے والوں کی، کسی ایک کو تو فائنل کرلو یا اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو وہ ہمیں بتادو۔"

"چلیں، اس معاملے سے بھی نمٹتے ہیں۔ تھوڑا ٹائم دیں مجھے۔" خضر کی آنکھوں کے سامنے ایک سنجیدہ سی شبیہہ لہرا گئی، وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"یار! بہت ظالم ہو تم۔"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب تم اچھی طرح جانتی ہو؟" عفان نے جتلانے کے انداز میں کہا۔

"مگر میں کیا کروں گی تمہارے گھر آکر؟" رابعہ متذبذب تھی۔

"جب آجاؤ گی تب بتاؤں گا۔"

"ابھی بتانے میں کیا حرج ہے۔" رابعہ ہنوز محتاط تھی۔

"بس میں فون پہ نہیں بتانا چاہتا، تم سامنے ہوگی تو کہنے کا مزا ہی کچھ اور ہوگا۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔" رابعہ کی آواز میں الجھن تھی۔

"یوں کہو مجھ پہ اعتبار نہیں ہوا اب تک۔" عفان کے لہجے میں ناراضی چھلک رہی تھی۔

"ایسی بات نہیں، اعتبار نہ ہوتا تو اتنی آگے تک آپ کے ساتھ کیسے چلتی۔" رابعہ نے گھبرا کر اپنی صفائی پیش کی۔

"کہاں آگے تک چلی ہو میرے ساتھ، مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم آج بھی وہیں کھڑی ہو جہاں پہلے دن تھیں۔"

"مگر مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے میں اس رستے پہ بہت دور تک نکل آئی ہوں۔" رابعہ دھیرے سے بولی۔

"فقط خوابوں، خیالوں میں، حقیقت میں نہیں۔" عفان نے ایک پھر اسے جتایا۔

"اچھا چلیں، میں آجاؤں گی۔" رابعہ نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد ہامی بھری۔

"کب؟" عفان کی آواز سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

"جب آپ کہیں!" رابعہ کی آواز میں محبت آمیز سپردگی تھی۔

"میں تو کہوں گا کہ ابھی آجاؤ۔" اس نے ایک گہری سانس بھری۔

"رات کے تین بجے؟"

"تم آؤ گی تو میرے لیے تو سویرا ہو جائے گا۔"

"پھر ڈائیلاگ؟"

"کیا کریں، فی الحال ڈائیلاگز پر ہی گزارہ کر رہے ہیں۔" عفان نے پھر ایک آہ بھری۔

"ٹھیک ہے، پھر آپ گزارہ کریں میں اب فون بند کر رہی ہوں۔"

"اتنی جلدی، یار کچھ دیر تو اور......"

"بس اب کل، اس سے پہلے کہ کوئی اٹھ جائے اور گڑبڑ ہو، میں اب بند کر رہی ہوں۔ ٹھیک ہے خدا حافظ۔"

"ایک تو تم اتنے پیار سے بولتی ہو کہ بندہ آگے سے فقط سر تسلیم ہی خم کر سکتا ہے اور جو مزاج یار میں آئے۔" رابعہ نے مسکرا کر لائن کاٹ دی۔

"اور زندگی اتنی بدصورت بھی نہیں، جتنی ہم کبھی سمجھنے لگتے ہیں ان ہی اندھیروں میں کہیں کہیں چمکتے

خوابوں کے، امیدوں کے اور امکانات کے جگنو ہمیں راستہ دکھانے کو موجود ہوتے ہیں۔"

نیند کی آغوش میں جاتے جاتے رابعہ سوچ رہی تھی

☼ ☼ ☼

"مجھے تو لگتا ہے جیسے اللہ نے کوئی فرشتہ غیب سے بھیج دیا ہو ہماری مدد کے لیے۔"

ابا کے چہرے پہ صحت اور خوشی کی چمک تھی۔ اوائل عمری سے ہی محنت مزدوری کر کے کمانے کی عادت تھی یوں اچانک بیمار پڑ کر کئی مہینوں کے لیے گھر تک ہی محدود ہو کر رہے اور بیٹیوں نے جیسے تیسے گھر سنبھالا تو ان کی عزت نفس اور خودداری پہ زبردست چوٹ پڑی تھی۔ اولاد کا دست نگر ہونا، خاص طور پہ بیٹیوں کا ان کے لیے دوہری اذیت تھی پھر خاندان اور برادری والوں کی باتیں جسمانی تکلیف ختم ہو گئی مگر ذہنی تکلیف مستقل تھی۔ ان کٹھن اور مشکل حالات میں دو افراد نے ان کی ٹوٹی ہمت بندھانے اور ہر طرح سے ان کا ساتھ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک ان کے دوست اور پڑوسی برکت اللہ اور دوسرے مولوی صاحب، جنہوں نے باقاعدگی سے ان کی خیریت دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کو پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں اب احساس ہوا تھا کہ اچھی اور نیک صحبت اور قربت کی کیا اہمیت ہے۔ دل و دماغ پہ چھائی برسوں کی جہالت کی کائی دھیرے دھیرے ہٹتی جارہی تھی۔

اپنے دونوں ہی خواہوں اور دوستوں کے سامنے انہوں نے شدت سے اس خواہش کا اظہار اکثر کیا کہ وہ یوں گھر بیٹھے بیٹھے ایک محتاج اور بیمار کی سی زندگی نہیں گزارنا چاہتے بلکہ جیسے تیسے اپنے زور بازو سے محنت کر کے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے دوستی اور خیر خواہی کا حق ادا کیا اور اس کام میں ان کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مولوی صاحب نے بہت تلاش بسیار اور چھان پھٹک کے بعد ایک ایسی دکان کا بندوبست کیا جو ان کے گھر سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھی پھر اس کے ایڈوانس اور پہلے ایک سال کے کرائے کی فکر سے بھی انہیں آزاد کر دیا۔ چونکہ ان کی صحت اور حالت اب اس قابل تو نہیں تھی کہ وہ اپنا برگر کا ٹھیلا پہلے جیسا لگا سکتے اور چلا سکتے مگر یہی کام وہ دکان پر با آسانی کر سکتے تھے۔

چھوٹی سی دکان ان کے کام کے لیے کافی تھی، آگے فٹ پاتھ پر لگانے کے لیے چند بنچوں، کرسیوں اور میزوں کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا، گھر سے دکان تک پک اینڈ ڈراپ کی ذمے داری برکت اللہ صاحب نے لے لی تھی وہ ریٹائرڈ تھے، اپنی موٹر سائیکل ہر وقت گھر پر کھڑی رہتی تھی، لہٰذا ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا پھر انہوں نے سامان کاروبار سمیٹنے میں مدد کروانے کے لیے ایک لڑکے کو ان کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔ روزانہ کی دیہاڑی پر وہ لڑکا ان کے ساتھ کام کرنے پر بخوشی راضی تھا۔

ان کے اس چھوٹے سے بزنس کی ساری تیاریاں آج مکمل ہو چکی تھیں اور کل سے باقاعدہ آغاز تھا، وہ ابھی وہیں سے آرہے تھے، گھر والوں نے اتنا خوش انہیں کم ہی دیکھا تھا۔

"زیادہ محنت نہیں کیجیے گا ابو! طبیعت ذرا بھی ایسی ویسی محسوس ہو تو سب بند کر کے گھر آجایئے گا۔" رابعہ ان سے مخاطب ہوئی اس کے لہجے اور لفظوں سے فکر، تشویش اور محبت عیاں تھی وہ مسکرا دیے۔

"نہیں بیٹی! میں اپنے کاندھوں کا بوجھ اپنی بیٹیوں کے کاندھوں پہ کب تک ڈالوں۔ یہ تو میرے آنگن کی چڑیاں ہیں، آج ہیں کل اڑ جائیں گی بس جب تک اللہ ہمت دے ہمیں یہ ذمے داریاں خود اٹھاؤں گا۔" ابو یکایک سنجیدہ ہو گئے۔

امی کی خاموشی مصلحت آمیز تھی، شوہر کی صحت کی فکر انہیں تھی مگر بیٹیوں کی فکر بھی تھی پھر لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں، اب کم از کم طنز کے تیروں سے تو نجات ملے گی۔ انہوں نے کچھ طمانیت محسوس کی جلتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے صحرا میں یہ چند جان فزا جھونکے خوشگوار ہوا کے غنیمت تھے۔ دو بیٹوں کے بل بوتے پہ کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا مگر وہ تو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اور عارضی سہارے نکلے۔ بس کبھی کبھار گھر آ کر ماں باپ کو اپنی صورت دکھا جاتے' زیادہ سے زیادہ اپنے اپنے بچے کو لے آتے' بیویاں تو یہاں سے جانے کے بعد ایک دو بار ہی آئی تھیں۔

"اللہ جہاں رکھے خوش رکھے۔" ماں کا ممتا بھرا دل چاہے کتنا ہی دکھی ہو دعا ہی دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے' جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو......

دھیمی آواز میں گنگناتے ہوئے وہ بہت خوش تھی' آئینہ دیکھتی تو یوں لگتا جیسے ایک نئی رابعہ اس کے سامنے ہے' چمکتے ستاروں جیسے خواب آنکھوں میں دمک رہے تھے' چہرے پہ خوشی کے گلاب کھل رہے تھے' کل عفان سے اس کی ملاقات تھی۔

ہو سکتا ہے کہ وہ باقاعدہ پرپوز کرے' اس کا دل خوابوں کے تانے بانے بننے میں مگن تھا۔ پھول' محبت کی خوشبو اور تمہارا ساتھ' بس زندگی مکمل ہو جائے جیسے' رابعہ سوچتے سوچتے مسکرائی' عفان کے بارے میں' محبت کے بارے میں' آنے والی بہار رت کے بارے میں سوچنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے۔

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

رابعہ کے احساسات اور جذبات کو فیض نے اپنے لفظوں کی زبان دی' وہ ہولے ہولے مسکراتی رہی۔ گنگناتی رہی' زندگی بھی تو اب کچھ اسی طرح ہو چلی تھی کہ۔

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

"جلدی بیٹھو' اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟" عفان نے اپنا ہیلمٹ سر پر فٹ کیا۔

"ڈر لگ رہا ہے' کوئی دیکھ نہ لے۔" رابعہ منمنائی' محبت کے نام پہ دل نے اتنی جرات تو کرلی تھی کہ قدم یہاں تک آپہنچے' مگر ہچکچاہٹ کا شکار وہ اب بھی تھی۔

"یہ اتنا بڑا خیمہ ہے تمہارا' اس سے چہرہ ڈھانک لو' جلدی بیٹھو' ہری اپ۔ اس سے پہلے کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔" عفان نے رابعہ کی بڑی سی کالی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو میں ڈھک لوں گی پھر بھی۔" رابعہ نے اپنی نم ہتھیلیوں سے چادر میں اچھی طرح اپنا آپ ملفوف کیا' خاص طور پر چہرہ اور اس کی ہمراہی میں پیچھے بیٹھ گئی۔

اس کی باتوں اور خوابوں کے سہارے سفر کیسے کٹا' اسے پتا ہی نہیں چلا۔

پوش علاقے میں بڑی سی صاف ستھری عمارت میں اس کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ لفٹ کے ذریعے وہ با آسانی پہنچ گئے۔ فلیٹ کا لاک کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور سامنے ہی لاؤنج میں اسے لے آیا۔

"بیٹھو۔" عفان نے بے حد نفیس اور نازک ڈیزائن والی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پیچھے گھسیٹی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود فریج کی جانب بڑھ گیا۔

"آپ کی امی....؟" رابعہ نے جھجکتے ہوئے اسے دیکھا۔ فلیٹ میں بالکل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا' اس کی ہتھیلیاں پھر بھیگنے لگیں۔

"امی تو پرسوں کی فلائیٹ سے امریکہ چلی گئیں بڑے بھیا کے پاس!" اس نے کولڈ ڈرنک گلاس میں انڈیلی اور رابعہ کی طرف بڑھائی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" رابعہ چونک پڑی۔

"دھیان نہیں رہا ہو گا' یار! تم سے بات کرتا ہوں تو بس اپنا اور تمہارا خیال رہتا ہے' باقی سب بھول جاتا ہوں۔" عفان اپنا کولڈ ڈرنک کا گلاس لے کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"تم گھبرا کیوں رہی ہو' یہ پیو۔" وہ لاپروا لہجے میں مخاطب ہوا۔

"کوئی بھی نہیں ہے گھر پہ' عجیب سا لگ رہا ہے مجھے!" رابعہ نے بڑے محتاط لفظوں کا انتخاب کر کے کہا۔ عفان کا موڈ بڑی جلدی خراب بھی تو ہو جاتا تھا۔

"تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے میں کوئی بدمعاش ہوں۔" عفان کا مزاج برہم ہو گیا۔ "اگر تم جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو' میں نے دروازہ لاک نہیں کیا ہوا ہے۔" دوبارہ اسی برہم انداز میں بے مروتی کے ساتھ گویا ہوا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا' تم بلاوجہ ناراض ہو رہے ہو۔" رابعہ کمزور لہجے میں بول رہی تھی عفان کی ناراضی اور برہمی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

"اتنا اچھا موڈ تھا میرا' کچھ یادگار وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں یار! محبت میں اتنا حق تو حاصل ہے مجھے' مگر تم۔" وہ ایک لمحے کو رکا "تمہاری مڈل کلاس ذہنیت کبھی بدلے گی نہیں۔" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

رابعہ کو اس کی اس بات سے تکلیف پہنچی تھی مگر وہ ضبط کر گئی چند لمحے خاموشی کے یونہی سرک گئے۔

"اب یہ کولڈ ڈرنک تو پی لو' میں نے کچھ ملایا نہیں ہے اس میں۔" عفان نے ایک بار پھر طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟" رابعہ روہانسی ہو گئی۔

"تو' تم بھی تو اپنے آپ کو دیکھو' جب سے آئی ہو' چادر لپیٹ کر ایسے سمٹ کر بیٹھی ہو جیسے مجھ سے کوئی خطرہ ہو۔ گھر پہ کوئی نہیں ہے تو چہرے پہ بارہ بجنے لگے۔"

"میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے' جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اعتبار نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ یہاں نہ آتی۔" رابعہ نے کولڈ ڈرنک کا گلاس منہ سے لگایا۔

"میں تمہیں بہت اچھا سا لنچ کھلاتا ہوں' اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" وہ مسکرایا۔

لائننگ والی نیلے رنگ کی شرٹ اور کالی پینٹ میں اس کا دراز قد اور نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے اور شخصیت کی طرح دلکش تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا آج زیادہ ہینڈسم لگ رہا ہوں۔" عفان نے اس کی بے اختیار نظروں کی چوری پکڑلی تھی۔

"دیکھ رہی ہوں' آپ کتنے ہینڈسم ہیں' میں تو اتنی خوب صورت نہیں ہوں' آپ نے پتا نہیں کیا دیکھا مجھ میں۔" چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی رابعہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

"میں نے آپ میں کیا دیکھا؟ ابھی تک تو کچھ نہیں دیکھا' آپ اجازت دیں تو بندہ کچھ جرات کرے۔" عفان نے کچھ آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا' اس کی نظروں سے' انداز سے اور لفظوں سے بے باکی عیاں تھی' رابعہ یکایک خوف زدہ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے۔ اے سی کی خنکی کے باوجود اسے اپنی پیشانی پہ پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کیا کہتی؟ فقط بے بسی سے عفان کو دیکھ کر رہ گئی۔

"ریلیکس یار!" عفان نے میز پہ رکھا اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور دوبارہ فریج کی طرف بڑھ گیا۔

"تمہیں مشروم پسند ہیں؟" اس نے فریج سے ایک ڈبا نکالا۔

رابعہ نے اس چیز کا صرف نام ہی سنا اور پڑھا تھا' کبھی کھانے کا اتفاق تو ہوا نہیں تھا' اب وہ کیا بتاتی کہ اسے مشروم پسند ہے یا ناپسند' وہ خاموشی سے اسے دیکھے چلی گئی نہ جانے کیوں اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یا تو کچھ غلط ہو گیا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔

"ہیلو میڈم' کہاں کھو گئیں؟" عفان نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔

"میں کچھ کھاؤں گی نہیں' مجھے بھوک بھی نہیں ہے اور دیر بھی ہو رہی ہے۔" رابعہ نے سامنے کی دیوار پہ لگے خوب صورت اور نفیس کلاک میں گھومتی سوئیوں کو دیکھا۔

"بور کر رہی ہو یار! بولو' کیا چاہتی ہو؟" عفان پھر سے اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گیا۔ رابعہ کی کولڈ ڈرنک کا آدھا گلاس یونہی پڑا تھا۔

"تم نے یہ بھی پورا نہیں پیا۔" عفان نے گلاس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف اشارہ کیا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" رابعہ بے دلی سے بولی۔ یکایک ہی اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا تھا' آتے وقت وہ جتنی خوشی اور خوابوں سے بھرا دل اپنے ہمراہ لائی تھی اس وقت وہ سب کچھ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

"کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا' کچھ پینے کو دل نہیں چاہ رہا' پھر دل کیا چاہ رہا ہے سوئٹ ہارٹ!" عفان نے بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"عفان....." رابعہ نے بمشکل اسے پکارا۔

"تمہارے چہرے پہ اتنی ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟ دیکھو! میں عفان ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنے روبرو اور قریب پاکر یہ بات کیوں بھول گئیں؟" عفان پہلے والا عفان بن گیا جو وہ فون پر ہوتا تھا' اس کا لب و لہجہ بہت نرم اور محبت کی چاشنی لیے ہوئے تھا رابعہ کے ڈوبتے دل کو کچھ سہارا ملا تھا' اس نے ایک گہری سانس لے کر اس دشمنِ جان کو دیکھا جو پل پل رنگ بدل رہا تھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے عجیب و غریب ہوں گے۔"

"میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں' جتنا تم سوچ رہی ہو یا سوچ سکتی ہو۔" وہ ہنسا۔

"آپ کی امی کب تک آئیں گی؟" رابعہ نے موضوع بدلا۔

"وہ تو اب ایک سال بعد ہی آئیں گی..... میری شادی پہ اپنی بہو کے ساتھ۔" عفان کا انداز لاپروائی لیے ہوئے تھا۔

"شادی.....؟ بہو کے ساتھ؟" رابعہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"ہاں بھئی۔ شادی جو ہر شریف انسان زندگی میں ایک بار تو ضرور کرتا ہے' جو زیادہ شریف ہوتے ہیں' وہ ایک سے زیادہ بار بھی کرتے ہیں۔" عفان نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

"میں سمجھی نہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" رابعہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی گہرے اور اندھے کنویں کے کنارے کھڑی ہے۔

"ایک منٹ۔ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں' پھر تمہاری سمجھ میں شاید میری بات آجائے۔" عفان نے کھڑے ہو کر پینٹ کی جیب سے اپنا موبائل نکالا پھر دوبارہ کرسی پہ بیٹھ کر اس نے اسے آن کیا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے اپنا موبائل رابعہ کی طرف بڑھایا رابعہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی موبائل ہاتھ میں لے کر ایک نظر دیکھا ایک بہت خوب صورت اور طرحدار الٹرا ماڈرن لڑکی کی تصویر تھی۔

"یہ بٹن دھیرے سے ٹچ کرتی جاؤ' آگے اور فوٹوز آتے جائیں گے۔" عفان نے ایک بٹن کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"یہ کون ہے؟" رابعہ کی آواز اندھے کنویں کی تہہ سے آرہی تھی۔

"یہ عائزہ ہے' میری کزن اور منگیتر۔ اگلے سال ہماری شادی ہے۔" عفان بڑے اطمینان سے بتا رہا تھا۔

"میرے ساتھ کیا کھیل' کھیل رہے تھے آپ؟" اندھے کنویں کے پاتال میں گری بے دم رابعہ کی آواز بڑی مشکل سے نکلی تھی۔

"کھیل؟ کیسا کھیل؟ میں نے محبت کا دعوا کیا تھا تم سے سو اب بھی کرتا ہوں شادی کا ذکر یا وعدہ تو میں نے کبھی نہیں کیا۔" عفان کی معصومیت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔

"جب شادی نہیں کرنی تھی تو محبت کا دعوا کیسا۔" رابعہ کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بکھر بکھر کر نکل رہے تھے۔

"ایک تو تم لڑکیوں کے دماغ میں شادی کا خیال پتا نہیں کیوں ٹھوکس ٹھونس کر بھرا ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"دیکھو' محبت ایک الگ چیز ہے اور شادی ایک الگ معاملہ' شادی کے بعد تو بندہ باؤنڈ ہو کر ایک روٹین لائف گزارنے پر مجبور ہوتا ہے ایک معاشرتی

جال میں پھنس جاتا ہے' چاہے مرد ہو یا عورت' تو یہ جو شادی سے پہلے کا گولڈن پیریڈ ہوتا ہے نا' آزادی کا' اختیار کا' تو اسے میں ضائع کرنے کا قائل نہیں۔ اب مجھے کتنی لڑکیوں سے محبت ہوئی ہے مگر میں ہر ایک سے شادی تو نہیں کر سکتا نا' محبت کے نام پر ٹائم اچھا گزر جاتا ہے۔ کچھ اچھے مہنگے سے گفٹس دے دو تھوڑا مالی سپورٹ کر دو' تو تمہارے جیسی لوئر مڈل کلاس لڑکیاں اچھا خاصا تعاون کر لیتی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم یہ بات سمجھتی ہو گی۔" عفان اس کی حالت سے بے نیاز بولتا جا رہا تھا۔

"دیکھو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے یہاں' نوٹ خرچ کرو تو ایک سے ایک لڑکی مل جاتی ہے' مگر میرا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر رقم خرچ کرنی ہی ہے تو لڑکی کو دو چار اچھے لنچ اور ڈنر کراؤ۔ کچھ اچھے اچھے گفٹس دو' اس سے تھوڑی جان پہچان کرو اس طرح کچھ نہ کچھ تو محبت ڈیولپ ہو گی اور جب محبت درمیان ہو تو وقت بہت اچھا گزرتا ہے پھر وہ دو اور دو چار والا معاملہ نہیں ہوتا کہ کچھ لو اور کچھ دو' ایسے معاملات ذرا چیپ لگتے ہیں مجھے۔"

رابعہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی' اس کا ذہن بالکل خالی تھا جیسے۔ عفان کیا کہہ رہا تھا' کیوں کہہ رہا تھا' اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور جو کچھ سمجھ میں آرہا تھا اسے اس کا دل قبول کرنے سے انکاری تھا۔

"تم اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہو' دیکھو' تمہاری مرضی کے بغیر میں تمہیں ٹچ بھی نہیں کروں گا۔ زبردستی کا قائل نہیں ہوں میں' جو بھی ہو گا وہ تمہاری مرضی اور خوشی سے ہو گا تم کچھ تو کہو ہاں یا نا۔" عفان اسے غور سے دیکھتا ہوا دوبارہ بولا۔

اور رابعہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ جس کنویں کے پاتال میں گری ہے وہاں غلاظت اور گندگی کا ایک ڈھیر پہلے سے پڑا تھا جس میں وہ بری طرح لتھڑ چکی ہے۔ اسے اپنے آپ سے کراہیت نہیں بلکہ نفرت محسوس ہو رہی تھی' مستزاد ذلت اور بے بسی کا احساس۔

"کیا محبت اتنی بدصورت' اتنی بھیانک اور اتنی نفرت انگیز بھی ہوتی ہے' اس نے تو ہمیشہ ڈراموں' فلموں اور کہانیوں میں محبت کو بہت خوب صورت، بہت طاقت ور اور بہت حسین دیکھا' سنا اور پڑھا تھا' پھر یہ سب کیا تھا؟ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اور اس کے کان جو کچھ سن رہے تھے' وہ کیا ہے؟

"تم تو گم سم بدھ بن کر بیٹھ گئی ہو' اپنا بھی ٹائم ویسٹ کر رہی ہو اور میرا بھی۔" عفان اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "اگر تم چاہو تو اپنی مرضی کا اماؤنٹ بتا سکتی ہو۔"

اس بار اس نے واضح لفظوں میں اسے پیشکش کی۔ رابعہ کو لگا' جیسے وہ اس کے منہ میں غلاظت ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہو' اسے ابکائی آنے لگی' وہ بے اختیار منہ پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" عفان بھی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کچھ کہے سنے اور دیکھے بغیر سیدھی دروازے کی طرف بڑھتی ہی چلی گئی۔ باہر کاریڈور میں لفٹ کا انتظار کیے بغیر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور اندھادھند اترتی چلی گئی۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی آنکھیں تھیں کہ آنسوؤں سے لبالب بھرے جا رہی تھیں۔ آنکھیں اور چہرہ اچھی طرح صاف کر کے وہ بلڈنگ سے باہر مین روڈ پر آئی اور آہستہ آہستہ قدموں سے ایک طرف چلتی چلی گئی۔ چاروں سمت چار سڑکوں پہ ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور اسے اپنے گھر جانے کے لیے کس روٹ پہ کھڑے ہو کر کون سی گاڑی میں بیٹھنا ہے' وہ غائب دماغی کے عالم میں کچھ دیر یونہی چلتی رہی اور پھر اچانک اس پہ ایک روح فرسا حقیقت کا انکشاف ہوا۔

اس کا ہینڈ بیگ عفان کے فلیٹ میں میز پر ہی رکھا رہ گیا تھا جس میں اس کا موبائل اور کچھ نقدی تھی۔ وہ اس وقت بالکل خالی ہاتھ گاڑیوں اور انسانوں کے ہجوم میں تنہا تھی۔ رابعہ کے بڑھتے قدم خود بخود ہی تھم

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئے۔ کانپتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ وہ سڑک کنارے کھڑی تھی۔

"یا اللہ۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور تب ہی وہ اس کے قریب آکر رکا۔

"شکر خدا کا تم مل گئیں۔"

ایک مانوس آواز سن کر رابعہ نے اپنے سامنے دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ دنیا جہاں کی حیرت اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک طویل اور گرما گرم بحث کے بعد جب یکایک ہی چُپ ہو گئے، جیسے کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔ خاموشی کا یہ راج کچھ منٹ رہا پھر پھپھو کی بڑی بیٹی نے دوبارہ تازہ دم ہو کر بحث کا آغاز کیا۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ لو ماموں! آج کل اچھی بھلی کنواری لڑکیوں کو کوئی نہیں پوچھ رہا تو تمہاری طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا؟" بولتے بولتے اس کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

"اللہ مالک ہے، اپنی بیٹی ایک نشے باز کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے، میرے گھر پر رہے، کم سے کم یہاں اس کی زندگی جہنم تو نہیں بنے گی۔" ابو ہر صورت اپنے موقف کا دفاع کر رہے تھے۔

"یوں کہو، بیٹی کی کمائی کا چسکا لگ گیا۔" پھپھو نے ایک بار پھر طعنہ مارا۔

"ہم نے اسے کمانے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے اسکول میں پڑھاتی ہے اور یہاں اتنی کمائی نہیں ہے، جس کا کسی کو چسکا لگ سکے، اس کی مرضی چاہے تو پڑھائے چاہے تو نہ پڑھائے۔ ہماری طرف سے نہ کوئی پابندی ہے نہ روک ٹوک۔" ابو نے ترنت انہیں جواب دیا۔

"مگر ابو، یہ بھی تو سوچو، پہلے ہی اتنی بے عزتی ہو چکی ہے ہماری۔ گھر کی لڑکیاں باہر نکل کر نوکری کر رہی ہیں، اب تم طلاق کا شوشہ چھوڑ رہے ہو، کتنی بدنامی کرواؤ گے ہماری۔" بڑا بیٹا اپنی ساس اور سالے کا حمایتی بن آیا تھا اور مسلسل کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔

"میری جو بھی بے عزتی اور بدنامی ہوئی ہے میرے بیٹوں نے کروائی ہے، بیٹیوں نے نہیں اور [...] اس معاملے میں اپنی چونچ بند رکھیں تو بہتر ہو گا۔" [...] نے اپنا روئے سخن بیٹے کی طرف کیا تو وہ گھبرا [...] ہوئے تھا۔

"ایسے تو میں اپنی بہو کو نہیں چھوڑوں گی، پنچایت بٹھاؤں گی خاندان برادری کی، اب تو یہ فیصلہ وہیں ہو گا، وہی لوگ پتا چلائیں گے کہ بیٹی کے لیے کوئی دوسرا باپ نے ڈھونڈ کے رکھا ہے یا بیٹی نے خود ڈھونڈ لیا ہے جو طلاق کی اتنی جلدی ہو رہی ہے۔" پھپھو [...] لفظوں میں دھمکی دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

امی اور سب لڑکیوں کے چہرے فق ہو گئے، پنچایت کا معاملہ نازک تھا اگر فیصلہ ان کے خلاف آیا [...] انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو سب خاندان [...] برادری والوں کی طرف سے ان کا بائیکاٹ ہو جاتا، عرف عام میں حقہ پانی بند کرنا کہلاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان سے ملنا جلنا، ان کے گھرانے میں رشتے ناتے کرنا سب ختم ہو جاتا۔

"اب کیا ہو گا ابو!" سمیرا اور حمیرا باپ کے قریب آن بیٹھیں۔

"اللہ مالک ہے، تم لوگ پریشان مت ہو۔" انہوں نے دونوں کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر بڑی بردباری [...] تحمل سے جواب دیا۔ ثانیہ بڑی ہمت کر کے ان [...] پاس آئی۔

"آپ رہنے دیں۔ جو میرے نصیب میں ہو گا [...] بھگت لوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو، میری زندگی آسان کرنے کے چکر میں میری چھوٹی بہنوں کی زندگی خراب ہو جائے۔" ثانیہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ان [...] بات کی۔

دراصل ابو کی ایک چچا زاد بہن نے سائرہ اور [...] دونوں کے لیے اپنے بیٹوں کے رشتے کا عندیہ دیا [...] لڑکے اور فیملی کافی معقول تھی، پھر سب سے بڑی بات کہ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ تھے جو ان کے خاندان میں ذرا نایاب ہی تھے۔ اگر یہ رشتے ہو جاتے تو ان کے لیے بہت خوشی کی بات ہوتی مگر پھوپھی کی پنچایت والی دھمکی کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی ساری خوشیاں کھٹائی میں پڑنے والی ہوں۔

"ارے میری بچی، تو فکر مت کر، میرے ہوتے ہوئے تم میں سے کسی کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ابو کا لب و لہجہ شفقت لیے ہوئے بڑا مضبوط اور توانا تھا۔ کچھ عرصے سے ان کا لب و لہجہ بیوی اور بیٹیوں کے معاملے میں بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک غیر محسوس سی شفقت اور ملائمت ان کے لہجے میں سمٹ آئی تھی اور پھر ان کے خیالات، باتیں سب کچھ بہت حد تک پہلے سے مختلف تھا۔

"ہو سکتا ہے، میرے نصیب میں یہی لکھا ہو ورنہ نکاح کی نوبت کیوں آتی۔" ثانیہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تو اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"وہ میری غلطی تھی، میرے غلط فیصلے کا بوجھ میری اولاد کیوں اٹھائے اور پھر....." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر نیچے جھکا لیا اور دھیمے دھیمے بولنا شروع ہوئے، بیوی اور بیٹیاں انہیں حیرت سے دیکھ اور سن رہی تھیں۔

"تم لوگ اپنے باپ کو ظالم، جابر اور تنگ دل خیال کرتے ہو گے اور ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی ہو مگر پیاری بیٹیو! میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی، نہ ہی تمہیں حقیر خیال کیا، بس میں ڈر گیا تھا، تم لوگوں کی تعداد سے، اس دنیا سے، اپنے خاندان اور برادری کے رسم و رواج سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ بچپن سے ہی بچیوں کے لیے بوجھ کا لفظ سنتا چلا آیا تھا۔ تم لوگ ایک ایک کر کے دنیا میں آئیں تو خود کو اس بوجھ تلے محسوس کر کے اور بھی کمزور ہو گیا اس کمزوری نے جلد بازی کی راہ دکھائی اور بس جیسے تیسے ایک ایک کر کے اپنے طور پر اس بوجھ کو اپنے کاندھوں سے اتارنے لگا، تمہاری زندگیوں میں آنسو آئے یا ہنسی، اسے مقدر کے لکھے پر چھوڑ دیا۔ گھر کی چار دیواری میں اس لیے قید رکھا کہ باہر کی دنیا سے تمہیں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔" وہ ایک لمحے کو رکے، سناٹا ایسا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز آجائے۔

"بیٹے چھوڑ گئے، بیماری آئی تو احساس ہوا کہ بیٹیوں کو رحمت کا نام یونہی نہیں دیا گیا، اگر میری بیٹیاں نہ ہوتیں تو میں کسی سڑک، فٹ پاتھ یا خیراتی ادارے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ہوتا۔ میری وجہ سے تم سب کی زندگی میں جو مشکلات آئی ہیں ان کے لیے مجھے معاف کر دو۔" بمشکل بولے تو ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر رابعہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس رونے میں پچھتاوے اور پشیمانی کے آنسو بھی شامل تھے۔

"آپ نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ آپ نے ہمیں عزت دی، تحفظ دیا، گھر کی چار دیواری میں قید نہیں بلکہ محفوظ رکھا۔ آپ نے ہر طرح سے ہمارا خیال رکھا۔ آپ کی محبت کا بس انداز جدا تھا اگر آپ کو ہم سے محبت نہ ہوتی تو سترہ سترہ گھنٹے موسموں کی سختیاں برداشت کر کے ہمارے لیے محنت مشقت نہ کرتے، ہمارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور دوسری ضروریات کا دھیان نہ رکھتے۔" اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جو باپ اپنی بیٹیوں سے محبت کرتا ہو، اسے ہی پتا ہوتا ہے کہ اس کی کس بیٹی کو گلاب جامن پسند ہیں، کون سی بیٹی کو گنے کا رس اچھا لگتا ہے، سموسے اور آلو کی چاٹ کسے بھاتی ہے اور کون شہتوت اور فالسے کی دیوانی ہے، ہم تو آپ کی ہر محبت، شفقت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے رہے، کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں آپ جیسا باپ ملا اور ابو جی ہمیں اپنے نصیب کے لیے نہ آپ سے کوئی شکایت ہے نہ اللہ سے کوئی شکوہ۔" سمیرا آگے بڑھی اور ان کے پاس بیٹھ گئی، اس کی آواز اور آنکھیں دونوں بھیگی ہوئی تھیں۔

"ماں، باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے، آپ نے جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی فیصلے ہمارے لیے کیے' وہ ہماری بھلائی اور خوشی کے لیے ہی کیے' آگے ہمارا مقدر اور اللہ کی مرضی' میں بھی اپنے گھر خوش ہوں ابو! شروع شروع میں مجھے آپ سے اور سب سے، بہت شکوے شکایات تھے مگر اب کسی سے کوئی شکایت نہیں اور آپ سے تو بالکل نہیں' اس عمر اور اس بیماری کے ساتھ آپ اپنی بیٹیوں کے لیے محنت کر رہے ہیں' آپ بہت عظیم ہیں ابو! ہمیں آپ پر بہت فخر ہے۔" فروا آگے بڑھ کر بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

"تمہاری ماں کو تو ضرور ہی مجھ سے شکایتیں ہوں گی۔" ابو آج اپنے احتساب کے موڈ میں تھے۔

"مجھے بھلا کیا شکایت ہوگی آپ سے۔ ساری عمر کما کر کھلایا آپ نے' ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اولاد کا خیال کیا' ایک عورت کو اور کیا چاہیے!" امی کا لہجہ سچائی لیے ہوئے تھا۔

"اب یہ بتائیے' ثانیہ کے معاملے کا کیا کرنا ہے؟" سب سے بڑی حمیرا نے سوال کر کے موضوع بدلا اور اس جذباتی سچویشن سے سب کو نکالا۔

"جو میں نے کہا ہے وہی کرنا ہے۔ میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹی کو کنویں میں نہیں دھکیل سکتا۔" ابو نے دو ٹوک اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

"ایک محبت ہی تو کی تھی' وہ بھی بہت احتیاط' بہت خیال کے ساتھ' پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ خوابوں کے تتلی کے پیچھے دوڑنے کا عمل اتنا بھیانک تجربہ نکلا کہ سیدھی غلاظت کے ڈھیر میں جا گری' احساس ذلت پیچھا نہیں چھوڑتا۔ رواں رواں جیسے کسی ان دیکھی آگ میں جل رہا ہے' اذیت ہی اذیت جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی سامان نہیں' آنسو ہی آنسو درد ہی درد' کیسی ہوتی ہے محبت اور کیسی ہو جاتی ہے زندگی۔

کیا محبت کے خوش رنگ پھول فقط کہانیوں میں ہی ملتے ہیں؟ اصل زندگی میں نہیں تو پھر' تو پھر یہ لفظ' یہ کہانیاں' ہمیں خواب دیکھنا کیوں سکھاتے ہیں۔ دل دھڑکنا کیوں سکھاتے ہیں۔

یا پھر شاید محبت ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں وہ بہار سے خوشنما پھولوں جیسے لوگ اور ہی ہوتے جو محبت کرتے ہیں' جن سے محبت کی جاتی ہے۔ خزاں رسیدہ خشک پتوں جیسے لوگ ہیں' جن کے میں فقط قدموں تلے چرمرانا لکھا ہے۔

اچھا اگر ایسا ہے تو یونہی سہی' اب ان آنکھوں پتھر اور اس دل کو بنجر کر لیں گے' اب نہ ان پتھر آنکھوں میں کوئی آنسو ہوگا نہ کوئی خواب۔ اب اس دل میں چاہت کا کوئی پھول کھلے گا نہ دھڑکن کا کوئی گیت گا۔

بس زندگی خاموش ہے تو خاموش ہی سہی۔
زندگی تنہا ہے تو تنہا ہی سہی۔"

رابعہ نے ڈائری بند کی اور اپنی آنکھوں کو بے دردی سے مسل کر خشک کر ڈالا' جس میں بے اختیار ہی آنسو امڈے چلے آرہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"شکر ہے بی بی! آپ مل گئیں' پتا بھی ہے کب سے خوار ہو رہا ہوں میں' آپ کو ڈھونڈنے کے چکر میں۔" وہ اپنے ازلی نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

"آپ....؟" رابعہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں ابھی تک آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر میلی چادر کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"چلیے بیٹھیے' میں آپ کو اسٹاپ پہ چھوڑ دیتا ہوں بلکہ آپ کے روٹ کی ویگن میں بٹھا دوں گا۔ یہاں سے بس تھوڑی ہی دور ہے وہ روٹ۔"

"نہیں۔" رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں کا کیا مطلب؟" وہ چونکا۔ "گھر نہیں جانا؟" اس نے سوال کیا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں مر جاؤں۔" رابعہ کی شفاف آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"اس سے کیا ہوگا؟" اس نے بڑے اطمینان سے سوال کیا۔ رابعہ خاموش رہی۔

"رابعہ بی بی! میں آپ کو بہت سمجھ دار خیال کرتا تھا مگر آپ میں تھوڑی سی بے وقوفی ابھی بھی ہے۔ ایک لیکچر میں آپ کو دوں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو آپ فی الحال گھر پہنچنے کی کریں۔"

"خضر بھائی کو کیسے پتا کہ میں یہاں ہوں اور کیا وہ عفان کے اور میرے بارے میں جانتے ہیں؟ یہ مجھے ڈھونڈ کیوں رہے تھے؟" رابعہ کے ذہن میں ایک کے بعد ایک سوال آرہے تھے مگر وہ کسی بت کی مانند ساکت اور خاموش کھڑی تھی۔

"یہ سوچ بچار گھر جا کر بھی ہو سکتی ہے۔" رابعہ نے غائب دماغی سے اسے دیکھا۔

"جلدی کریں' شام ہو جائے گی تو رش بڑھ جائے گا۔ گھر تک پہنچنے میں ٹریفک جام ملے گا آپ کو۔" خضر اب تک بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رابعہ چند لمحے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی پھر اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ بمشکل پانچ منٹ بعد اس نے ایک سڑک کنارے بائیک روک دی۔ رابعہ اتر کر کھڑی ہو گئی۔

"یہاں سے آپ کے گھر جانے والی ویگن مل جائے گی۔" خضر نے اسے ہدایت کی۔

"میرا پرس' موبائل۔" رابعہ کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔

"کل دونوں چیزیں مل جائیں گی ان شاء اللہ۔ آپ چھٹی نہیں کیجیے گا' نہ ہی جاب چھوڑنے کی ضرورت ہے' جس طرح زندگی چل رہی تھی' اسی طرح چلائیے۔"

"زندگی؟ زندگی ہے کہاں اور اگر ہو بھی تو پہلے جیسی کہاں؟ مجھے تو خود اپنے آپ کا سامنا کرنے میں شرم آ رہی ہے' دنیا والوں کا سامنا کیسے کروں گی؟" رابعہ کا دل پھر گھبرانے لگا۔

"یہ رکھ لیں' کرائے کے لیے!" خضر نے اپنا والٹ نکال کر دو' تین لال نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے خاموشی سے وہ نوٹ تھام لیے خضر اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک وہ ویگن میں سوار نہیں ہو گئی۔

اسے نہیں معلوم' وہ گھر تک کیسے پہنچی' بس ایک آگ سی جسم و جان میں لگی ہوئی تھی' جس کی اذیت جھیلتے ہوئے وہ گھر پہنچ گئی' اندر کی آگ پھیلتے پھیلتے باہر تک آ گئی تھی۔ رات ہونے تک اس کا پورا جسم شدید بخار میں جھلس رہا تھا۔ سر تھا کہ الگ درد سے پھٹا جا رہا تھا' اس بخار اور سر درد نے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لاج رکھ لی۔

بمشکل ایک بسکٹ کھا کر اس نے چائے کے ساتھ ٹیبلیٹ نگلی اور پھر لیٹ گئی۔ اگلے دن شام میں اس کی ساتھی ورکر عالیہ آنٹی اس سے ملنے آ گئی تھیں' ان کا گھر یہاں سے بس ایک اسٹاپ آگے تھا۔

"مجھے پتا چلا تم بیمار ہو' میں نے سوچا دیکھ آؤں۔" انہوں نے آگے بڑھ کر رابعہ کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ جو انہیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ امی مغرب کی نماز پڑھنے اٹھ گئی تھیں۔

"رابعہ! یہ خضر بیٹے نے آپ کی ایک امانت دی ہے آپ پرسوں فیکٹری میں بھول گئی تھیں۔" انہوں نے ایک پیکٹ رابعہ کو دیا۔

"خضر بھائی کو میرا شکریہ کہیے گا۔" رابعہ نے ایک جبری مگر پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

"میں تو کہہ دوں گی مگر تم خود اپنے منہ سے کہو گی تو اچھا لگے گا۔ اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور فیکٹری آنا شروع کر دو۔" انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ امی نماز پڑھ کر آئیں تو کچھ دیر اور امی سے باتیں کر کے وہ رخصت ہو گئیں' جاتے جاتے وہ اس گھرانے کو ایک خوش خبری دے گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ناکامی' کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے مگر اس کے لیے جو جدوجہد کرنا جانتا ہو اور ناامیدی کے لفظ سے ناآشنا ہو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ناامید نہیں ہونا چاہتی مگر کیا کروں، زندگی جیسے کوئی بند گلی ہے، راستہ ختم، قدم تھم گئے، پلٹنا بھی ممکن نہیں، آگے بڑھنا بھی مشکل، کیا کریں، کہاں جائیں۔ ابو نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ میٹرک تک پڑھائی بہت ہے۔

کالج جانا کوئی ضروری نہیں تو میرا یہ خواب خواب ہی رہے گا۔

ہاں مگر ایک چھوٹی سی کھڑکی امید کی کھلی ہے۔ امی نے کہا ہے کہ وہ میرے پرائیویٹ پڑھنے کے لیے ابو کو راضی کر لیں گی۔ اچھا تو جب سارے سہارے ایک ایک کر کے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جائیں تو اللہ کا سہارا اور آسرا تو ہمارے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس سے خوب صورت احساس بھلا اور کیا ہوگا۔"

"محبت کی تتلی ہر ایک کے ہاتھ میں نہیں آتی مگر جس کی ہتھیلیوں میں قید ہو جائے، وہ سراپا دلکش رنگوں میں سج جاتا ہے۔ میری ہتھیلیاں اس تتلی کے حصول کے لیے پھیلی ہیں۔"

خوشی، غمی، اداسی، خواب، آنسو، مسکراہٹیں، ہر صفحے پہ کچھ نہ کچھ بکھرا تھا خضر پڑھتا جا رہا تھا اور کبھی مسکرا دیتا، کبھی سنجیدہ ہو جاتا۔

کسی کے نجی احساسات اور خیالات پڑھنے کی غیر اخلاقی حرکت وہ کبھی نہ کرتا مگر بس ایک خیال، بلکہ ایک خواہش نے اس سے یہ ڈائری پڑھوالی تھی۔

☼ ☼ ☼

اپنے پرس کے ساتھ اپنی ڈائری دیکھ کر وہ حیران اور پھر پریشان ہو گئی۔ گھر کے ہر کونے کھدرے میں اس ڈائری کو ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تو فاتحہ پڑھ کر دوسری ڈائری بنالی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید غلطی سے وہ ڈائری ردی میں بک گئی ہے۔ مگر یہ خضر بھائی کے پاس کیسے آئی؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی مگر کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔

چار دن بعد بخار کا زور کچھ ٹوٹا تھا۔ مگر کمزوری اور نقاہت ابھی باقی تھی۔ امی تو منع کر رہی تھیں کہ اب وہ اپنی نوکری مزید جاری نہ رکھے بلکہ چھوڑ دے۔

"اب تو تمہارے ابو کام کر ہی رہے ہیں، ضرورت ہے بلاوجہ خود کو ہلکان کرنے کی، دیکھو تو چار دن میں کیسا ذرا سا منہ نکل آیا!" وہ فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے چار پانچ دن نہیں، بلکہ چار پانچ صدیاں گزر گئی ہوں۔ جسم و جان ایسی تھکن اور اذیت سے چور تھے جیسے بہت ہی طویل سفر آبلہ پا گیا ہو۔ اپنا آپ اندر سے خالی خالی لگ رہا تھا، جسے خوابوں کے ساتھ دل بھی کسی نے نوچ کر پھینک دیا ہو، جیسے خواہشوں کے ساتھ روح بھی کسی نے کھینچ کر نکال لی ہو۔

☼ ☼ ☼

پھوپھی نے اپنے کہنے کے مطابق خاندان اور برادری کے بڑوں کی پنچایت بٹھائی تھی، مگر پنچوں کا فیصلہ ان کے خلاف تھا، سب کے ہی علم میں تھا کہ ان کے بیٹے نے دوبارہ نشہ شروع کر دیا ہے اور نشے کی لت میں گرفتار شخص پھر کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں کون اپنی بیٹی کا ہاتھ دیتا؟ پھوپھی اور ان کے گھر والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

برادری کے بڑوں نے فیصلہ سنا کر اسی وقت طلاق کی کارروائی بھی مکمل کروالی تھی۔ ثانیہ اور گھر والے سجدہ شکر بجا لائے تھے، انہوں نے اللہ سے مدد مانگی تھی اور اللہ نے ایسی مدد کی اور ایسے راستے کھولے کہ وہ خود بھی حیران رہ گئے۔ اس دن فیکٹری سے جو آنٹی آئی تھیں، وہ اپنے بھانجے کے لیے لڑکی کی تلاش میں تھیں، انہیں خضر نے ثانیہ کو دیکھنے بھیجا تھا۔ انہوں نے دوبارہ آنے کا عندیہ دیا تھا، ان کے بہن بہنوئی فوت ہو چکے تھے بھانجے کو انہوں نے ہی پالا پوسا تھا۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ چھٹی کے دن آنے والی تھیں۔

"خضر بھائی کو ثانیہ کے بارے میں یا ہمارے گھر کے حالات کے بارے میں کیسے پتا چلا؟" رابعہ سوچ سوچ کر پریشان تھی۔

☼ ☼ ☼

محبت جس کی تلاش میں، جس کی چاہ میں دنیا کا ہر انسان رہتا ہے، عجیب و غریب جذبہ ہے، جس میں بہک کر انسان کبھی شیطان کا روپ دھار کر پستیوں میں گر جاتا ہے اور کبھی۔ اس اعلیٰ و ارفع جذبے کو پاکیزگی اور خلوص نیت کے ساتھ اپنے دل اور زندگی میں شامل کرلے تو فرشتوں سے بھی افضل ہو کر قرب الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔

محبت کے کئی روپ، کئی شکلیں ہیں، کئی انداز کئی طریقے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے دنیا بھر سمیت ہمارے معاشرے میں بھی محبت کے ایک ہی روپ کو زیادہ پورٹریٹ کیا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو کہ الیکٹرونک میڈیا اسی روپ کو گلیمرائز کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

محبت کے ایک روپ سے مجھے میرے والدین نے روشناس کرایا۔ بہت بچپن کا یاد نہیں، مگر جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ امی، بابا کسی کی تعلیم مکمل کرنے میں مدد کر رہے ہیں کسی گھرانے کی کفالت کر رہے ہیں، کسی کی شادی کا مسئلہ ہے۔ روزگار کا، گھریلو لڑائی جھگڑے ہیں یا کچھ اور معاملات، وہ بساط بھر ہر ایک کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

بابا کہا کرتے تھے، مخلوق خدا کے کام آنا عبادت ہے یہی اصل محبت ہے اور خدا کی محبت پانے کا ذریعہ بھی جیسے جیسے ہم بہن بھائی بڑے ہوتے گئے اس رنگ میں رنگتے گئے جس میں ہمارے والدین رنگے ہوئے تھے۔

یہ راہ آسان نہیں، بہت مشکلات بھی آتی ہیں اور مصائب بھی، کبھی کوئی نیکی الٹی ایسے اپنے گلے پڑ جاتی ہے کہ ہم خود گناہ گار بن جاتے ہیں، مگر بقول امی نیت صاف، منزل آسان، تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہر امتحان سے سرخرو کیا۔ جاب شروع کی تو اپنا کام یہاں بھی جاری رکھا، دامے، درمے، سخنے، جس کے لیے جتنا ہو سکا کیا اور اس سفر میں میں اکیلا نہیں بلکہ مختلف حوالوں سے کئی مخیر حضرات کا تعاون بھی شامل ہے۔

میں جس گارمنٹ فیکٹری میں ہوں، یہاں بھی

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of
5 Painting Books
in English

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹسٹ
برش پکڑنے سے، مکمل پینٹنگ تک آپ بن سکتے
ہیں ایک مکمل آرٹسٹ

اب پینٹنگ سیکھنا بہت آسان ایک ایسی کتاب
جس میں پینٹنگ سے متعلق ساری معلومات

Art With You
شائع ہوگئی ہے

قیمت -/350 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگوں کے وہی مسائل ہیں، مگر لڑکیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے، مجبوری میں گھر سے نکل کر کام کرنے والی ہر لڑکی کرپٹ نہیں ہوتی مگر ہر لڑکی کی آنکھوں میں کچھ خواب اور دل میں معصوم سی تمنائیں ہوتی ضرور ہیں۔ ان بھولی بھالی چڑیوں کی سادگی اور معصومیت کا شکار کرنے والے بہت سے شکاری تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی چڑیا ان کے جال میں پھنس جائے اور محبت کا جال ایک ایسا جال ہے، جو عموماً" لڑکیوں کو فریب خوردہ کر دیتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس جال کی طرف بڑھی چلی آتی ہیں۔

بے شک محبت کا نام لینے والا یا محبت کرنے والا ہر شخص شکاری نہیں ہوتا مگر پھر بھی عفان جیسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے مذموم مقاصد اور اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے محبت کے نام پہ لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں، ان کا شکار کرتے ہیں انہیں برباد کرتے ہیں یہاں معصوم لڑکیوں کو عفان اور اس جیسے لڑکوں سے بچانا، میری ترجیح تھی۔ اس کام میں یہیں نوکری کرنے والی دو تین خواتین میری مددگار تھیں۔

رابعہ کا معاملہ جدا تھا۔ عفان تو خیر اپنے کھیل میں ماہر کھلاڑی تھا مگر رابعہ اتنی محتاط رہی کہ فریدہ آنٹی تک کو اپنا رازدار نہ بنایا جن کے وہ بہت قریب تھی اور اپنی ہر بات شیئر کرتی تھی۔ بہت بعد میں جا کر مجھے علم ہوا کہ عفان آج کل جس نئے پرندے کو جال میں پھنسا رہا ہے وہ رابعہ ہے۔ خیر رابعہ بچ گئی مگر اسے جو ذہنی دھچکا لگا ہے اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔

رابعہ کو میں بچپن سے جانتا ہوں، ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ پھر ہم وہاں سے شفٹ کر گئے رابعہ کو میں بچپن سے دیکھتا چلا آیا ہوں مگر دل میں کبھی کسی خاص جذبے نے سر نہیں اٹھایا۔ ہاں مگر جب بھی کبھی باتوں باتوں میں اس کی شخصیت اور کردار کے روشن پہلو سامنے آتے، دل میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر بھی آتا۔

جو لڑکی پورا موسم گرما لان کے دو جوڑوں میں نکال دے تاکہ اپنے بیمار باپ کو پابندی سے دوائیاں فراہم کر سکے، گھر کی معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی ضروریات پس پشت ڈال دے۔ ایسی لڑکی یقیناً محبت اور ایثار کے جذبوں سے گندھی ہوئی ہوگی۔

سادگی اور سچائی، خلوص اور ایثار دل میں خود ہی جگہ بنا لیتے ہیں پتا نہیں کب اور کیسے وہ میرے دل میں اتر گئی۔ احساس ہوا تو تب جب اسے سوچنا اچھا لگنے لگا۔ جب بھی اس پر نظر پڑتی، ایک بے حد نرم اور دلنشیں سا احساس دل کو چھو لیتا اور یہ دل کیا کہوں واقعی بڑا بے ایمان ہوتا ہے اچھا خیر، یہاں تک تو معاملہ شاید ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی تھی۔ بڑا صاف اور سیدھا معاملہ لگا مجھے، لڑکی اچھی ہے۔ اچھی لگی۔ بڑوں تک بات پہنچا دو اور بات بڑوں تک پہنچانے ہی والا تھا، وہ ایک گرم سی دوپہر تھی، بے زار کر دینے والی خشک اور بے مہر، جب میرے رازدار اور سب سے اچھے دوست عامر کی کال آئی۔

"یار! عفان کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا ہے میں نے بائیک پہ جا رہی تھی اس کے ساتھ۔" اس نے بغیر کسی تمہید کے اطلاع دی۔

"کون؟" میرے منہ سے بے اختیار سوال نکلا۔

"مجھے لگا کہ وہ رابعہ ہے۔" عامر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"رابعہ؟" مجھے اک دم شاک لگا مجھے بالکل بھی تو نہیں تھا نہ ہی امید کہ اس بار عفان کا ٹارگٹ رابعہ ہے۔ میری رابعہ جو دھیرے دھیرے مجھے کتنی عزیز ہو گئی تھی۔

"اے، بے وقوف لڑکی ....." میں سر تھام کر رہ گیا۔ پھر میں نے بغیر وقت ضائع کیے، عفان کے فلیٹ کی طرف موٹر سائیکل دوڑا دی۔ راستے میں میں نے عفان کو کئی بار ٹرائی کیا مگر اس کا سیل آف ملا۔ بہت دیر بعد جب میں اس کے فلیٹ کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دور سے ہی نظر آ گئی، سڑک کنارے تنہا، ایک ایسے تھکے ہارے لٹے پٹے مسافر کی طرح، جس کا سارا زاد راہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹ چکا ہو اور وہ خوف زدہ اکیلا جنگل کے بیچوں بیچ کھڑا سوچ رہا ہو کہ اب کیا کرے۔

☼ ☼ ☼

وہ خزاں کی ایک اداس اداس سی شام تھی جب خضر کی امی اور بھابھی رابعہ کے گھر آئیں اور ان کے جانے کے بعد وہ خزاں آلود شام یکایک بہار کی گلابی، سہانی سی شام میں بدل گئی تھی۔

کوئی مرد اتنا اعلا ظرف کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے بے اختیار سوچا اور یہی سوال اس نے خضر سے کیا تھا۔

"میں فرشتہ نہیں ہوں رابعہ! مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ گناہ گار وہ ہے، جو اپنے گناہوں پہ اصرار کرے گناہ پہ نادم ہو کر اسے چھوڑنے والا گناہ گار نہیں ہوتا۔" خضر نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"کبھی طعنہ تو نہیں دیں گے؟" رابعہ کا خوف ٹھیک سے دور نہیں ہوا تھا۔

"ایک شے ہوتی ہے یقین، ایک چیز ہوتا ہے اعتبار۔ خاتون! اپنے دل اور زندگی میں انہیں مرکزی جگہ دے دیں۔ ہر قسم کے شکوک و شبہات اور خدشات کو دل سے نکال دیں۔ جگہ خالی ہوگی تو یقین اور اعتبار جھٹ پٹ آ کر براجمان ہو جائیں گے۔" خضر تلقین کر رہا تھا وہ بے اختیار مسکرا اٹھی۔

"آپ نصیحتیں بہت کرتے ہیں بزرگوں کی طرح۔"

"جی نہیں۔ میں ڈائیلاگز بھی بول سکتا ہوں۔ نوجوانوں کی طرح۔" خضر نے روانی میں بالکل اس کی ٹون میں کہا۔ وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

"اچھا پھر جلدی سے بتاؤ، ہنی مون کے لیے کہاں جانا پسند کرو گی؟"

"آپ اور ایسی باتیں!" رابعہ کا چہرہ گلابی ہونے لگا تھا۔

"کچھ مہربانوں نے مولوی صاحب کا لقب ضرور دیا ہوا ہے مگر زاہد خشک نہیں ہوں۔ سینے میں ایک عدد دل اور منہ میں ایک عدد زبان ہم بھی رکھتے ہیں۔" خضر نے جتایا مگر آواز اور انداز دونوں ہی شگفتہ تھے۔

"اچھا، پھر بعد میں بات کریں گے۔" رابعہ نے اس کے تیور دیکھ کر گھبرا کر بلکہ شرما کر فون بند کرنا چاہا۔

"بعد میں کب؟ شادی کے بعد؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے معزز خاتون، چھ ماہ انتظار کریں گے۔" خضر شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے جھٹ سے مان گیا۔

"یہ تو میں نے اپنی تسلی کے لیے فون کیا تھا آپ کو۔" رابعہ نے وضاحت کی۔

"ہو گئی تسلی؟"

"جی۔"

"ایک گزارش کروں؟"

"جی؟"

"اپنے یہ "جی" بچا کر رکھیں، قاضی صاحب کے سامنے کام آئیں گے رابعہ! تم میرے لیے بہت اہم بہت خاص ہو۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" اچانک خضر مکمل سنجیدگی سے بولا تھا۔

"مجھے اعتبار ہے آپ پر بھی اور آپ کی باتوں پر بھی۔" رابعہ نے بالکل سچے دل سے کہا تھا۔ اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"اتنی محبت، اتنی عزت، میں بھلا اس قابل کہاں تھی۔"

اسے رونا آ رہا تھا۔ اپنے رب کی بے پایاں رحمت پر۔ اس کی توقع سے، اس کی سوچ سے اس کی دعاؤں سے کہیں زیادہ اسے مل رہا تھا۔

رابعہ رو رہی تھی مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ تشکر کے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمیرا عثمان گل

دوسرا رشتہ

وہ اپنا آخری پیریڈ لے کر کلاس سے باہر نکلی ہی تھیں جب ان کا سیل بج اٹھا۔ معیز کا نمبر دیکھ کر پہلے ان کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے' پھر انتہائی کوفت سے انہوں نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری جانب سے حسب معمول مدعا بیان کیا گیا تھا۔

"آپا! گھر آجاؤ۔ صبح سے بھوکا بیٹھا ہوں' سارے کام ادھورے پڑے ہیں۔ وہ لارڈ صاحب تو تک سک سے تیار ہو کر نکل گئے۔" یہ اشارہ ولید کی سمت تھا۔ مہرالنساء کا سر گھومنے لگا۔ ابھی تو وہ آخری پیریڈ میں بیٹھی سوچ رہی تھیں' برتن کب دھونے ہیں' مشین کب لگانی ہے' پھر گھر کی صفائی' کھانا پکانا' ابھی تو ان کے اپنے سارے کام جوں کے توں پڑے ہوئے تھے کجا کہ وہ پہلے ان کا کام نبٹانے جاتیں۔

اور پھر یہ تو روز کا مسئلہ تھا جب سے ان کی امی کی وفات ہوئی تھی' دونوں بھائیوں نے یہی ڈراما رچا رکھا تھا۔

"شہزادی سے کہو' وہ آکر کام کر جائے پاس ہی تو ہے۔" انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا۔ دونوں کے گھروں میں چار گلیوں کا ہی فاصلہ تھا۔

وہ خود گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ بچوں کے ساتھ گھر اور نوکری کو ہی انہوں نے بمشکل سنبھال رکھا تھا اب تیسرا بکھیڑا وہ نہیں پال سکتی تھیں۔

"اس کے سسرال میں شادی ہے کسی کی' وہ گاؤں گئی ہے۔"

معیز نے قدرے جھنجلا کر کہا تھا۔ آپا کی بجشٹ اس کا بی پی ہائی ہو رہا تھا۔ دو بار پراٹھا بنانے کی کوشش کی تھی اور جانے کون کون سے نقشے معرض وجود میں آئے تھے۔ چکن قورمہ بنانے کے چکر میں جو گوشت پریشر میں پکنے کے لیے رکھا تھا۔ وہ الگ جل کر سواہ تھا واشنگ مشین میں کپڑے دھوتے ہوئے دو نئی شرٹس کا رنگ ایک دوسرے پر چڑھ چکا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے تم سے' شادی کر لو۔ ہمیں بھی کبھی گھر کا دروازہ کھلا ملے۔ ہماری بھی کوئی تواضع کرنے والا موجود ہو۔"

"یہ ذمہ داری بھی میں نے آپ کو سونپ رکھی ہے۔ اب آپ خود ہی اتنی ست ہیں تو کوئی کیا کرے۔" فریج سے جوس نکال کر اس نے آپا کو تھمایا۔ ہاتھ میں پکڑنے کے بعد وہ مسلسل اسے گھورے جا رہی تھیں۔

"لڑکی تو آج مل جائے اگر تم اپنی حیثیت کے مطابق بات کرو تو۔" انہوں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

"حیثیت ہی تو بدلنا چاہتا ہوں۔" جیب میں رکھے دس ہزار کے نوٹ اس نے دوبارہ گنتے ہوئے کہا۔

"ان دو کمروں کے گھر میں کوئی محل سے اٹھ کر نہیں آئے گی رہنے کے لیے۔"

پراٹھا بیلنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے آئینہ بھی دکھا رہی تھیں لیکن معیز اس میں اپنا چہرہ دیکھنے کو تیار

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا۔ سوڈھٹائی سے بولا۔
"تو نہ رہے۔ میں اس کے ساتھ محل میں رہنے چلا جاؤں گا۔"
"اس دنیا کا کوئی بھی پیسے والا شخص تم جیسے کنگلے کو اپنی بیٹی کیوں دے گا۔" پراٹھا اور آملیٹ اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے مہرالنساء نے ابرو اچکائے۔
"ہو سکتا ہے اس کی بیٹی موٹی ہو' کالی ہو' بھینگی ہو یا پھر اور کوئی نقص......"
"بس۔" مہرالنساء نے درشتی سے ہاتھ اٹھائے۔ "بند کرو اپنی بکواس۔" ان کا دل دہل اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اگلے تین روز تک ان کے گھر جا کر کام نمٹاتی رہی تھیں لیکن یہ کوئی مستقل مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس پر ولید الگ سے دھمکیاں دے رہا تھا۔
"اگر آپ زری کے گھر نہیں گئیں تو میں اسے بھگا کر لے آؤں گا۔" زری ان کے محلے میں ہی رہتی تھی۔ ولید اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر معیز کی ایک ہی شرط تھی کہ پہلے اس کی شادی ہو گی پھر ولید کی' اس کے لیے وہ کئی رشتے دیکھ چکی تھیں۔ ایک دو جگہ بنی ہوئی بات بھی وہ بگاڑ چکا تھا۔
اب اس کے لیے پیسے والی لڑکیاں کہاں سے لاتیں اس پر ولید کی ہٹ دھرمی۔ وہ تو ان دونوں کے چکر میں خوب گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔
"مما! میں نے کپڑے استری کر دیے ہیں۔"
صبا کی اطلاع پر انہیں خیال آیا تھا کہ آج انہیں اپنی جٹھانی کے گھر منگنی پر جانا تھا۔ ان کی چھوٹی بیٹی کی منگنی تھی۔ وہاں سے واپس آئیں۔ بڑی بیٹی حرا کی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ آج اس نے لائٹ فیروزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس میں اس کی کندن جیسی رنگت دمک رہی تھی۔
"کتنی خوب صورت ہے اور قسمت دیکھو اتنی ہی خراب۔" کالونی کی عورتیں اسے دیکھ کر مختلف تبصرے کر رہی تھیں۔ ایک آدھ ان کی سماعتوں سے بھی ٹکرا گیا۔ منورہ بھابھی بھی اکثر اس کے متعلق سوچ کر آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ حرا بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئی تھی۔ بہت علاج کروایا لیکن ایک پاؤں میں تھوڑا سا لنگ رہ گیا تھا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بند رہتی تھی۔ اس میں جان تو تھی لیکن خون گردش نہیں کرتا تھا۔
کتنے ہی رشتے اس کے آئے تھے لیکن جسمانی نقص کی بنیاد پر پھر کوئی پلٹ کر نہیں آتا تھا۔ اب انہوں نے مجبور ہو کر چھوٹی بیٹی کی منگنی کر دی تھی۔
"ہو سکتا ہے ان کی بیٹی موٹی ہو' کالی ہو' بھینگی ہو یا پھر کوئی اور نقص۔" اچانک معیز کی آواز کی بازگشت ان کے کانوں میں گونجی اور وہ ایک خیال کے تحت اٹھ بیٹھیں۔
"معیز اور حرا۔" ایک نئی سوچ نے ان کے اندر سر ابھارا تھا۔ ان کے میاں امین اور جمیل دو ہی بھائی تھے اور ان کی بھی اپنی جٹھانی سے اچھی بنتی تھی۔ اس رشتے سے ان کے دو فائدے ہونے والے تھے۔
دونوں بھائی ایک دوسرے کے مزید قریب آجاتے' سسرال میں واہ واہ ہو جاتی اور معیز کو امیر لڑکی مل جاتی تو ولید کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ اسی وقت انہوں نے امین سے مشورہ کر لیا۔ وہ سن کر نہ صرف بہت خوش ہوئے تھے بلکہ ان کے دل میں مہرالنساء کا مقام اور بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا دماغ تو درست ہے۔" شہزادی تو سنتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔
"ہمارے بھائی کے لیے ساری دنیا میں ایک وہی رہ گئی ہے۔" اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا" آخر مہرالنساء نے ایسا سوچا بھی کیسے تھا۔ اس پر بچوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔
"مما! حرا باجی تو اتنی سڑیل سی ہیں۔ ان سے تو ماموں کی شادی ہرگز نہیں ہو گی۔" یہ صبا تھی ان کی سب سے بڑی بیٹی۔

"تو اور کیا مجال ہے جو کبھی انہوں نے ہم سے سیدھے منہ بات کی ہو۔" زینب نے فوراً" تائید کی۔
"ایک بار میں نے ان کا فریج کھولا تھا۔ اتنا ڈانٹا مجھے۔" مریم نے منہ بسورا۔
"تم بچوں کو کس نے اجازت دی ہے کہ بڑوں کی باتوں میں دخل اندازی کرو۔" اتنے سارے اعتراضات سن کر مہرالنساء کا دماغ گھوم گیا تھا۔ انہوں نے بچوں کو ڈانٹ کر چپ کرایا' پھر شہزادی کی سمت متوجہ ہوئیں۔
"دیکھو! اب نہ تو امی حیات ہیں نہ ابو بھائی ہمارے مل رہے ہیں۔ ہم ان کے متعلق نہیں سوچیں گے تو کون سوچے گا اور وہ جو معیز شرط عائد کر کے بیٹھا ہے کہ شادی کروں گا تو کسی امیر لڑکی سے تو خود سوچو! دس ہزار تنخواہ پانے والے ملازم کو کون پیسے والا اپنی بیٹی دے گا اور ولید کے متعلق تو سوچ سوچ کر مجھے ہول اٹھتے ہیں۔ تین بھائی ہیں زری کے۔ کچھ الٹا سیدھا کر دیا تو کیا وہ چھوڑ دیں گے اسے۔"
"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات کی طرف شاید تم نے غور نہیں کیا۔" شہزادی کا انداز سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ مہرالنساء نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"وہ تمہارے جیٹھ کی بیٹی ہے' ڈٹہ سٹہ۔"
"ارے بھئی! وہ اچھے سلجھے ہوئے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ تم یہ نیا شوشہ مت چھوڑو اور شیریں کو فون کرو۔ اسے مطلع کرنا بھی تو ضروری ہے۔" شیریں ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی جو بیاہ کر اسلام آباد سدھار چکی تھی۔ شہزادی نے بے دلی سے نمبر ملا کر فون مہرالنساء کو پکڑا دیا۔ وہ بھی پہلے تو سن کر خوب بولی تھی مگر پھر مہرالنساء اور شہزادی کے سمجھانے پر مان گئی تھی۔ ولید کی تو اس معاملے میں کوئی رائے ہی نہیں تھی البتہ معیز فوراً" مان گیا تھا۔
منورہ بھابھی ان کی بے حد مشکور اور احسان مند تھیں جو انہوں نے ان کی بیٹی کے لیے دست سوال دراز کیا تھا۔
"زیادہ کھٹ راگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس سادگی سے ہی نکاح کر لیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ لڑکے پر کوئی قرض وغیرہ کا معاملہ ہو۔" جمیل بھائی نے ان کی دوسری مشکل بھی آسان کر دی تھی لیکن معیز نے دو ماہ کے لیے انہیں ٹال دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کب کرے گا معیز شادی؟ کل بھی بھائی صاحب پوچھ رہے تھے۔ اتنا شرمندہ ہونا پڑا مجھے ان کے سامنے۔ اب تو منگنی کو بھی پانچ ماہ ہو چکے ہیں۔"
امین صبح و شام ان سے پوچھنا نہیں بھولتے تھے۔ وہ خود بھی اب اس معاملے کو ٹالتے ٹالتے تھکنے لگی تھیں۔ آخر معیز کیا چاہتا ہے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ کل اسکول سے واپسی پر شہزادی کو لے کر گھر جائیں گی۔
"کہاں سے کروں شادی۔ ایک دھیلا نہیں ہے میرے پاس۔ تمہیں اگر اتنی ہی جلدی ہے تو اپنے پاس سے کر دو ورنہ ان سے کہہ دو' ڈھائی تین سال تک انتظار کریں۔" وہ ٹکا سا جواب دے کر نکل گیا تھا گھر سے باہر۔
"یہ شروع سے ہی کمینہ ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ سے ہی دوسروں کی جیب پر ہوتی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ قبل اس کی کمیٹی نکلی ہے پچاس ہزار کی لیکن اب تم رشتہ کروا کر پھنسی ہوئی ہو تو فائدہ اٹھائے گا۔" ولید اس کے جاتے ہی اپنی بھڑاس نکالنا شروع ہو چکا تھا۔
شہزادی نے اپنے بیگ سے دس ہزار نکال کر رکھ دیے۔
"اب وہ تو دے گا نہیں تو سب مل ملا کر ہی کر لو۔" مہرالنساء نے پریشانی سے ولید کو دیکھا تو اس نے بھی پندرہ ہزار لا کر دے دیے۔ شیریں نے دس ہزار کے علاوہ اسے انگوٹھی بھی پہنائی تھی جبکہ باقی کے تمام اخراجات انہیں اپنی جیب سے ادا کرنے پڑے تھے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی تھی۔ ان کے بھائی کا گھر بس رہا تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ ☆ ☆

"تمہارے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار کی رقم غائب ہے؟" امین چیک بک ہاتھ میں لیے ان سے دریافت کر رہے تھے۔

"ہاں وہ معیز کی شادی میں خرچ ہو گئے۔" وہ کپڑے استری کر رہی تھیں 'سو مصروف سا جواب دیا حالانکہ اس رقم کے لیے وہ ان کے سامنے جوابدہ نہیں تھیں۔ وہ پیسے ان کے اپنے تھے اور آج سے قبل انہوں نے کبھی ان سے سوال و جواب نہیں کیے تھے مگر آج جانے کیوں پوچھ رہے تھے۔

"اپنے بھائی کی شادی میں تم نے پچاس ہزار لٹا دیے اور میرے بھائے کے گھر دو ہزار پکڑا کر چلی آئیں۔" مہرالنساء نے پہلی بار انہیں اتنا غصے میں دیکھا تھا۔

"وہ پیسے میں نے حرا کی شاپنگ میں ہی خرچ کیے ہیں۔" استری کا بٹن نکال کر وہ رسان سے بولیں۔

"ہاں تو کیے تو اپنے بھائی کی طرف سے نا۔ اب میں بھی حرا کو تحفے میں پچاس ہزار دوں گا جب بھابھی نے شکایت کی 'میری تو نظر ہی نہیں اٹھ رہی تھی۔" تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے مگر مہرالنساء کی سوئی تو بھابھی پر ہی اٹک گئی تھی۔ پہلی بار بھابھی نے ان کی شکایت لگائی تھی۔ پہلی بار وہ ان سے جھگڑے تھے۔

انہیں اچانک ہی بھابھی پر بے حد غصہ آیا تھا۔

"اور یہ تم اور شہزادی کیا آئے روز میکے چلی جاتی ہو۔ قریب رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے سر سے ہی نہ اترو۔" اگلا حملہ اور بھی زور آور تھا۔ وہ کب بھلا اتنا جاتی تھیں لیکن یہ بھی بھابھی نے ہی کہا ہو گا۔ وہ اتنا پریشان ہو چکی تھیں کہ مزید کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شہزادی کو فون کیا تو اس کے پاس سنانے کو مزید بہت کچھ تھا۔

"آج گئی تھی میں معیز کی طرف۔ حرا تو میرے پاس بیٹھی ہی نہیں۔ ایک کپ چائے تک نہیں پوچھا۔ گھر بھی اتنا گندا ہو رہا تھا ساری صفائی کر کے آئی ہوں۔ فصیحہ تو میری اس سے اتنا ڈرتی ہے کل اسکول سے واپسی پر کہہ رہی تھی۔ ماموں کے گھر جاؤں گی اور پورا گھنٹہ گلی میں بیٹھ کر آ گئی۔ اندر نہیں گئی۔ اس ڈر سے کہ مامی گھر سے نکال دیں گی۔"

"اچھا شہزادی! مجھے روٹیاں بنانی ہیں پھر بات کروں گی۔" انہوں نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دو ماہ بعد ولید کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ زری کو وہ بچپن سے جانتی تھیں۔ اچھی سلجھی ہوئی 'پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ جلد ہی اس نے اپنی نرم خوئی 'محبت اور خوش اخلاقی سے سب کا دل جیت لیا تھا۔ حرا کی البتہ وہی حرکتیں تھیں۔ محترمہ کو کمرے میں جا کر سلام کرنا پڑتا تھا خود سے آنے کی زحمت اسے گوارہ نہیں تھی۔

"میری بیوی کیا ملازمہ ہے جو سب کام وہی کرے۔" ایک روز ولید ان سے کہہ رہا تھا۔ وہ حیران ہوئیں۔

"کیوں ہم نے تو کام دونوں میں برابر کے تقسیم کیے تھے۔" کچن سارا حرا کے ذمے تھا 'باقی صفائی 'کپڑے وغیرہ زری کی ذمہ داری تھے۔

"زری تو اپنا کام مکمل کرتی ہے لیکن اس نے پہلے ہی دن سنا دیا تھا کہ معیز کام پہ لیٹ جاتا ہے۔ اس لیے تم اپنا اور ولید کا ناشتا خود بنانا حالانکہ ہمارا فیکٹری جانے کا وقت ایک ہی ہے پھر اس نے صبح کے برتن دھونے چھوڑے۔ اس سے اگلے روز دوپہر کے بھی 'زری نے کہا 'چلو کوئی بات نہیں۔ تم شام کے دھو دیا کرو اور اب وہ شام کے بھی نہیں دھوتی۔ سالن پکانے کے بعد اپنی اور معیز کی روٹی بنا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے سارے ماسیوں والے کام تم نے زری کے ذمے لگائے ہوئے ہیں۔ صفائی 'کپڑے 'برتن اور وہ بیگم صاحبہ کی طرح کچن میں ہانڈی بنا کر فارغ۔"

"اچھا میں معیز سے بات کروں گی۔" فی الحال تو انہوں نے ولید کو ٹالا تھا۔ لیکن اگلے روز شام کو معیز

چکر لگانے آیا تو انہوں نے پکڑ کر بٹھا لیا اور ولید کی ساری شکایتیں من و عن اس کے سامنے دوہرا دیں۔ پہلے تو وہ سن کر خاموش رہا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

"میں نے ہی اسے زیادہ کام کرنے سے منع کیا ہے' تم تو جانتی ہو اس کا ایک ہاتھ بند رہتا ہے۔ وہ کہاں اتنے بکھیڑے سنبھال سکتی ہے۔"

"تم بھول رہے ہو کہ دو سال سے اس نے اپنا سارا گھر سنبھالا ہوا تھا اور اسے ہر کام کرنے کی پریکٹس ہے۔"

"ہاں! لیکن ان کے گھر صفائی 'کپڑے اور برتنوں کے لیے نوکر تھے۔"

"تو ایک آدھ نوکر ساتھ کیوں نہیں بھیج دیا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئیں۔

ان کا دل حرا کے لیے بہت برا ہو چکا تھا۔ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بڑھا چڑھا کر اپنے گھر والوں کو سناتی تھی اور بھائی صاحب دو کی چار سنا کر امین صاحب کو بھڑکاتے تھے اور جھگڑا ان کے گھر شروع ہو جاتا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے معیز کو گھر سے نکلتے دیکھا تھا اور بس انہیں گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔

"کیا پٹیاں پڑھا رہی تھیں معیز کو حرا کے خلاف؟"

"میں نے کیا کہنا ہے۔" وہ ایک دم سے بھڑک اٹھیں۔

"نوکر کی بات تو میں نے خود سنی ہے۔ کبھی تم کہتی ہو کہ اپنے سسرال والوں سے کہو تمہیں کوئی کاروبار شروع کروا دیں یا بیرون ملک بھجوائیں۔ اب نوکر رکھ کر دیں۔ تمہارے نکمے بھائی کے لیے نہیں کما رہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے اسے عیاشیاں کرواتے پھریں۔ پہلے ہی اپنی بیٹی کے تمام اخراجات انہوں نے خود اٹھا رکھے ہیں۔"

یقیناً" وہ آج پھر منورہ بھابھی سے کلاس لے کر لوٹے تھے اور وہ سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے معیز سے ایسی کوئی بات کب کہی تھی اور بالفرض اگر وہ اپنے داماد کو سیٹل کرتے بھی ہیں تو فائدہ ان کی بیٹی کو ہی ہونے والا تھا لیکن ان ساری وضاحتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جتنا اپنا دفاع کرتیں انہیں اتنا ہی سنانے کا موقع ملتا تھا۔

☆ ☆ ☆

شیریں کچھ روز کے لیے رہنے آئی تھی۔ انہوں نے سوچا' وہ اسکول سے واپسی پر ہی چکر لگا آئیں' گھر جا کر پھر آنا تو مشکل ہی ہو گا مگر دروازے پر لگا تالا دیکھ کر سخت کوفت نے گھیرا۔

"یہ کہاں گئی۔" کچھ دیر وہیں کھڑے ہو کر سوچا اور پھر سیل فون نکال کر شہزادی کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ اندازے کے مطابق وہ ان ہی کے گھر میں تھی۔

"میں وہاں گئی تو تم یہاں آئی ہوئی تھیں۔" شیریں سے گلے ملتے ہوئے انہوں نے ہلکا سا اعتراض کیا مگر وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"شوق سے نہیں آئی ہوں۔"

"پیدل میں چل کر آ رہی ہوں اور گرمی تمہارے دماغ کو چڑھی ہوئی ہے۔" پنکھا تیز کرتے ہوئے انہوں نے منہ پھلایا۔

"تو کیا خالی گھر میں بیٹھ کر مکھیاں مارتی۔" وہ مزید بھڑکی۔

"خالی گھر کیا مطلب؟" وہ کچھ بھی نہیں تھیں۔

"رات کو آئی تھی میں۔ صبح حرا اٹھی اور تیار ہو کر میکے چلی گئی۔ جاتے ہوئے سلام تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ ناشتے کا بھی نہیں پوچھا۔ زری کو فون کیا تو کہہ رہی تھی' شام تک آ جاؤں گی۔" شہزادی نے تازہ رپورٹ پہنچائی تو مہرالنساء' خاموش سی ہو گئیں۔ زری کی بہن کی منگنی تھی۔ وہ دو روز سے میکے میں تھی۔

"چلو چھوڑو' اب کیا کریں۔ اس کی عادتیں ہی عجیب ہیں۔"

"ویسے تم منورہ بھابھی سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ اب تو حد ہی ہو چکی ہے' وہ سمجھائیں اپنی ذرا بیٹی کو۔ ہم وہاں جائیں تو اس کا منہ بن جاتا ہے۔ وہ ہی تو بھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں ہمارے' اب کیا انہیں بھی چھوڑ دیں۔ ہماری تو چلو خیر ہے لیکن شیریں تین مہینوں بعد آئی ہے اس کا تو لحاظ کرتی۔"

"ہاں میں کروں گی بات۔" انہوں نے بھی بات کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا لیکن اس سے قبل ہی ایک اور بات ہوگئی تھی۔ امین کسی شادی میں گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہیں فوڈ پوائزن ہوگیا۔

دو روز بعد حرا اپنی بہن مریمہ کے ساتھ چاچو کی عیادت کے لیے آئی تھی۔ شیریں ابھی تک ادھر ہی تھی اور حرا تب سے میکے میں تھی۔ اب بھی وہ میکے سے ہی آئی تھی۔ صبا نے دونوں کو کولڈ ڈرنک دی۔ تب ہی زینب نے باتوں کے دوران ویسے ہی مریمہ سے کہہ دیا تھا۔

"مریمہ باجی! آپ کے ہاتھ کیوں اتنے سانولے ہو گئے ہیں؟" اور جواباً "وہ اپنی تعریفوں کے پل باندھنا شروع ہوچکی تھی۔

"ایک تو گاؤں کی آب و ہوا' اس پہ اتنی بڑی فیملی۔ سارا دن کام کرتے ہی گزر جاتا ہے۔ ہر وقت مہمانوں کی آمدورفت لگی رہتی ہے۔ وہاں تو کبھی سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ ہاتھوں کا خیال کون رکھے گا۔"

"اس لحاظ سے تو پھر حرا اچھی ہے۔" مہرالنساء کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"وہ کیسے۔" مریمہ چونکی۔

"اس کی نندیں آئی ہیں اور یہ میکے چلی جاتی ہے۔"

وہ خود کو کہنے سے روک نہ سکی تھیں اور پھر جو زبان درازی کا مظاہرہ حرا کی جانب سے ہوا تو وہ بھی اپنا غصہ ضبط نہیں کرپائی تھیں۔ انہوں نے اگلی پچھلی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ پل میں کمرے کا خوشگوار ماحول اتنا کشیدہ ہوگیا کہ دونوں جانے کے لیے اٹھ گئیں۔

مہرالنساء نے روکا بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد گھر میں ایک بار پھر سے ہنگامہ ہوا تھا۔

"آپ ہر بار مجھے ہی کیوں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں؟ بھتیجی کی زبان کے جوہر اور کرتوت نظر نہیں آتے آپ کو؟ ہم سب بہن بھائیوں کو دور کر دیا ہے اس نے۔ ہمارے رشتے میں دراڑ ڈال چکی ہے۔ میں نے تو محض اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی جگہ صبا ہوتی تو اسے بھی میں یہی کہتی۔"

"تم نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی' طنز کیا تھا اس پر۔ اگر وہ صبا کی جگہ تھی تو تم اپنی بہن اور اسے دونوں کو بٹھا کر معاملہ دریافت کرتیں۔ وہ میری عیادت کے لیے آئی تھی تم نے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکال دیا۔"

"اچھا ہے' بھائی صاحب اور منورہ بھابھی کو بھی پتا چلے اپنی بیٹی کی حقیقت۔ وہاں سچ جھوٹ ملا کر مظلوم بن جاتی ہے۔ ان کو بھی ہمارے خلاف ورغلا رکھا ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی پھر اچھے بھلے اور تماشا ہمارے گھر میں ہر روز۔"

"مما ٹھیک کہہ رہی ہیں پاپا! پانچ مہینے ہو چکے ہیں آپ دونوں کو لڑتے جھگڑتے اور وہ بھی کسی اور کی وجہ سے۔ جب آپ کو یا ہمیں مما سے کوئی شکایت نہیں ہے تو پرائے جھگڑوں کو لے کر آپس میں نہ جھگڑیں پلیز۔" صبا آج تنگ آکر بولی تھی مگر وہ مزید بھڑک اٹھے۔

"تمہاری ماں انوالو ہوتی ہے ہر بات میں۔"

"حرا باجی کا مزاج کسی کو نہیں پتا' وہ کسی کے ساتھ بنا کر رکھنے والی نہیں ہیں۔" زینب زیرِ لب بڑبڑائی لیکن ان کی سماعتیں بھی کافی تیز تھیں۔

"دیکھا! بچوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ تم ہی سکھاتی ہو انہیں ایسی باتیں۔" وہ ان سے حد درجہ بدگمان تھے۔

☼ ☼ ☼

دو روز گزر چکے تھے۔ وہ سوچ رہی تھیں' بھائی صاحب کی جانب سے امین کا بلاوا کیوں نہیں آیا ابھی تک جبکہ اس سے اگلے روز بچوں نے آکر ایک نئی بات سنا دی تھی۔

"مما! معیز ماموں نے فریج بند کر دیا۔ زری مامی کی چیزیں نکال کر باہر رکھ دیں اور ولید ماموں سے کہا ہے کہ اپنا کچن بنالو۔ وہ ایک مہینے کے اندر اندر گھر میں دیوار اٹھا دیں گے اور فریج حرا مامی نے فون کر کے بند کروایا ہے۔ ولید ماموں نیا فریج لینے گئے ہوئے ہیں۔"

حسن کی اطلاع پر مہرالنسا نے ایک جتاتی ہوئی سی نگاہ امین پر ڈالی تھی۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

"حرا ایسا نہیں کر سکتی۔"

"وہ ایسا کر چکی ہے۔" مہرالنساء نے کپڑوں کی سلوٹیں نکالتے ہوئے لب بھینچے۔ اندر سے ان کا دل کٹ رہا تھا۔

"تم گھر بیٹھ کر مفروضے نہ بناؤ۔ وہاں چل کر ہی اصل معاملہ دریافت ہو سکتا ہے۔"

وہ اٹھے تو مہرالنساء بھی اندر سے چادر لے آئی تھیں۔ زری اور حسن کے بیان میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا لیکن امین سے حرا کا نام ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے فون کر کے بھائی صاحب کو وہیں بلوا لیا تھا۔ شہزادی پہلے سے وہاں موجود تھی۔

بھائی صاحب نے معیز سے آکر پوچھا۔ تمہیں حرا نے ایسا کہا تھا تو معیز صاف مکر گیا۔ سسر کے سامنے سارا الزام خود پر لے لیا۔

"حرا نے نہیں کہا تھا۔ میں نے خود ہی فریج بند کیا تھا۔"

"لو خود سن لو۔" امین صاحب نے فوراً "مہرالنساء کو گھورا۔

"ابھی دو روز قبل جو بات ہوئی' مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔ مہرالنساء! تم گھر میں سب سے بڑی ہو۔ بڑی نند ہونے کے ساتھ ساتھ چاچی بھی ہو۔ ساس کی جگہ بھی اب تمہاری ہی ہے۔ تمہیں اگر کوئی شکایت تھی تو ہم سے آکر کہتیں۔ بچیاں تمہارے گھر عیادت کے لیے آئی تھیں۔ تمہارا ان سے بات کرنا بنتا نہیں تھا۔" بھائی صاحب کو بھی سنانے کا موقع مل گیا تھا۔

"مجھے آپ سے اور بھابھی سے ہی بات کرنا تھی لیکن اس روز بس اچانک ہی بات شروع ہوگئی اور رہی بات معیز کی تو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے یہ سب حرا نے ہی کہا ہے۔ وہی ہے سارے فساد کی جڑ' آپ کو جانے کیا جھوٹ سچ ملا کر سناتی رہتی ہے۔ اس پر معیز کا دماغ الگ سے خراب کر رکھا ہے۔ جو وہ الگ ہونے کی بات کر رہا ہے۔ یہاں اگر کبھی ہم آجائیں تو دونوں میاں بیوی کا منہ پھول جاتا ہے۔ وہ تو کبھی سلام تک کرنے کمرے سے نہیں نکلتی۔ چار ماہ بعد شیریں آئی تھی اور یہ اٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ گھر کے کاموں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زری بیچاری اکیلے ہی لگی رہتی ہے۔"

"تم نے شروع سے ہی اس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کیا۔ زری کو تم بہنوں نے سر پہ بٹھایا ہوا ہے اور اس کی گھر میں کوئی ویلیو ہی نہیں ہے۔ ہمارے گھر دو ہزار دیے تم نے اور زری کے گھر پانچ ہزار۔ زری کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور حرا کو پوچھا تک نہیں۔ آتے ہی تم لوگ زری کے کمرے میں گھس جاتی ہو۔ بچوں کو بھی یہی سکھا رکھا ہے کہ زری مامی اچھی ہیں اور حرا تو بہت ہی بری ہے۔ دونوں میں فرق ڈالنے والی تو تم ہو۔"

وہ ان کی بات کاٹ کر کافی غصے سے بولے تھے۔

"معیز کی شادی کا تو سارا خرچا ہی مہر نے کیا تھا اور حرا کو بھی دعوت پہ بلایا تھا۔ اس نے صاف معذرت کر لی۔ اب جو آکر چاہت سے ملے گا۔ اس کے کمرے میں ہی جائیں گے نا اور بچوں کی تو بات نہ ہی کریں۔ انہیں سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی سب دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔" ان کی جگہ جواب شہزادی نے دیا تھا۔

"ٹھیک ہے تو حرا ہی بری ہے۔ وہ تم لوگوں کو سیدھے منہ بلاتی نہیں۔ تمہاری آؤ بھگت نہیں کرتی۔ گھر کے کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔ ساری برائیاں اسی میں ہیں تو پھر تم لوگ اپنے لیے کوئی نئی اور اچھی بہو لے آؤ۔ حرا اپنے گھر میں ہی ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر اٹھے تو امین نے بھی فوراً "تقلید کی۔

"اور تم بھی اپنے گھر میں ہی رہو۔" یہ جملہ انہوں نے مہرالنساء سے کہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ٹھیک ہے آپا! اب تم بھی یہیں رہنا۔ چار دن میں عقل ٹھکانے آجائے گی۔" ان کے دہلیز پار کرتے ہی ولید ان سے بولا تھا۔ شہزادی نے بھی تائید کی۔

"ہاں مہر! اب جب تک خود لینے نہیں آتے مت جانا۔ کچھ دن گزر جانے دو۔ ان کو تمہاری قدر بھی ہوگی اور پتا بھی چل جائے گا کہ وہ لوگ کس طرح انہیں استعمال کر رہے ہیں اپنے مفاد کی خاطر اور یہ معیز۔۔۔ دیکھتی ہوں کیسے جاتا ہے حرا کو لینے۔" پیچھے بیٹھے معیز کو بھی اس نے ایک دھپ لگائی تھی۔

"میں نے تو کل ہی چلے جانا ہے۔ کسی کے لیے میں کیوں اپنا گھر خراب کروں۔" وہ بے مروتی سے کہتا اٹھ کر چھت پر چلا گیا تھا۔ جبکہ مہرالنساء سب کے درمیان سن سی بیٹھی تھیں! امین بھلا یوں اس طرح کیسے چھوڑ کر جا سکتے تھے آخر اٹھارہ سال کا ساتھ تھا۔

کیا نہیں دیا تھا انہوں نے اس شخص کو۔۔۔ محبت، وفا، سکھ، بچے اور زندگی بھر کی انتھک کمائی۔

وہ گھر جس سے ایک پل میں انہیں بے دخل کر دیا تھا۔ اس گھر کی ایک اینٹ کے بعد دوسری اینٹ انہوں نے جوڑی تھی اور یہ سب کہہ رہے تھے "تم یہیں رہو۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ انا پرست شخص کبھی منانے نہیں آئے گا۔ تو کیا وہ ایسے ہی اتنی آسانی سے سب کچھ اس کے نام کر دیں گی۔

"نہیں! میں الگ گھر لوں گی اور بچوں کو وہاں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ میں کسی بھی صورت اپنے بچوں سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ میں اکیلے بھی ان کی پرورش کر سکتی ہوں۔" پہلا حل یہی سوچا تھا۔

"بلکہ میں تو کہتا ہوں یہ مریم اور حسن کو بھی گھر بھجوا دو۔" ولید کہہ رہا تھا اور مریم نے سن کر ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ ویسے بھی سب سے چھوٹی تھی اور ماں کے بغیر رہنے کا تصور ہی اس کے لیے محال تھا۔ کچھ دیر بعد صبا کی کال آئی۔

"مما گھر کیوں نہیں آئیں؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اپنے باپ سے پوچھو۔" ان کا انداز جارحانہ تھا۔

"پوچھا ہے وہ کہتے ہیں، ماں کا نام لیا تو تم لوگوں کو بھی وہیں چھوڑ آؤں گا۔ مما! آپ لوگ دوسروں کی بات سنوارنے گئے تھے یا پھر اپنی بگاڑنے۔؟ بس آپ جلدی گھر آئیں۔"

"ابھی تم سو جاؤ۔ صبح ہوگی تو کچھ سوچوں گی۔"

انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ بچوں کو وہ اپنے ساتھ یہاں نہیں رکھ سکتی تھیں اور کہیں الگ مکان کرائے پر لے کر رہتیں تو بھی کئی مسائل لڑکیاں بھی تو جوان ہو رہی تھیں۔ پھر اپنا گھر کیسے چھوڑ دیتیں، ایک ایک چیز کو اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا، عمر بھر کی کمائی اس گھر کو بنانے میں لگا دی تھی۔

فرار کی تمام راہیں ان کے لیے ہی مسدود کیوں تھیں۔

صبا کا فون صبح پھر آیا تھا۔

"مما! میں آج اسکول نہیں گئی۔ میرا اتنا ضروری ٹیسٹ تھا۔ پاپا کو کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ وہ غصہ ہم پر نکالتے رہے۔ سب کو ناشتا بنا کر دیا۔ مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا یہ سب۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"آپ گھر آئیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ پاپا آپ کو یوں بے قصور سزا نہیں سنا سکتے۔ اگر انہوں نے آپ کو گھر سے نکالنے کی کوشش کی تو ہم لڑیں گے ان سے۔ یہ گھر آپ کا ہے۔"

صبا کی باتوں نے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اس طرح کبوتر کی طرح وہ آنکھیں میچ کر کتنے دن یہاں گزاریں گی۔ صبا کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی آج اسکول نہیں جا سکی تھیں، پھر ان کے بچے تو ان کے ساتھ ہی تھے لیکن امین کے ساتھ دل کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ ایک بندھن باقی تھا جو صرف بچوں کی خاطر تھا۔ حرا سے تو انہوں نے ہر تعلق ختم کرنے کا سوچ لیا تھا لیکن امین کے ساتھ قائم ہوئے اس دوہرے رشتے کو اب عمر بھر شاید ایسے ہی چلنا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نمرہ احمد

جنت کے پتے

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے، وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی، حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایئر پورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے' تاہم سبین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست معتصم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچاتا ہے تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوتا ہے۔ حیا' جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے' جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے' جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا کلچ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا' پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آجاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مہری سے ملتے ہیں' تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پنکی' حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا دیتا ہے' جو ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی' ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھ حرفی کوڈ کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے' جہان سے بھی کہتی ہے' پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا' معتصم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر Who لکھ دیتا ہے۔ حیا' عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پہ رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنکی ہے اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی منگنی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا' پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

بہارے کا پزل باکس کھل گیا۔ اس میں سے نیکلس نکلتا ہے مگر وہ سمندر کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ حیا کو پتا چلتا ہے کہ پاشا کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے' جو بظاہر یونان میں ہے۔

پاشا اپنی سیکریٹری دیمت سے اپنے مسئلے پر مشورہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے زبان بند رکھنے کے لیے اس کے ایک راز سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

جہان بیوک ادا آتا ہے۔ حیا اس کا پیچھا کرتی ہے مگر کچھ جان نہیں پاتی۔ اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک کہانی وہ جہان اور پاشا کو سناتی ہے۔ جہان اسے شائع کروانے سے منع کرتا ہے جبکہ پاشا بھڑک اٹھتا ہے۔ پاشا بیوک ادا آتا ہے تو اسے حیا کا پزل باکس ملتا ہے۔ وہ اسے چھپا لیتا ہے۔ بہارے کو علم ہوتا ہے پھر جب عائشے گل اور حیا اسے ڈھونڈتی ہیں تو بہارے چپکے سے اسے لا کر دے دیتی ہے۔ اس پر پاشا بہارے سے ناراض ہوتا ہے۔

سلیمان صاحب ترکی آتے ہیں۔ حیا ہوٹل مرمرا میں ملنے جاتی ہے تو ان کے ساتھ ولید لغاری اور اس کا اپنے باپ موجود ہوتا ہے۔ حیا جہان کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہاں جہان اپنا تعارف حیا کے شوہر کی حیثیت سے کرواتا ہے۔ حیا اپنا

موبائل مرمت کرانے جاتی ہے تو دکان والا بتاتا ہے کہ اس کے فون میں ٹریسر لگا ہے۔ حیا اسے لگا رہنے دیتی ہے۔ سلیمان صاحب اپنی بہن کے ساتھ مل کر حیا اور جہان کی باقاعدہ منگنی کرتے ہیں۔

عائشے گل کے کہنے پر حیا اسکارف پہننا شروع کر دیتی ہے۔ ایک کافی شاپ میں پاشا سے سامنا ہوتا ہے۔ تو حیا اس کے منہ پر کافی پھینک کر بھاگ جاتی ہے۔

ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے بعد حیا باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیتی ہے۔ حیا کا پزل باکس کھل جاتا ہے مگر اندر ایک اور پہیلی نکلتی ہے۔ جس کے سلسلے میں وہ سسلی امانت لا کر جاتی ہے۔ وہاں اسے پاشا کا میسج ملتا ہے کہ برگر کنگ میں ایک سرپرائز ہے۔ وہ سب چھوڑ کر وہ جہان کے ریسٹورنٹ پہنچتی ہے۔ وہاں پاشا اور جہان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حیا جہان کا پاشا سے تعلق نکلنے پر بے حد خفا ہوتی ہے اور ترکی چھوڑ کر فوراً پاکستان آجاتی ہے۔

امانت لا کر سے حیا کو فلیش ڈرائیو ملتی ہے جو کسی پاس ورڈ سے کھلے گی۔ حیا کی سہیلی زارا اس کے حجاب لینے پر تنقید کرتی ہے' جہان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ سبین پھپھو ان کی میت لے کر بائیس سال بعد پاکستان آتی ہیں۔ جہان دوسرے دن پاکستان پہنچتا ہے۔ سبین پھپھو پاکستان میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ ارم کی منگنی کے فنکشن میں حیا حجاب لے کر شرکت کرتی ہے۔ اسے سب کی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فنکشن سے واپسی پر حیا' جہان کو شروع سے لے کر اب تک اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات سناتی ہے۔ جواباً" جہان بتاتا ہے کہ اس نے ہوٹل گرینڈ میں کچھ عرصہ کام کیا ہے اور وہ پاشا اور اس کے بھائی کو جانتا ہے۔ وہ دونوں سگے بھائی نہیں ہیں اور یہ بات آنے اور جہان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ فیملی کے جعلی پاسپورٹ بنانے میں تاخیر پر جہان سے پاشا کی تلخ کلامی ہوئی تھی' جس پر حیا پاکستان آجاتی ہے۔ پاشا' عائشے اور بہارے کو جعلی ناموں سے دوسرے ملک بھجوا رہا ہے۔

امریکا میں روحیل نے بدھسٹ عورت سے شادی کر لی۔ جہان اس بات سے واقف ہوتا ہے تاہم ایک احسان کے بدلے وہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔ سلیمان صاحب کو اس بات پر ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حیا ان کے آفس جانا شروع کر دیتی ہے۔ تایا فرقان اور زاہد چچا کو بہت برا لگتا ہے۔ ولید لغاری ان کے بزنس کا دس فیصد کا پارٹنر ہے۔ وہ ہیڈ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر ٹریڈ سینٹر کے نقشے میں جان بوجھ کر غلطی کرتا ہے۔ جس سے ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا الزام سب حیا کے سر تھوپ دیتے ہیں تاہم وہ وینڈر سے مل کر سپلائی جاری کروا دیتی ہے۔ جس سے ان کا حالیہ پروجیکٹ متاثر ہو رہا تھا۔ فرخ کے ولیمہ والے روز حیا جب اپنے تایا زاد سے پردہ کرتی ہے تو تایا فرقان اس کے حجاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے خوب بے عزت کرتے ہیں۔ زاہد چچا بھی اس کی حمایت نہیں کرتے حتیٰ کہ فاطمہ بھی حیا کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

جہان حیا سے دبے لفظوں میں گھر والوں کی حمایت کرتا ہے تو حیا سختی سے حجاب نہ اتارنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ جہان بغیر کچھ کہے چلا جاتا ہے۔

جہان کے چلے جانے پر سب حیا کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حیا کی دوستیں اس کے نقاب کی وجہ سے اس سے دور ہو گئی ہیں۔ ارم دوبارہ حیا سے اس کا موبائل مانگتی ہے۔ حیا اپنے ڈرائیور کا فون اسے دے دیتی ہے۔ بعد ازاں ڈرائیور کے موبائل سے وہ نمبر اپنے پاس بھی محفوظ کر لیتی ہے۔ ارم کی زبانی حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان کے حیا سے ناراض ہو کر چلے جانے پر عابدہ چچی اپنی بیٹی سحرش کی جہان سے بات چلانے کے چکر میں ہیں۔

حیا فلیش ڈرائیو کا پاس ورڈ بوجھ کر فائل کھول لیتی ہے۔ اس ویڈیو فائل میں جہان کو دیکھ کر حیا چونک جاتی ہے۔ ویڈیو میں جہان حیا کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ جہان' ڈولی' میجر احمد اور عبدالرحمن پاشا ایک ہی شخص کے چار حوالے ہیں۔ اس بات سے عائشے گل اور بہارے بھی واقف ہیں۔

جہان نے حیا کو چیریٹی شو میں دیکھا تھا۔ وہاں وہ اپنے دوست حماد کی بیوی ثانیہ سے ملنے گیا تھا۔ ثانیہ نے جہان کا کوئی خفیہ کام کیا تھا۔ ان کی ملاقات اسی سلسلے میں تھی۔ جہان' ثانیہ کو حیا کے بارے میں مختصراً" بتاتا ہے۔ جہان کے والد آرمی میں تھے۔ انہوں نے غداری کی جس کی وجہ سے ترکی میں جہان کے دادا اور ممی کو کافی مشکلات برداشت کرنا پڑیں۔ جہان اپنے دادا کے بہت قریب تھا۔ جہان کے ابا اور دادا میں ایک روز شدید جھگڑا ہوتا ہے۔ دادا دل برداشتہ ہو کر مر جاتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انطاکیہ میں جہان کے ابا ایک پاکستانی جاسوس کو قتل کر دیتے ہیں پھر جہان کی مدد سے فارم ہاؤس کے دالان میں فوارے کے پاس دفنا دیتے ہیں۔ اس جاسوس سے جہان کو بہت انسیت محسوس ہوتی ہے۔ جہان یہ بات کسی کو نہیں بتاتا مگر وہ اکثر خواب میں یہ واقعہ دیکھتا ہے۔ سین پھپھو جہان کو بتا دیتی ہیں کہ اس کے ابا نے کچھ فوجی راز بیچے ہیں جس کی سزا کے طور پر وہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ سکندر شاہ اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ سین پھپھو کو دگنی مشقت کرنی پڑ رہی ہے۔

جدیسی میں جہان ایک ورکشاپ میں کام کرنے لگتا ہے۔ اس کے مالک کرامت بے کی بھاوج فریحہ اکثر جہان کو پناہ گزین کی اولاد کا طعنہ دیتی تھی۔ جہان کو فریحہ اور کرامت بے کے ناجائز تعلقات کے علم ہو جاتا ہے۔ ممی کے کہنے پر جہان، سلیمان ماموں کے گھر جاتا ہے اور کوریر شاپ پر چند لفافوں پر پرانی تاریخوں کی مہر لگواتا ہے۔ راستے میں وہ سرخ گلابوں کا بوکے لینے کے لیے رکتا ہے مگر پھول والے کے پاس صرف سفید گلاب ہوتے ہیں۔ وہ ان پر سرخ رنگ کا اسپرے کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

گیارہویں قسط

پھولوں والا لڑکا جلدی جلدی باسکٹ سے سفید گلاب نکالنے لگا۔

"تم گلدستہ بناؤ، میں آتا ہوں۔" اس کی رفتار دیکھ کر وہ جان گیا کہ ابھی اسے کافی وقت لگے گا، اس لیے وہ اندر کوریر شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اگر کسی شے سے ازحد چڑ تھی تو وہ وقت ضائع کرنے سے تھی۔

کوریر شاپ میں دو افراد کھڑے اپنے اپنے لفافے جمع کروا رہے تھے۔ ڈیسک کے پیچھے بیٹھا، پی کیپ پہنے لڑکا کمپیوٹر پہ مصروف نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً" ملازم لڑکے نے ٹائپ کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ شناسائی کی رمق ابھری۔ وہ جلدی جلدی کام نپٹانے لگا۔

دونوں افراد کو فارغ کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"جی احمد بھائی! کوئی خدمت؟"

"ہاں، چھوٹا سا کام ہے۔" وہ جیکٹ کی جیب سے چند صاف لفافے نکالتے ہوئے اس کے سامنے کاؤنٹر پہ آیا۔

"ان کو کچھ بیک ڈیٹس میں اسٹیمپ کرنا ہے اور کچھ کو آگے کی ڈیٹس میں۔ یہ دیکھو۔" وہ اسے کام سمجھانے لگا۔ غضنفر اس کو جانتا تھا، اس سے پہلے وہ جہان کا اس سے ہٹ کر بھی ایک اضافی کام کر چکا تھا، نہ بھی کر چکا ہوتا، تب بھی اس کے کارڈ کے باعث کر ہی دیتا۔

"انٹری نہیں کرنی بھائی؟" جب وہ لفافے واپس جیکٹ میں رکھنے لگا تو غضنفر حیرت سے بولا۔

"اوں ہوں۔۔۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لمبا کام ہو جائے گا اور گھر میں سب ٹھیک ہے؟"

"جی بھائی!" غضنفر اسے گھر کی باتیں بتانے لگا۔ اس کا وہ بھائی جس کو جیل سے نکلوانے میں جہان نے مدد کی تھی، اب کام پہ لگ گیا تھا اور وہ اس بات سے کافی آسودہ لگ رہا تھا۔

"میں چلتا ہوں، تمہارا ابھی آف کرنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔" اس کی بات تحمل سے سن کر اور تبصرہ کر کے اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ماموں کے گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غضنفر سے مصافحہ کر کے وہ باہر آیا۔

سست رو لڑکا ابھی بوکے پلاسٹک کور کے گرد ربن باندھ رہا تھا۔

"اسپرے نہیں کیا؟" اس نے سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر اچنبھے سے ابرو اٹھائی۔

"میں نے ابھی دیکھا صاب! اسپرے ختم ہو گیا ہے۔ آپ ایسے ہی لے جائیں۔ دیکھیں! یہ سبز پتے ساتھ میں لگائے ہیں، کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔"

"اچھا، زیادہ لیکچر مت دو۔ کتنے پیسے ہوئے؟" ناگواری سے ٹوکتے ہوئے اس نے بٹوہ نکالا۔ اندر سے چند نوٹ نکالتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے سروس کارڈ پہ پڑی۔ کیا ماموں کو یہ دکھانا تھا؟ نہیں، ابھی بہت جلدی ہو گی۔ پہلے اسے ان کا اعتماد جتنا ہو گا اور وہ ان کی ناز کسے انداز مغرور سی بیٹی۔۔۔ ان سب لوگوں کی زندگی کا حصہ بننا مشکل لگ رہا تھا۔

بوکے چھوٹا سا تھا۔ اس کو پہلو میں لٹکے ہاتھ میں لاپروائی سے پکڑے وہ سڑک کنارے چلنے لگا۔ ماموں کا گھر یہاں سے قریب تھا۔ مگر وہ کچھ دیر مرکز کی سڑکوں کے کنارے چلنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ صرف اپنی سوچوں کو مجتمع کرنا چاہتا تھا۔

وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی پر یقین نہیں تھا۔ یا پھر وہ جو چاہتا تھا، اسے کہنے سے ڈرتا تھا۔ ماں سے کہنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر خود سے تو کہہ ہی سکتا تھا اور اصل بات وہی تھی، جو ثانیہ نے آج دوپہر میں کہی تھی۔ وہ اپنے ماموؤں سے ڈرتا تھا۔ وہ ان کے طعنے سے ڈرتا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کے سامنے سر اٹھانے سے ڈرتا تھا۔ مگر ممی کہتی تھیں، وقت بدل گیا ہے۔ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں نرم ہو گئے ہیں۔ البتہ پچھلے برس ہونے والی سلیمان ماموں سے ملاقات کے بعد اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ ان کے مزاج کی سختی اور غرور ختم ہو گیا ہے۔ وہ ویسے ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب سلیمان ماموں کو اپنی بیٹی کی فکر تھی، اب وہ بیٹی والے تھے۔ ان کا ہاتھ نیچے تھا اور اس کا اوپر۔ پہلے کی بات اور تھی۔ تب ان کی بیٹی چھوٹی تھی۔ انہیں مستقبل کی فکر نہیں تھی لیکن اب اس کی شادی کی عمر تھی۔ رشتے بھی آتے ہوں گے۔ اب وہ اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں گے اور ان کی پہلی ترجیح ان کا بھانجا ہی تھا۔ کوئی بھی اپنی خوشی سے بچپن کا نکاح نہیں توڑتا۔ سلیمان ماموں سے بھی اسے یہ امید تھی کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔ نہ وہ خود چاہتا تھا۔ لیکن نبھانا۔۔۔ کیسے؟ اگر وہ رک جاتا تھا۔ یہ رشتہ نبھانا بہت مشکل تھا۔

وہ ایسی چھوٹی سوچ کا حامل آدمی تو تھا نہیں کہ پرانے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی کو لٹکائے رکھتا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ وہ ان سے مل لے تاکہ دونوں فریقین دیکھ لیں کہ یہ رشتہ چل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ وہ نبھا سکتا ہے تو ممی کو آگاہ کر دے گا اور اگر اسے لگا کہ وہ نہیں نبھا پائے گا تو۔۔۔ وہ پھر اسی مقام پہ آ کر رک گیا۔ ممی ہرٹ ہوں گی۔ یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اتنے سال اگر اس نے جان بوجھ کر ماموں کی فیملی سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی تو اس لیے کہ دور اندر وہ یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔

سڑک کنارے سر جھکا کر چلتے ہوئے اس نے خود سے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ خود ہی یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ ساری بے رخی، لاتعلقی اور اعراض برتنا، سب لاشعوری طور پہ اسی لیے تھا کہ وہ لوگ تنگ آ کر خود ہی رشتہ ختم کر دیں اور وہ ماں کو دکھ دینے کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ خود کو دھوکا دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جو بھی یہ رشتہ ختم کرے، ذمہ دار تو وہی ہوتا۔ اس کے خشک رویے کے باعث ہی یہ رشتہ ٹوٹے گا۔

لیکن وہ لوگ اس سے اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ کس نے کہا تھا انہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا رشتہ طے کر دیں؟ اسے کبھی کبھی ان سب ذمہ داران پہ ازحد غصہ چڑھتا تھا۔ ممی پہ البتہ نہیں چڑھتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلق قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا، بس رشتے بچانے کے لیے ہی کیا۔ وہ جان بوجھ کر ماں کو شک کا فائدہ دے دیا کرتا تھا مگر ماموں کو نہیں۔ بے انصافی ہے تو بے انصافی سہی۔

بہت دیر وہ سڑکوں پہ بے مقصد چلتا سوچوں میں غلطاں رہا۔ وہ ابھی ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ماں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے سامنے اس کے "میں ابھی ذہنی طور پہ تیار نہیں" اور "یہ بہت جلدی ہے، مجھے سوچنے کا وقت دیں" جیسے بہانے نہیں چلتے تھے۔ اسے ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔

گھڑی کی سوئیاں دس سے اوپر آچکی تھیں۔ جب اس نے خود کو سلیمان ماموں کے گھر کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑے پایا۔ گیٹ بند تھا۔ اندر گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ساتھ والے گیٹ پر پھیلیں۔ یہ فرقان ماموں کا گھر تھا۔ وہ پہلے ایک دن آکر یہ گھر دیکھ گیا تھا اور پھر فیس بک پہ روحیل نے ان دونوں گھروں کے اندر باہر کی اتنی تصاویر لگا رکھی تھیں کہ اسے اندرونی نقشہ بھی حفظ تھا۔

وہ ان دونوں وسیع و عریض اور خوب صورت بنگلوں کے سامنے سڑک پہ گویا کسی دوراہے پہ کھڑا تھا۔ اندر جائے، یا یہیں سے پلٹ جائے؟ اسے صرف ایک بہانہ درکار تھا، اس گھر اور اس کے مکینوں سے دور بھاگنے کا۔ صرف ایک وجہ وہ ڈھونڈ لے اور واپس پلٹ جائے لیکن کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔ اسے اندر جانا ہی تھا۔

دفعتاً فرقان ماموں کے گیٹ کے پیچھے کھٹکا ہوا اور پھر بولنے کی آوازیں، قریب آتے قدم۔ وہ غیر اختیاری طور پہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔ کالونی میں نیم اندھیرا سا تھا۔ گھروں کی بیرونی بتیاں بھی اس جگہ کو روشن کرنے میں ناکام تھیں۔ وہ فرقان ماموں کے گیٹ کے داہنی طرف ایک گھاس سے بھرے جنگلے کی اوٹ میں ہو گیا۔

گیٹ سے فرقان ماموں چند افراد سمیت باہر نکل رہے تھے۔ شلوار قمیص میں ملبوس مسکراتے ہوئے وہ خوش اخلاقی سے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے باہر آئے تھے۔ مہمان تین مرد حضرات تھے، جن کی کار سڑک کے پار ایک خالی پلاٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے ذرا دور، نہ جانے کیوں۔ ماموں اب ان افراد کے ساتھ باتوں میں مگن اسی طرف جا رہے تھے، پیچھے گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ گارڈ، چوکیدار، فی الوقت کوئی بھی نہ تھا۔ شادی قریب تھی۔ سو مصروفیت نے ملازموں کو بھی گھیر رکھا ہوگا۔

وہ اندھیری جگہ پہ دم سادھے کھڑا فرقان ماموں کو دیکھتا رہا۔ دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی۔ پرانی باتیں پھر سے یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا اور جیسے امڈتی یادوں کو رفع کرنا چاہا۔

ماموں اب اپنے مہمانوں کی گاڑی کے ساتھ کھڑے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے یوں وقت ضائع ہونے پہ الجھن ہو رہی تھی۔ چند منٹ تو وہ کھڑا رہا، مگر جب اسے لگا کہ ماموں اور ان کے مہمانوں کی گفتگو لمبی ہوتی جا رہی ہے تو وہ جنگلے کے عقب سے نکل آیا۔ وہ لوگ بہت دور تو نہیں تھے۔ البتہ ایسے رخ سے کھڑے تھے کہ کسی کا بھی چہرہ گیٹ کی جانب نہیں تھا۔

وہ فرقان ماموں کا سامنا کیے بغیر اندر جانا چاہتا تھا۔ کیا حرج تھا اگر وہ یوں ہی اندر داخل ہو جائے۔ فرقان ماموں کو متوجہ کرنا اور ان کے سوالات کا جواب دینا؟ نہیں، ابھی نہیں۔

بہت آرام اور آہستہ سے وہ کھلے گیٹ کے اندر چلا آیا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ لان خالی تھا۔ سب اندر تھے۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر درمیانی دروازہ تلاش کیا۔ وہ سامنے ہی تھا۔ اس پہ گھنٹی لگی تھی لیکن اس نے پہلے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اسے جانا تو سلیمان ماموں کی طرف تھا، سو ادھر رکنا بے سود تھا۔ وہ دروازے سے گزر کر سلیمان ماموں کے لان میں داخل ہو گیا۔

اتنے برسوں سے بنا اجازت دوسروں کے گھروں، لاکرز، موبائلز اور ای میلز میں خاموشی سے داخل ہونے اور نکلنے کی عادت کے باوجود وہ آفیشل کام کے بغیر ٹریس پاسنگ نہیں کیا کرتا تھا۔ اب بھی یہ کرتے وقت اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس کے ماموں کا نہیں، بلکہ سسر کا بھی گھر ہے۔ اندر جا کر وہ بتا دے گا کہ وہ کس طرح داخل ہوا۔ بات ختم!

سلیمان ماموں کا ہرا بھرا لان بھی سنسان اور سرد پڑا تھا۔ اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے پھول اٹھانے کا تکلف کیوں کیا۔ خوامخواہ ایک بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس نے گلدستہ لان کی میز پہ رکھ دیا اور خود گھر کے داخلی دروازے کے سامنے آکھڑا ہوا۔

گھنٹی باہر گیٹ پہ تھی، اندر اس داخلی دروازے پہ نہیں۔ اب کیا صرف دروازہ کھٹکھٹانے پہ کوئی نکلے گا؟ بہت تذبذب سے اس نے داخلی دروازے پہ دستک دی۔ البتہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اندر کمروں میں موجود افراد اس وقت یہ دستک نہیں سن پائیں گے۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح کر رہا تھا، تاکہ اسے ان سے ملنا نہ پڑے اور وہ کہہ سکے "ممی میں گیا تھا، مگر آپ کے بھائیوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں کیا کرتا، سو واپس آگیا۔"

حسب توقع دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ وہ سرد پڑتے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے یوں ہی جائزہ لینے لگا۔ اس گھر میں کون کون ہے۔ مہمان بھی آئے ہوں گے شادی کے۔ کوئی جاگ رہا ہے یا نہیں اور ایسی ہی باتوں کا سرسری سا معلوم کرنے وہ گھوم پھر کر گھر کو دیکھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ البتہ لان کے داہنی رخ پہ کھلتی ایک کھڑکی کے دو شیشے کے پٹ کھلے تھے۔ اتنی سردی میں کون کھڑکی کھول کر بیٹھا ہے؟

وہ اچنبھے سے بھنویں سکیڑے اس طرف آیا۔ شیشے کھلے تھے، البتہ جالی بند تھی۔ اس کے پیچھے پردے بھی گرے تھے۔ دو پردوں کے درمیان ایک درز سی تھی، جس سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں وہ عادت سے مجبور تھا۔ نچلا لب دانت سے دبائے، اس نے احتیاط سے گردن ذرا اونچی کر کے اندر دیکھا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی تھی۔ صرف ایک ہی بلب جل رہا تھا۔ روشنی کا دوسرا منبع بیڈ کے تکیے پہ رکھا لیپ ٹاپ تھا۔ جس کے سامنے وہ کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پہ پھیر رہی تھی۔

یہ وہی تھی جس کو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔ اس نے وہی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سلکی بال، ملائی سے بنی جلد۔

اس کی کزن، اس کی بیوی، کیسا عجیب رشتہ تھا کہ دل میں کوئی احساس نہیں جاگتا تھا۔ نہ ہی اس سے ملنے کی کوئی خواہش تھی۔ نہ جانے کیوں، وہ مایوس ہوا تھا۔ جس طرح لوگ مڑ مڑ کر اسے ہوٹل کی لابی میں دیکھ رہے تھے، اسے وہ سب کچھ ناگوار لگا تھا۔ اس کا لباس گو کہ ایسا نہ تھا، آستین پوری تھیں، قمیص لمبی تھی، نیچے کھلا ٹراؤزر تھا۔ مگر اس کے کپڑوں کی فال ہی کچھ ایسی تھی اور کچھ اس کا انداز کہ وہ توجہ کھینچتے تھے۔ اسے ایسی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے یہ لڑکی بھی قطعاً اچھی نہیں لگی تھی۔

رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا تو وہ چونکا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے موبائل پہ کال ملا رہی تھی۔

"ہیلو زارا؟" شاید رابطہ مل گیا تھا۔ تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چہکی۔ "کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں۔"

جہان نے سوچا، وہ کیوں سردی میں باہر کھڑا کسی کے کمرے میں جھانک رہا ہے؟ اس کو ممی نے ماموں وغیرہ کے سارے نمبرز دے رکھے تھے، پھر وہ ان کو کال کر کے بتا کیوں نہیں رہا کہ وہ ان کے گھر آچکا ہے۔ اگر اس کی نیت اندر جانے کی ہوتی تو وہ لاک توڑ کر بھی اندر داخل ہو جاتا۔ ساری بات نیت کی تھی۔

"ساری باتیں چھوڑو زارا اور میرے پاس جو بڑی خبر ہے وہ سنو اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں۔"

وہ اندر موجود لڑکی کی باتیں بے توجہی سے سن رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے وہ سلیمان ماموں کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے نمبر ملایا، پھر بند کر دیا۔ پھر ملایا، پھر بند کر دیا۔

"کین یو بلیو اٹ زارا کہ مجھے یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے سلیکٹ کر لیا ہے؟"

موبائل کی اسکرین پر انگلی سے نمبر لکھتا وہ جیسے چونکا تھا۔ یورپی یونین کا اسکالرشپ، ایرسمس منڈس ایکسچینج پروگرام؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی دوست سے جو گفتگو کر رہی تھی، اس میں یہی نام اس نے لیا تھا۔ کیا وہ اسکالرشپ کے لیے کہیں جا رہی تھی؟

اس نے موبائل واپس جیب میں ڈالا۔ اس کی ساری حسیات اندر ہوتی گفتگو پہ لگ گئیں۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا۔" اب وہ کسی یونیورسٹی کی طرف سے آنے والی ای میل کا بتا کر اپنی دوست کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بالکل دم سادھے کھڑا سنے گیا۔ اسے صرف یورپ کی اس یونیورسٹی کا نام سننے میں دلچسپی تھی، جہاں وہ جا رہی تھی۔

"نہیں، اسپین کی Deusto نہیں، بلکہ ترکی کی سبانجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں۔"

باہر سردی اور تاریکی میں کھڑکی کے ساتھ کھڑے جہان کو محسوس ہوا، کسی نے اس کا سانس روک دیا ہو۔ ترکی؟ استنبول؟ پانچ ماہ؟ اس نے بے یقینی سے پردوں کی درز سے جھلکتے منظر کو دیکھا۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔

وہ اب اپنی دوست کو سبانجی میں ہیڈ اسکارف پہ پابندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی توجہ پھر بھٹک گئی۔ اسے لگا اسے پیشانی پہ پسینہ آ گیا ہے، جیکٹ کی آستین سے ماتھا صاف کرتے ہوئے وہ ذرا پیچھے کو ہوا تو ساتھ میں لگے گملوں سے ہاتھ ٹکرایا۔ بے خیالی میں ہونے والے اس عمل سے گملا لڑھک گیا۔ نیچے گھاس تھی، اس لیے وہ ٹوٹا نہیں، مگر پتوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ بھی اندر سنائی دی تھی، تب ہی اس نے اس لڑکی کو چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھتے دیکھا۔

وہ بہت احتیاط سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اتنی بے وقوف یا لاپروا نہیں تھی، اس کی حسیات کافی تیز تھیں۔ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے، اس سے قبل کہ وہ پکڑا جائے۔

"ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا سر ڈھکنے پہ مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ۔" وہ کھڑکی کی طرف نہیں آئی، بلکہ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنے لگی۔ وہ دوسری دفعہ چونکا تھا۔ تھینک گاڈ؟ اس بات پہ تھینک گاڈ کہ اس کے باپ نے کبھی اسے سر ڈھکنے کو نہیں کہا؟ عجیب لڑکی تھی یہ۔

چند لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اندر نہیں جانا۔ اسے ان لوگوں سے ابھی نہیں ملنا، اسے پہلے اپنی "بیوی" سے بات کرنی ہو گی۔ اسے ان سے ملنے اور ان کو اپنی جانب سے کوئی بھی امید دلانے سے قبل اس لڑکی کو جاننا اور اعتماد میں لینا ہو گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو ترکی کا اسکالرشپ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ اللہ، اللہ، اگر وہ ترکی آ گئی تو وہ بری طرح سے پھنس جائے گا۔ کیسے سنبھالے گا وہ سب کچھ؟

اس نے گردن موڑ کر لان کی میز پہ رکھے گلدستے کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر جیب سے لفافوں کا بنڈل نکالا۔ وہ لفافہ جس پہ ایک روز قبل کی مہر درج تھی، اس نے وہ علیحدہ کیا، پھر اندرونی جیب سے پین نکالا۔

چند لمحے سوچتا رہا، پھر لفافے کے اندر رکھا چوکور سفید موٹا کاغذ باہر نکالا اور اس پہ لکھا "ویلکم ٹو سبانجی" یہ اس کو چونکانے کے لیے بہت ہو گا۔ کسی اور مقصد سے لیے گئے لفافے پہ اس کا نام لکھ کر اس نے ٹھیک سے اسے بند کیا۔

اندر وہ اپنی دوست کو ابھی تک پرسوں ہونے والی

مہندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

وہ دبے قدموں چلتا لان میں رکھی کرسیوں تک آیا، میز پہ رکھا بوکے اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے گھر کو دیکھا۔ کدھر رکھے وہ اس کو؟ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب سے پہلے حیا دیکھے۔ اس کے ماں باپ نہیں۔

حیا۔ یہ نام بھی کتنا غیر مانوس تھا نا۔

اسے یہ گھر کے اندر رکھنا چاہیے۔ کچن کا ایک دروازہ عموماً "باہر کی طرف کھلتا ہے" شاید وہ کھلا ہو۔ یہی سوچ کر وہ گھوم کر گھر کے دوسری طرف آیا۔ کچن کا بیرونی دروازہ بند تھا لیکن ایک کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی، اس میں سے وہ یہ بوکے اندر رکھ سکتا تھا۔ کھڑکی اس طرح سے بنی تھی کہ باہر کی طرف شیشے کے پٹ تھے اور اندر کی طرف گرل تھی۔ گرل کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ وہ بوکے اس کے اندر سے گزار کر سامنے کاؤنٹر پہ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے پہلے شیشے والے پٹ کو کھولنا ہو گا۔

اس نے بس دو دفعہ کھینچا اور پٹ کی کنڈی اکھڑ گئی۔ ویسی چیزیں، خیر! اسے صرف پھول اندر رکھنے سے غرض تھی۔ نہایت آہستگی سے گلدستہ اور بند لفافہ گرل میں سے گزار کر اس نے کاؤنٹر پہ رکھا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ شیشے والا پٹ احتیاط سے بند کرتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

صبح جو بھی وہ پھول دیکھے گا، لفافے پہ درج نام پڑھ کر ان کو حیا کے حوالے کر دے گا۔ وہ ضرور سوچے گی کہ رات کو ان کے گھر کے اندر کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہو گا، یہ اسے ابھی طے کرنا تھا، لیکن جو بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی ملاقات سے بچ گیا۔ ایک ان چاہے، مجبوری کے بندھن سے فرار کی مہلت میں چند دن کا اضافہ ہو گیا۔ اب وہ ممی کو کہہ سکتا تھا کہ وہ اس لیے اندر نہیں گیا کیونکہ ان کی بھتیجی ترکی آ رہی ہے اور یہ بات ممی کو پریشان کر دینے کے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
قیمت-/75 روپے
رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں-/200 روپے
تین بوتلیں-/275 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔
فون نمبر: 32216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے کافی تھی۔

گھر سے نکلنے سے قبل کچھ سوچ کر وہ پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی طرف آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فریحہ نے گردن موڑ کر کچھ اچنبھے، کچھ نخوت سے اسے دیکھا۔

"بولو!"

"میرا خیال ہے، ہم ادھر بینچ پہ بیٹھ جاتے ہیں۔" پراعتماد سی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے سڑک کنارے بنی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑکے! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو کہنا ہے یہیں کہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب آپ میری بات سنیں۔" کندھوں کو ذرا سا اچکا کر وہ اس کے سامنے کھڑا کہنے لگا۔ "آپ نے مجھے پناہ گزین کی اولاد کہا تھا۔"

"اب بھی کہتی ہوں اور بہت جلد تمہیں اس جگہ سے نکلوا کر بھی دکھاؤں گی۔" اس نے ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیڈی فریحہ! پناہ گزین کی اولاد ہونا بہتر ہوتا ہے، اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور ہر دو روز بعد رات کے ساڑھے بارہ بجے مکینک شاپ میں وہ کرنے سے، جسے گناہ کہتے ہیں۔"

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی گلابی، سنہری سے انسانی چہرے کو سفید پڑتے دیکھا تھا۔ ایسا جیسے کسی نے سفید پینٹ کر دیا ہو۔ فریحہ کا سارا خون ہی نچڑ گیا۔ کتنے ہی پل تو وہ شل کھڑی رہی۔

"اب آپ میری بات سنیں۔ مجھے اور میری فیملی کو اگر آپ نے یہاں سے نکلوانے کی کوشش کی تو میں آپ کے شوہر کے پاس چلا جاؤں گا اور یہ مت سوچیے گا کہ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ میں ان کو وہ ثبوت بھی دکھاؤں گا، جو میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ یہ مت بھولیے گا کہ کیمرا ہر گھر میں ہوتا ہے۔"

فریحہ نے شاید کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں پکڑی جائے گی۔ وہ اتنی ششدر تھی کہ جواباً "کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر پلٹ آیا۔ اس کا اپنا دل بھی زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس نے فریحہ کے سامنے خود یہ اعتماد قائم کیا تھا اور یہ کیمرے والی بات تو ایک خالی دھمکی تھی، اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو رکھ کے دو تھپڑ لگاتا اور بک جھک کر چلتا کرتا، مگر فریحہ کا غرور کچھ ایسے گھائل ہوا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکی اور وہ دبی مسکراہٹ کے ساتھ واپس آ گیا۔

پھر دوبارہ وہ کبھی کرامت بے کی دکان پہ نہیں گیا۔ علی کرامت کے گھر جانا بھی اس نے ترک کر دیا۔ اس کی عزت نفس کو گوارا نہیں تھا کہ اب وہ ان کے گھر جائے۔ لیکن اکثر اسکول سے جاتے ہوئے بس اسٹاپ پہ شٹل کا انتظار کرتے وہ علی کرامت کو اپنی ڈاکٹر ممی کے ساتھ آتے دیکھتا تو پھر کافی دیر ان کو دیکھتا رہتا۔ نقاب سے بھی ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور نرمی چھپتی نہ تھی۔

عمر حاقان اکثر نخوت سے کہتا نظر آتا کہ اس کی چچی ایک بدصورت، سیاہ فام عورت ہے۔ مگر جہان کو وہ عورت بہت خوب صورت لگتی تھی۔ مرو جمیلہ۔ اس کی مرو جمیلہ۔ اس نے بہت عرصے بعد بالآخر ایک دن وہ مرو جمیلہ والا کارڈ ان کو دے ہی ڈالا۔ وہیں بس اسٹاپ کھڑے کارڈ پلٹ کر دیکھتے وہ بے اختیار ہنس دی تھیں۔

پھر بہت عرصہ نہیں گزرا، جب اس نے سنا، نانا کی طبیعت خراب تھی۔ ممی کو اس خبر نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بار بار پاکستان فون کرتیں۔ اسے نہ بتاتیں، مگر وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا سنتا رہتا۔

"پلیز بھائی! مجھے اس طرح منع مت کریں۔ میں ابا سے ملنا چاہتی ہوں۔ بس میں اور جہان آئیں گے، کسی کو پتا نہیں چلے گا، پلیز آپ مجھے آنے دیں۔"

وہ آنسو پونچھتی منت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہوتیں۔ ایک شام اس نے ہمت مجتمع کر کے ابا کے کمرے کا ایکسٹینشن ریسیور تب اٹھایا، جب ابا سو رہے تھے اور ممی لونگ روم میں بیٹھی پاکستان بات کر رہی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے بہن! بابا بالکل ٹھیک ہیں۔ تم یہاں آنے کا مت سوچو۔" دوسری طرف فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔

"مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آنا چاہتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہارے اس مفرور شوہر نے سارے زمانے میں ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم پہلے ہی لوگوں سے اس بات پہ منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ ہمارا بہنوئی مفرور ہے اور سیاسی پناہ لے کر رہ رہا ہے۔ اب تم آؤ گی تو ساری دنیا کیا کہے گی؟"

"مجھے ابا سے زیادہ کسی کی پروا نہیں ہے اور سکندر میرے ساتھ تو نہیں آ رہے۔ میں بس ایک دن کے لیے آ جاتی ہوں، اگر رشتہ داروں سے سامنا ہو گیا، تب بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابا سے ملنے آنے پہ کون مجھ پہ انگلی اٹھا سکتا ہے بھائی؟" ممی کو ماموں کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"میری بات سنو بہن! ہم نے تمہارے شوہر کے اس کارنامے کے بعد لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ سکندر ذلت و شرمندگی کے باعث ساری زندگی پاکستان کا رخ نہیں کر سکتا۔ آخر کارنامہ بھی تو خاصا شرم ناک انجام دیا ہے نا۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے تم لوگوں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔"

فون لائن پہ چند لمحے کو ایک ششدر سی خاموشی چھا گئی، پھر ممی کی ڈوبتی آواز سنائی دی۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں بھائی؟ میں آپ کی بہن ہوں، آپ مجھے یوں ڈس اون نہیں کر سکتے۔ ہمارے، ہمارے بچوں کا رشتہ ہوا ہے۔"

"سلیمان کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس رشتے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ ویسے بھی یہ تم نے اپنی خود غرضی کے باعث کیا۔ تم جانتی تھی کہ سکندر نے کیا، کیا ہے اور تمہیں ڈر تھا کہ ہم لوگ تمہیں چھوڑ نہ دیں، اس لیے تم نے یہ رشتہ کیا۔"

"ہاں! میں نے دکھائی خود غرضی۔ ہاں، میں نے چھپائی حقیقت۔ مگر میں نے یہ رشتہ جوڑنے کے لیے کیا۔ صرف اس لیے کہ میں آپ سے نہ کٹوں۔ اب آپ مجھے میرے باپ سے ملنے سے روک رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ لوگوں کے سامنے جھوٹے ثابت نہ ہو جائیں؟" ممی دبی دبی چیخی تھیں۔

"اگر تم اس طرح آؤ گی تو نہ صرف ہم میں سے کوئی تمہیں لینے نہیں جائے گا، بلکہ ہم واقعتاً "تمہارے ساتھ قطع تعلق کر لیں گے اور جب ابا جان کو یہ معلوم ہو گا تو ان پہ کیا گزرے گی، یہ سوچ لینا اور یہ بھی کہ اگر ان کو کچھ ہوا تو اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو گی۔"

"بھائی!" ممی کہتی رہ گئیں مگر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے ممی کے ریسیور رکھنے کا انتظار کیا۔ پھر آہستہ سے فون رکھ کر باہر آیا۔ ممی صوفے پہ بیٹھی، سر ہاتھوں میں دیے، دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔

اس نے ٹشو کے ڈبے سے دو ٹشو نکالے اور ان کے سامنے لا کر دیے۔ ممی نے پھیکا چہرہ اٹھایا۔

"ممی! آپ ماموں کی بات نہ سنیں، ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں لینے نہیں آئیں گے تو ہمارے پاس ان کا ایڈریس ہے، ہم کیب کر کے ان کے گھر چلے جائیں گے۔"

وہ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ وہ دوسرے فون پہ سب سنتا رہا ہے۔

"ہم ان کے گھر جائیں گے، مگر ہم وہاں کچھ کھائیں گے نہیں۔" اس نے جیسے انہیں یاد دلایا۔ وہ آنسوؤں کے درمیان ہلکا سا مسکرائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں مسکرائی ہیں۔ بہت سال بعد اسے احساس ہوا کہ وہ شاید اپنے کم عمر بیٹے کی خودداری اور عزت نفس کے پاس پہ فخر سے مسکرائی تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ممی نے ماموؤں کی ایک نہیں سنی۔ انہوں نے پیسے جوڑنے شروع کیے۔ وہ زیور جو انہوں نے اپنی بھتیجی کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ بھی بیچ دیا۔ اب وہ صرف روانگی کے انتظامات میں لگی تھیں۔ ابا کی طبیعت بہت بگڑتی جارہی تھی۔ ممی کو ان کے ساتھ کسی کے رہنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ابھی روانگی میں دو دن تھے کہ ماموں کا فون آگیا۔ نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔

ممی کے لیے نانا کے انتقال کی خبر کا صدمہ اس صدمے سے کہیں چھوٹا تھا جو انہیں یہ جان کر لگا تھا کہ نانا کا انتقال اس روز نہیں، بلکہ ایک ہفتہ قبل ہوا تھا، مگر چونکہ ممی کے آنے سے ماموؤں کی عزت اور شان پہ انگلی اٹھائی جانے کا خدشہ تھا، اس لیے ان کو اطلاع ہی دیر سے دی گئی، تاکہ وہ ان کی وفات کی رسومات میں بھی شامل نہ ہو سکیں۔

وہ انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا، خط اور فون کا زمانہ تھا، مگر ممی کا نمبر اور ایڈریس (بہت دفعہ گھر بدلنے اور دیگر رشتہ داروں سے رابطہ نہ رکھنے کے باعث) فقط ماموؤں کے پاس تھا۔ اس لیے کسی اور سے بھی اطلاع نہ پہنچ سکی۔

اس روز اس نے پہلی دفعہ اپنی بہت صبر والی مضبوط ماں کو، جن کی سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے اونچی نہیں ہوتی تھی، پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتے دیکھا۔ ان کا تو جیسے سب کچھ لٹ گیا تھا۔ ان کے پاس رونے کو بہت سے غم تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس بات کا ماتم کریں۔ باپ کے مرنے کا، یا بھائیوں کے رویے کا۔

دو روز تک وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہ سکیں۔ وہ بس خاموشی سے ان کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ تیسرے روز وہ علی کرامت کی ممی کو بلا لایا۔ وہ آئیں اور ممی کو تسلی دینے لگیں۔ ممی ذرا سنبھل گئیں۔ انہوں نے کھانا بھی کھالیا۔ مگر ان کے جانے کے بعد وہ اس سے بولیں۔

"سنو جہان! میرا خیال تھا کہ تم راز رکھنا جانتے ہو۔ ہمارے مسئلے اور ہماری پریشانیاں بھی راز ہی ہوتی ہیں۔ ان کا دوسروں کے سامنے اشتہار نہیں لگاتے بیٹا!

جو انسان اپنے آنسو دوسروں سے صاف کرواتا ہے، وہ خود کو بے عزت کرواتا ہے اور جو اپنے آنسو خود پونچھتا ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بن جاتا ہے۔"

اس نے خفت سے سر ہلا دیا۔ یہ بات اس نے اپنے ذہن میں، دل میں اور ہاتھ کی لکیروں میں نقش کر لی کہ اسے اپنے مسئلے خود ہی، اکیلے اور تنہا حل کرنے ہیں۔ کبھی بھی لوگوں کو بتا کر نہ ہمدردی لینی ہے اور نہ ہی تحسین مانگنی ہے۔

ممی نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا۔ نانا جان رہے نہیں اور جن لوگوں کے دل میں ان کی اور ان کے شوہر کی عزت و حرمت نہ تھی، ان لوگوں کے درمیان جا کر وہ کیا کرتیں؟

دوبارہ وہ اس کے سامنے نہیں روئیں، مگر اب وہ بہت دکھی رہنے لگی تھیں۔

ابا کی طبیعت ان ڈراؤنے خوابوں سے بگڑنے لگی تھی، جو ان کو اب قریباً ہر رات ستاتے تھے۔ کچھ خواب تو اسے بھی آتے تھے، مگر اس کے خواب میں اس کو ملامت نہیں کیا جاتا تھا، بس وہ آواز... وہ پاک اسپائی، وہ گھوڑا، وہ فوارہ... وہ سارا منظر پھر سے تازہ ہو جاتا، ایسے جیسے زخم تازہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ابا کیا دیکھتے تھے، مگر وہ اکثر راتوں کو جاگ کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ممی کے چہرے پہ کوئی نشان دیکھتا تو جان جاتا کہ ابا نے ہاتھ میں اٹھائی چیز ان کو دے ماری ہوگی، مگر ممی کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔

یہ وہ سکندر احمد شاہ نہیں تھے جنہوں نے اپنے ملک سے غداری کی تھی۔ یہ ایک ذہنی مریض قابل رحم آدمی تھے اور اب انہیں ممی کی ضرورت تھی۔

پھر کچھ عرصہ وہ اسپتال بھی داخل رہے، پھر جب واپس آئے تو ان کو مستقل رکھنا پڑا۔ یہ دوائیں ان کو سارا دن خاموش اور پرسکون رکھتیں، چاہے وہ جاگ رہے ہوتے یا سو رہے ہوتے۔ کچھ ہی عرصے بعد ابا ایک انسان سے ایک ایسے مریض بن گئے تھے جو کمرے تک محدود ہو گئے۔ ہاں، ہر پندرہ بیس دن بعد ایک دورہ ان کو پڑتا اور وہ توڑ پھوڑ کرتے، چیختے چلاتے،

کر ممی سنبھال لیتیں۔ اپنے مسئلے خود ہی حل کرتے کرتے وہ پہلے سے بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کرامت بے کی دکان چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک چابی ساز کے پاس نوکری کر لی تھی۔ شام میں اب وہ اس کی دکان پہ جاتا جو ان کے گھر سے دس منٹ کے پیدل راستے پہ تھی۔ اگر اسے کسی کام میں مزا آتا تھا تو وہ چابیاں بنانے میں تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ صرف سیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ عام چابیوں کے بعد وہ چائنیز تالوں اور پیچیدہ اقسام کے سیف کی کنجی سازی سیکھنے لگا۔ اس کے پاس لائبریری سے لی گئی ان کتابوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا جن میں لاک توڑنے یا کنجی سازی کے متعلق کوئی بھی معلومات ہوتی۔ بہت مہارت سے بنا ضرب لگائے تالا توڑنا، چاہے وہ ماسٹر کی سے یا لوہے کی پن سے، وہ اس فن میں طاق ہوتا جا رہا تھا۔

ان سب مشغلوں کا اثر اس کی پڑھائی پہ البتہ ضرور پڑا۔ وہ کبھی بھی بہت لائق قسم کا طالب علم نہیں بن سکا۔ اس کے گریڈز ہمیشہ میڈیم رہے۔ وہ ذہین تھا، مگر اس کو پڑھائی میں دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے کام اسے زیادہ دلچسپ لگتے تھے۔

اس کی چودھویں سالگرہ گزرے زیادہ وقت نہیں بیتا تھا۔ جب فرقان ماموں نے اطلاع دی کہ وہ اور سلیمان ماموں ترکی آ رہے ہیں۔ خون، پانی سے گاڑھا ہوتا ہے، اس نے یہ دیکھ لیا۔ ممی پرانی تلخیاں بھلا کر ان کے آنے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ انہوں نے جیسے دل سے ماموں کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ماموں ان کے اس سوال کے جواب میں یہاں آ رہے تھے، جو چند روز پہلے انہوں نے فون پہ ان سے پوچھا تھا کہ اگر وہ اور جہان، سکندر شاہ کو لے کر پاکستان آئیں اور ان کا مقدمہ لڑیں تو کیا ماموں ان کو مورل سپورٹ دیں گے۔ مالی مدد کا ایک ٹکا نہیں چاہیے تھا انہیں، بس ماموؤں کا ساتھ درکار تھا۔ فرقان ماموں جواباً "خاموش ہو گئے تھے، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ اور سلیمان کچھ روز تک آئیں گے، تب اس بارے میں بات کریں گے۔

ممی کی اور بات تھی، مگر اس کا دل اپنے ماموں سے اتنا بدظن ہو چکا تھا کہ اسے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہوئے ممی کو سنتا رہتا جو اب اٹھتے بیٹھتے کہا کرتیں۔

"ہم پاکستان ضرور واپس جائیں گے، اتنے برس ہو چکے ہیں، لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ اب یہ جلاوطنی ختم ہونی چاہیے۔ بھائی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ میرے بھائی، بہت..."

اور ممی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماموؤں کی خوبیاں گنواتی رہتیں۔ اس نے بہت عرصہ بعد انہیں اس طرح خوش اور پرامید دیکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ نہیں سکا کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے انہیں اب دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ انہیں اپنی کہی بات یاد رکھنی چاہیے، مگر ممی بھائیوں کے نرم رویے دیکھ کر انہیں دوسروں کی فہرست سے نکال کر اپنوں میں لے آئی تھیں۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ یہ سب کہہ کر ماں کو مغموم کرے۔ ابا کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا، مگر ممی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ ان کی مشقت، محنت، قربانیاں اور ایک کمزور عورت سے ایک مضبوط عورت میں ارتقا کا عمل جو اس نے عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے بہت دعا کی کہ ممی دکھی نہ ہوں، مگر اسے لگتا تھا کہ ممی غلط لوگوں سے امید لگا کر دکھی ضرور ہوں گی۔ لیکن جو ہوا، وہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دونوں ماموں آ ہی گئے دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ برتن اٹھا کر انہیں کچن کے سنک میں دھونے کے لیے جمع کر رہا تھا تو ممی اور ماموؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

"بالکل، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم لوگ پاکستان آجاؤ۔" صوفے پہ بہت کروفر سے بیٹھے رعب دار سے فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔ ان کی بات پہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچن میں کھڑا جہان تو ایک طرف، ممی بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اتنی جلدی ماموں مان جائیں گے، ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ آ کر رہو۔ وہ سب تمہارا ہی ہے سبین! پرانی باتیں بھول جاؤ، آگے کی سوچو۔ جہان کی پوری زندگی پڑی ہے۔ وہ بھی وہیں پڑھ لے گا، پھر ہائی اسکول کے بعد ہم اسے باہر بھیج دیں گے، کسی بہت اچھی یونیورسٹی میں۔ آخر وہ ہمارا بیٹا ہے اور پھر ہمارا داماد بھی تو بنے گا۔"

فرقان ماموں نے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان ماموں پہ ڈالی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں سر کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ ایسے ہی تھے، بڑے بھائی کے ادب میں ان کی ہر بات کی تائید کرنے والے۔

"تم جہان کی زندگی کا سوچو سبین! اس کو ایک بہترین مستقبل دو، ہم اس کے بڑے ہیں، ہم اس کو باپ بن کر پالیں گے۔"

باپ بن کر؟ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ اس نے نل بند کر دیا۔ لاؤنج میں خاموشی تھی، مگر ایک آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جو بند نل کے منہ سے قطرے ٹپکنے کی ہوتی ہے، جو اس کی ماں کی ساری امیدوں، خوابوں اور توقعات کے بہنے کی تھی۔ اسے ماموں کی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر کئی دن سے خود کو بہلانے والی اس کی ماں فوراً" سمجھ گئی تھی۔

جب ممی بولیں تو ان کی آواز میں بھائیوں کی محبت کو ترسی، رشتوں پہ مان رکھنے والی عورت نہیں، بلکہ ایک خوددار عورت کی جھلک تھی، جس کے نزدیک اپنے گھر کی خودداری سب سے بڑھ کر تھی۔

"میرے بیٹے کا باپ ابھی زندہ ہے بھائی! اور اس کی ماں کے ہاتھ بھی سلامت ہیں۔ میں خود محنت کر کے اسے پاکستان بھی لے جا سکتی ہوں اور سکندر کا کیس بھی لڑ سکتی ہوں۔ مجھے سکندر کو مظلوم ثابت نہیں کرنا، بلکہ بیماری کے باعث سزا میں کمی کی اپیل کرنی ہے اور مجھے آپ سے مورل سپورٹ کے علاوہ کچھ نہیں درکار تھا۔"

"تم ایک انتہائی ضدی عورت ہو۔" فرقان ماموں ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ "جس مغرور اور بدنام آدمی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، تم اس کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"وہ آدمی میرا شوہر ہے اور بیمار ہے۔ وہ مجھ پہ انحصار کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں میں اسے چھوڑ دوں؟"

"اور جو اس نے کیا، وہ؟"

"اس کا فیصلہ کرنے والے آپ یا میں نہیں، عدالت ہے اور اب تو وہ بیمار ہیں۔ ان کو میں کس طرح اکیلا چھوڑ سکتی ہوں؟ نفرت گناہ سے کی جاتی ہے گناہ گار سے تو نہیں۔"

"یعنی کہ تم اس کو ہر جرم سے بری الذمہ قرار دے رہی ہو؟" ماموں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی، لیکن آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہم نے جلاوطنی کاٹی ہے اور کئی برس کاٹی ہے۔ اب وہ بیمار ہیں۔ سکندر وہ انسان نہیں رہے جنہوں نے جرم کیا تھا، وہ صرف ایک مریض رہ گئے ہیں۔ آپ مجھ سے یہ کہہ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں؟" ممی کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے بھر گئیں۔

"اگر تم یوں اس کا ساتھ دو گی تو تم ہر رشتہ کھو دو گی۔ سب تم سے دور ہو جائیں گے سبین! تم غلط کر رہی ہو۔" سلیمان ماموں نے دھیمے مگر افسردہ انداز میں کہا۔

"اگر میری فیملی کو کاٹ کر سب مجھ سے خوش رہتے ہیں تو مجھے یہ خوشی نہیں چاہیے، نہ ہی ایسے رشتے۔" انہوں نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکنے دیا۔ رندھی ہوئی آواز میں وہ سر اٹھا کر مضبوطی سے بولی تھیں۔

"تم ہماری بات مان لیتیں۔ سکندر سے طلاق لے کر ہمارے ساتھ چلتیں تو ہم تمہارے بیٹے کو بھی پڑھاتے اور اسے سر اٹھا کر جینے کے قابل بناتے لیکن اگر تم ہماری بات یوں رد کرو گی تو ہم بھی کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔" فرقان ماموں کا انداز دوٹوک اور مزید سخت ہو گیا تھا۔ وہ ترکی فتح حاصل کرنے آئے تھے تاکہ جب بہن کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائیں تو سر اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکیں کہ انہوں نے ایک قابل نفرت آدمی کو اپنے خاندان سے نکال پھینکا اور پھر بہن، بھانجے کے سر پہ ہاتھ رکھنے پہ انہیں تحسین و تمغے بھی مل جائیں مگر ممی کو اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے یہ مظلوم، ترحم آمیز کردار منظور نہ تھا۔ وہ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھیں۔

"پہلے بھی آپ نے کب میرا ساتھ دیا جو اگر اب نہیں دیں گے تو کوئی فرق پڑے گا۔"

"تم رشتوں کو کھو کر پچھتاؤ گی۔"

"میں رشتوں کو جان کر بھی پچھتا ہی رہی ہوں بھائی! کتنے ہی سیاست دان ہیں جو ملک سے غداری کر کے باہر چلے جاتے ہیں، مگر ان کی واپسی پہ آپ ہی ان کو ووٹ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ امیر لوگ ہوتے ہیں ہم آپ کی نظروں میں معیوب اس لیے ہیں کیونکہ ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس ترکی میں لمبی چوڑی جائیداد نہیں ہے۔ کوئی بہت اونچا سوشل اسٹیٹس نہیں ہے اگر ہوتا تو آپ کبھی ہم سے یوں قطع تعلق نہ کرتے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں رہو گی تو کیا عزت سے رہو گی؟ نہیں۔ تم ہمیشہ معیوب ہی رہو گی۔ ایک مغرور قومی مجرم کی بیوی بن کر ذلیل ہو گی ہمیشہ۔"

فرقان ماموں غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلیمان ماموں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بڑے ماموں سے متفق ہیں۔ البتہ ان کو اس طریقہ کار سے اختلاف تھا، لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

"اور تم۔۔۔" بڑے ماموں کی نظر کچن کے دروازے میں کھڑے اس دبلے پتلے لڑکے پہ پڑی تو انہوں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ "تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے، کیونکہ تمہارا باپ تمہارے نام پر ایک شرم ناک دھبہ ہے۔ تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے جھکاتا رہے گا۔ تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے۔"

وہ غصے میں بولتے کانپنے لگے تھے اور کانپ تو اس کا دل بھی رہا تھا۔ وہ بہت ہراساں سا دروازے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا تھا۔

"بس کریں بھائی! میرے بیٹے کو یوں ٹارچر مت کریں!" اس نے اپنی ماں کو اپنے سامنے آ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا قد اپنی ماں سے ذرا سا اونچا تھا، پھر بھی وہ اس کے سامنے ایک ڈھال تھیں۔

"کیوں؟ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے کتنا غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا، جو تمہارے بیٹے کے لیے اپنے ملک عزت سے لوٹنے کا واحد راستہ تھا، مگر تم نے وہ ٹھکرا دیا۔ تم نے اپنی ضد کی وجہ سے اس کی زندگی بھی جہنم بنا دی ہے۔"

"میں اس کی زندگی جہنم نہیں بننے دوں گی۔ سنا آپ نے؟ یہ سر اٹھا کر جیے گا۔ یہ میجر احمد کا پوتا ہے۔ یہ ان ہی کی طرح فوج میں جائے گا۔ مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھیجوں گی اپنے بیٹے کو فوج میں اور آپ دیکھیے گا، میرا بیٹا ایک دن سر اٹھا کر ضرور جیے گا۔" اس نے اپنی نرم خو ماں کو اپنے سامنے ڈھال بن کر کہتے سنا۔

"فوج؟ مائی فٹ!" فرقان ماموں نے میز پہ رکھا اپنا سگریٹ لائٹر اٹھاتے ہوئے استہزائیہ سر جھٹکا۔ "تم بھول رہی ہو سبین! تمہارا بیٹا "غدار کا بیٹا" ہے اور غدار کے بیٹے کو فوج میں کبھی نوکری نہیں ملتی۔ ارے! وہ تو اسے چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ اس لیے ایسی کوشش بھی مت کرنا اور اگر کرنے کے بعد بے عزت کر کے نکالے جاؤ تو مدد کے لیے میرا دروازہ نہ کھٹکھٹانا۔"

بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شعلہ بار نگاہوں کا رخ جہان کی طرف کیا جو بالکل دم سادھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی طرح انگشت شہادت اٹھائے انہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اسے ان آخری الفاظ سے متنبہ کیا جو ایک عمر اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔

"تم لوگوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا، لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاووں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤ گے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ ملال زدہ سے سلیمان ماموں بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔

ممی سر ہاتھوں میں لیے صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں اور وہ اسی طرح بت بنا کچن کی چوکھٹ پہ کھڑا رہا۔ فرقان ماموں کے الفاظ نے اس کا اندر باہر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی، کتوں کی سی زندگی گزارنے کی بددعا..... ماموں نے اپنی زخمی انا کی تسکین کے لیے کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا۔ تب اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی سر اٹھا کر نہیں جی پائے گا۔ وہ فوجی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا، پاک اسپائی بننا تو پھر دور کی بات تھی۔ یہ احساس ہی اس کے سارے خوابوں کو ڈبو گیا۔ کئی دن تک تو وہ اور ممی نارمل ہی نہیں ہو سکے۔ دونوں چپ چپ سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے، اپنے کام نپٹاتے رہتے۔ آہ! وہ بہت تکلیف دہ دن تھے۔

مگر ممی روئیں نہیں۔ انہوں نے اپنا کام بڑھا لیا۔ اس نے بھی اپنے کام کا دائرہ کار بڑھا دیا۔ ابا کی بیماری بھی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی قابو سے باہر ہو جاتے۔ چیختے چلاتے، ہاتھ میں آئی چیز دے مارتے، ان بلیو پرنٹس کا ذکر کرتے جو انہوں نے آگے بھیجے تھے۔ اس پاک اسپائی کا ذکر کرتے جس کو انہوں نے قتل کیا تھا، مگر اب ممی اور وہ انہیں سنبھال لیا کرتے۔ بس خود کو سنبھالنے میں انہیں بہت عرصہ لگا تھا۔ کہنے والے تو کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر سننے والوں کے لیے وہ باتیں ساری زندگی کے لیے ایک چبھن بن جاتی ہیں۔

وقت پھر بھی گزرتا گیا۔ باسفورس کے پل تلے پانی بہتا گیا۔ سمندری بگلے استنبول کے اوپر پرواز کرتے رہے۔

وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا، جب پیون نے آکر اسے اطلاع دی کہ ہاؤس ماسٹر کے آفس میں کوئی ملاقاتی اس کا منتظر ہے۔ وہ الجھتا ہوا کلاس سے نکلا اور ہاؤس ماسٹر کے آفس کے دروازے تک آیا۔ اندر جیسے کوئی طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہاؤس ماسٹر کے آفس کے اندر جیسے کوئی طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔

کھلی درازیں، بکھرے کاغذ، ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی۔ ہاؤس ماسٹر احمت طور پریشانی کے عالم میں ایک دراز کھنگال رہے تھے۔ ان کا اسسٹنٹ دوسری دراز کی چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ ذرا دور رکھی کرسی پہ ایک صاحب خاموشی سے بیٹھے تھے۔

"آخر چابی گئی کدھر؟" احمت بے جھنجلا کر کہہ رہے تھے۔ جہان کی نظریں دیوار کے ساتھ لگے لاکر پہ پھسل گئیں، جو مقفل تھا۔ یقیناً "اس کی چابی نہیں مل رہی تھی۔

"بولو! بتاؤ، اب میں ہیڈ ماسٹر کو کیا کہوں کہ میرے اسسٹنٹ کی لاپروائی کی وجہ سے لاکر نہیں کھل رہا اور فائل نہیں نکالی جا سکتی؟" اپنی جھنجلاہٹ اور پریشانی میں انہوں نے دروازے میں کھڑے لڑکے کو نہیں دیکھا تھا۔

"سر! میں نے یہیں رکھی تھی، میں ڈھونڈ رہا ہوں ابھی....." اسسٹنٹ کی بات کو فون کی گھنٹی نے کاٹا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

"جی، جی سر! بس احمت بے آپ کے پاس فائل لا رہے ہیں۔ جی بس ایک منٹ!" بمشکل اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے اس نے فون پہ کہا اور پھر ہاؤس ماسٹر کو دیکھا، جن کے سرخ پڑتے چہرے کے تاثرات ناقابل بیان ہو رہے تھے۔

"سر.....!" اس نے انگلی کی پشت سے دروازہ بجایا۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے انہیں بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے صاحب نے بھی گردن پھیر کر اسے دیکھا تھا۔

"میں مدد کروں؟"

"کیا؟" ان کے چہرے پہ الجھن در آئی۔

وہ خاموشی سے آگے آیا اور لاکر کے کی ہول کو انگلی سے چھو کر جیسے کچھ محسوس کیا۔ کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ ساری کھٹر پٹر، متحرک ہاتھ، سب ٹھہر گیا۔

اس نے پینٹ کی جیب سے تین پنیں نکالیں، پھر ان میں سے ایک الگ کی اور باقی واپس جیب میں ڈال دیں۔ آگے ہو کر اس نے وہ پن ترچھی کر کے کی ہول میں ڈالی، پھر گردن اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔

وہ تینوں نفوس جیسے دم سادھے اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نچلا لب دانت سے دبائے، اپنے ہاتھ کو مخصوص سمتوں میں اوپر نیچے کر رہا تھا، جیسے موسیقی کا کوئی ردھم ہو۔ چند لمحے سرکے اور کلک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ اس نے پھر گردن موڑ کر وال کلاک کو دیکھا۔ ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ لگے تھے۔ اسے مایوسی ہوئی۔ شاپ پہ اس طرز کا سیف کھولنے میں اسے کم سے کم پچاس سے بچپن سیکنڈ لگتے تھے۔

اس نے ہینڈل گھمایا۔ سیف کا دروازہ کھولا اور بہت ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔

"تم نے..... تم نے یہ کیسے کیا؟" ہاؤس ماسٹر ششدر تھے۔

"سر! اگر آپ میری کہانی سننے میں وقت ضائع کریں گے تو فائل ہیڈ ماسٹر کے پاس کب پہنچے گی؟" کسی اچھے چابی ساز کی طرح اس نے اپنا راز نہیں کھولا۔

"اوہ ہاں!" وہ پیشانی کو ہاتھ سے چھوتے اٹھے۔ "تمہارا شکریہ ینگ مین!"

ان کے جانے کے بعد وہ ان صاحب کی جانب متوجہ ہوا جو کرسی پہ بیٹھے بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں جہان سکندر ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسکول ریکارڈ میں تمہارا نام جہان سکندر احمد لکھا تھا، حالانکہ سکندر کا سرنیم "شاہ" ہے۔"

"احمد میرے دادا کا نام تھا، میں ان کا نام ساتھ لگاتا ہوں، مگر آپ میرے ابا کو کیسے جانتے ہیں؟" بات کرتے ہوئے اس کے اندر کچھ اتھل پتھل سی ہوئی تھی۔ فرقان ماموں سے آخری ملاقات پھر سے تازہ ہو گئی۔ ان لوگوں کا سامنا کرنا جو اس سے اس کے باپ کے حوالے سے واقف ہوں، بہت اذیت ناک تھا۔

"ہم باہر چل کر بات کر سکتے ہیں؟" وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ پلٹ گیا۔

"میں تمہارے ابا کا ایک زمانے میں بہت اچھا دوست رہا ہوں۔ کرنل رؤف گیلانی، شاید تم نے میرا نام سنا ہو؟" باہر اسکول کے فٹ بال کے میدان کے کنارے پہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے غور سے ان کو دیکھا۔

وہ سفید اوور کوٹ میں ملبوس اچھے قد کاٹھ کے مہذب سے انسان لگتے تھے۔ مگر ان کے چہرے پہ ایک نقاہت تھی اور ان کی آواز سے کمزوری جھلکتی تھی۔ اگر وہ ابا کے دوست تھے تو ان کو اتنا معمر نہیں لگنا چاہیے تھا، جتنے وہ لگ رہے تھے۔ شاید بیمار تھے۔ اسے بے اختیار دادا کا چہرہ یاد آیا جو ان کی زندگی کی آخری رات اس نے دیکھا تھا۔ تھکا زدہ، بیمار چہرہ۔

"تمہارے ابا قصوروار تھے مگر انہوں نے بہت کچھ میرے اوپر ڈال دیا اور ملک سے فرار ہو گئے۔ میں نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی کئی سال ٹارچر سیل میں سزا کاٹی۔ تین برس ہوئے میں باعزت بری کر دیا گیا ہوں۔ سارے چارجز ہٹ گئے ہیں۔ میرے بچے پھر سے سر اٹھانے کے قابل ہو گئے ہیں اور اب جب کہ میں علاج کے لیے لندن جا رہا تھا تو سوچا ایک دن کے لیے ترکی آ جاؤں۔ اس لیے نہیں کہ میں سکندر کی بربادی کا تماشا دیکھوں، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جس شخص نے ان کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی کے کئی برس برباد کر دیے۔ اس کے بیٹے کو وہ کیوں دیکھنا چاہتے تھے، وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میرا بیٹا حماد بھی تمہاری عمر کا ہے۔ اس نے بھی بہت برا وقت گزارا ہے۔ میری بیوی نے بھی سزا کاٹی ہے۔ وہ بھی اتنے بے قصور تھے جتنے تم اور تمہاری والدہ۔"

"ہم سکندر شاہ کے گھر والے ہیں اور ہم یہ سب ڈیزرو کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے سر!" اس کی آواز میں تلخی گھل گئی تھی۔

"نہیں، تم یہ ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔ جلاوطنی کی سزا سب سے اذیت ناک سزا ہوتی ہے۔ تم لوگوں نے بہت عرصہ یہ سزا کاٹی ہے۔ کیا اب وہ وقت نہیں آگیا کہ تم سر اٹھا کر جیو جیسے اب حماد جیے گا؟"

"اس کے فادر بے قصور تھے، میرے قصوروار ہیں۔ میں کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکتا، میں جانتا ہوں۔" وہ دونوں ایک درخت تلے نصب بینچ پہ بیٹھ گئے تھے۔ سامنے سرسبز سا میدان تھا جس پہ سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں۔ استنبول میں سرما کا سورج ایسا ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔

"مجھے تم سے ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارا خیال ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کی اذیت دیکھی ہے بچے! اور میں آج تمہاری ماں سے جب ملا تو میں نے انہیں بھی اسی اذیت میں دیکھا۔ وہ سکندر کو نہیں چھوڑ سکتیں، مگر تم تو اپنے ملک واپس جاسکتے ہو۔"

"میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں میں کبھی فوج میں نہیں جاسکتا۔ مجھے وہ کبھی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ میں پھر سے ذلیل ہونے وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

وہ بہت تکلیف سے بول رہا تھا۔ فرقان ماموں کی باتیں کسی انی کی مانند ابھی تک دل میں گڑی تھیں۔

"یہ تمہیں کس نے کہا کہ تمہیں فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا؟" وہ حیران ہوتے۔

"کیونکہ میں ایک غدار کا بیٹا ہوں اور غدار کے بیٹے کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں کسی نے غلط گائیڈ کیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں نامور ملکی غداروں کے نام گنوا سکتا ہوں۔ جن کے خاندان کے کتنے ہی لڑکے فوج میں کام کر رہے ہیں۔ اگر تم قابل ہو اور تم ایک دفعہ پھر سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے ملک واپس آجاؤ۔"

وہ کتنی ہی دیر بیٹھے اسے سمجھاتے رہے کہ اسے ایک دفعہ کوشش کرنا چاہیے اور پھر ملک کے لیے قابل قدر خدمت سرانجام دے کر وہ اپنے خاندان کے نام پہ لگا دھبہ مٹا سکتا ہے۔ اچھائی برائی کو ڈھانپ دیتی ہے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی اگلے سال آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دینے جا رہا تھا، وہ بھی ہائی اسکول ختم کر کے ان کے پاس آجائے اور ساتھ ہی امتحان دے۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر اسے کوئی شک و شبہ تھا کہ وہ دھوکے سے اس کے باپ کو ملک واپس لے جانے اور سزا دلوانے کے لیے یہ سب کر رہے تھے تو وہ زائل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ان کو کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ وہ اس نہج پہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ فرقان ماموں کی خواہش کے مطابق وہ کتوں کی طرح ذلیل ہو کر زندگی گزار تو رہے تھے، باعزت جینے کا حق ان کو نہیں تھا۔

سہ پہر میں جب وہ گھر لوٹا تو ممی نے کرنل گیلانی کی آمد کا بتایا اور یہ بھی کہ وہ ان سے اسکول کا پتا پوچھ کر گئے تھے۔ ان کی فلائٹ شام میں تھی اور وہ آج ہی اس سے ملنا چاہتے تھے۔ پھر اس نے بھی سب کچھ بتا دیا۔

"مگر میں ادھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے فرقان ماموں کے گھر نہیں جانا۔ میں ان لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملنا چاہوں گا۔" اس نے اپنے تئیں بات ختم کر دی تو ممی خاموش ہو گئیں۔

لیکن سوچیں خاموش نہیں ہوئیں۔ خواب خاموش نہیں ہوئے۔ وہ خواب کسی بوجھ کی طرح دل کو گھیرے رہا۔ کچھ دن بعد نیند میں وہ خود کو وہیں پاتا۔ انطاکیہ میں وہ بڑا سا دالان، فوارہ اور ساتھ کھڑا گھوڑا

اور جب وہ پلٹنے لگتا تو اسے پکارا جاتا۔ شعور کی منزلیں طے کرتے کرتے وہ خواب جو آغاز میں "خوف" تھا، اب "دکھ" بنا گیا۔ جانے وہ کون تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اس وجیہہ آدمی کو دفنایا تھا، مگر وہ کبھی اس کے خاندان کو نہیں تلاش کر سکے گا۔ اس کی بیوی بچے برسوں اس کی راہ تکیں گے۔ حکومت، فوج، کبھی کسی کو علم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کہاں دفن تھا۔ جاسوس کی زندگی، جاسوس کی موت، یہی تھی جاسوس کی قسمت۔

پھر کیوں جوانوں میں یہ ہمت ہوتی تھی کہ وہ اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیں؟ وہ کہاں سے یہ جذبہ اپنے اندر لاتے تھے کہ بنا وردی، بنا تمغوں اور بنا ستائش کے خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے صرف کر دیں؟ چپ چاپ اپنا فرض نبھائیں اور چپ چاپ مر جائیں؟ بلاشبہ وہ عظیم لوگ تھے اور وہ ان میں سے کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بعض دفعہ انسان اپنے خواب کسی شیشے میں ڈال کر ان کو سیل بند کر دیتا ہے۔ موم کی ایسی سیل جو کوئی کھول نہ سکے۔ اس نے بھی اپنے خواب مہر بند کر دیے تھے۔

یہ چند ماہ بعد کی بات تھی۔ ابھی اس کا ہائی اسکول ختم نہیں ہوا تھا کہ اسکول کا ایک ٹرپ انطاکیہ کے لیے پلان ہونے لگا۔ تاریخی اور قدیم شہر انطاکیہ جانے کے لیے تمام طلبا و طالبات بہت پرجوش تھے۔ وہ بھی تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کو اپنے خوابوں سے پیچھا چھڑانے کا راستہ نظر آگیا تھا۔ ممی سے اس نے بہت اصرار سے اس فارم ہاؤس کا پتا پوچھ لیا جس کے دالان میں فوارے کے ساتھ کچھ "آثار" ثبت تھے۔ وہ ان آثار کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ابا کا راز اور نہ ہی اپنا ارادہ جو کہ اس فارم ہاؤس کے مالک کو یہ کہانی سنانے کا تھا کہ وہ اس جگہ کو اکثر خواب میں دیکھتا ہے، شاید یہاں کوئی دفن ہے۔ وہ اسے راضی کر لے گا، وہ اس جگہ کی کھدائی کرے، پھر جب وہ لوگ اس پاک اسپائی کی نعش ڈھونڈ لیں گے تو وہ پاکستانی سفارت خانے اطلاع کر دے گا۔ شاید اس کی نعش واپس پاکستان بھجوانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

اس وجیہہ صورت پاکستانی اسپائی کو اس کے خاندان کو واپس لوٹانے کا اس سے بہتر لائحہ عمل اسے نہیں معلوم تھا۔ بالآخر وہ اس قرض کو اتار دے گا جو دادا نے کہا تھا کہ اس کے کندھوں پہ آگرا ہے۔ بالآخر وہ ابا کے راز کے بوجھ سے نجات حاصل کر لے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ نعش آج بھی ویسی ہی گرم اور نرم ہوگی۔ اس کا خون اب بھی بہہ رہا ہوگا اور اس کی گردن پہ اب بھی پسینے کے قطرے ہوں گے۔ شہید مرتے تھوڑا ہی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بہت دقتوں سے وقت نکال کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس فارم ہاؤس پہنچا۔ اندر کا راستہ اسے ابھی تک یاد تھا۔ بس اس گیٹ کو عبور کر کے ذرا آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائے گا تو وہاں سے فوارے والا دالان صاف نظر آئے گا۔ گیٹ سے وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ ملازم نے اسے اندر آنے دیا اور فارم کے مالک کو بلانے چلا گیا۔ جہان ادھر نہیں رکا، وہ تیز قدموں اور دھڑکتے دل کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے آیا اور عمارت کے دائیں جانب سے آمڑا تاکہ دالان... مگر...

وہ دالان کے عین سرے پہ ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ چند لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

اس نے ہر چیز سوچی تھی، سوائے اس کے کہ آٹھ برس بیت چکے تھے۔ سامنے، جہاں پہلے کچی مٹی کا وسیع احاطہ اور درمیان میں فوارہ تھا، اب وہاں ایک گہرا اور خوب لمبا چوڑا سا تالاب تھا۔

وہ بے دم سا گھٹنوں کے بل زمین پہ آگرا۔ تالاب؟ اتنا بڑا تالاب؟ اس کو تعمیر کرنے کے لیے تو کئی فٹ نیچے تک زمین کھودنی پڑی ہوگی تو کھدائی کے دوران اس نعش کا کیا بنا ہوگا؟

"آپ کو یقیناً" خواب میں ایسا کچھ نظر آتا ہوگا، مگر یقین کریں! چار سال پہلے اس پوری جگہ کی کھدائی میرے سامنے ہوئی تھی۔ میں ایک دن بھی مزدوروں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے سر سے نہیں ہٹا اور ہم نے بہت نیچے تک زمین کھودی تھی۔ یہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ انسانی لاش تو دور کی بات کپڑے کا ٹکڑا بھی نہیں ملا۔"

جب فارم کا مالک آیا تو اس کی کہانی سن کر بہت وثوق سے بتانے لگا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

"ہاں! صرف ایک بات تھی۔" وہ کہتے کہتے ذرا رکا' اور پھر جیسے یاد کرکے بولا۔ "اس جگہ کی مٹی بہت اچھی تھی۔ اس سے عجیب سی خوشبو آتی تھی۔ ایسی خوشبو جو ہم نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ اس کی وجہ میں شاید کبھی معلوم نہ کرسکوں۔"

بہت سے آنسو اس نے اپنے اندر اتارے تھے۔ وہ خوشبو کی وجہ جانتا تھا' مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پاک اسپائی کی نعش کہاں گئی مگر یہ تو طے تھا کہ اس زندگی میں وہ کبھی نہیں جان پائے گا اور طے تو یہ بھی تھا کہ اس نے اس پاک اسپائی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

اس واقعے نے اسے ایک بات سمجھادی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جاسوس لاوارث خاموشی سے مر جاتا ہے تو وہ غلط تھا۔ اللہ بہت غیرت والا ہے۔ کسی کا احسان نہیں رکھتا۔ جو آدمی اس کے لیے جان دے دے' وہ اسے لاوارث چھوڑ دے گا؟ اس کو اپنی زمین میں باعزت جگہ بھی نہیں دے گا؟ یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا۔

اس روز اسے شدت سے فرقان ماموں کی باتیں یاد آئیں مگر آج ان باتوں کی تکلیف پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے۔

"تم ذلیل ہوگے' تم خوار ہوگے' تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکوگے۔ تم کتوں کی سی ذلیل زندگی گزاروگے۔"

مگر اب بالآخر اس کے خوابوں پہ لگی موم کی مہر پگھل گئی تھی۔ سارے خواب پھر سے لفافے سے باہر آ گئے تھے۔

نہیں' وہ ان کی باتوں کو درست ثابت نہیں ہونے دے گا۔

وہ واپس جائے گا اور وہ بہت محنت کرے گا۔ وہ اپنے ملک سے وفاداری کا عہد نبھائے گا۔ یوں مفرور مجرموں کی طرح ایک دوسرے ملک میں ساری زندگی چھپ کر نہیں گزار دے گا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کیوں نہیں جی سکتا؟ نہیں' وہ کتوں کی سی ذلیل و رسوا کن زندگی نہیں جیے گا۔ وہ حشر کے بڑے دن اپنے دادا کو کیا چہرہ دکھائے گا۔ اسے سرخرو ہونے کے لیے وہی نوکری کرنی تھی جو اس کے باپ نے کی' مگر اسے اپنے خاندان اور دادا کے نام پر سے ذلت کا دھبہ اتارنے کے لیے وہ نہیں کرنا تھا' جو اس کے باپ نے کیا۔ اس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اچھائی' برائی کو رفع کردیتی ہے۔ اور وہ یہ سب کرکے دکھائے گا۔ وہ فرقان ماموں کو یہ ثابت کرکے دکھائے گا کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا' جب وہ ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہوگا۔ اس دن سرخرو ہوجائے گا' اس کی ماں اور دادا سرخرو ہوجائیں گے۔

اپنے تمام تر عزم و ہمت کے باوجود ایک بات طے تھی۔ اگر وہ پاکستان جائے گا تو کرنل گیلانی کے پاس جائے گا' یا کسی اور کے پاس یا فٹ پاتھ پہ رات بسر کرلے گا مگر ماموں کے گھر نہیں جائے گا۔

"تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاووں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤگے۔" یہی کہا تھا نا انہوں نے۔ اب اس کی عزت اسی میں تھی کہ وہ ماموں کی طرف نہ جائے۔ اس کے لیے یہ عزت نفس کا مسئلہ تھا' مگر ممی یہ سب کسی اور وجہ سے چاہتی تھیں۔

"میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ تم بھی فوج میں جاؤ اور میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ماموں اس بارے میں کچھ جانیں۔ میں اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اس چیز کو اپنی شکست سمجھتے ہوئے ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تمہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ تم ان

کے سہارے کے بغیر کچھ بن جاؤ' اور سب سے بڑی بات' آرمی میں کوئی عہدہ پالو' وہ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہوکر تمہیں اپ سیٹ کردیں گے۔"

"پھر ہم اسے راز کیسے رکھیں گے؟"

اس کی بات پہ ممی مسکرائی تھیں۔

"کم آن جہان! تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔"

"مگر انہیں پتا چل جائے گا ممی!"

"دیکھو! ایک نہ ایک دن ان کو پتا تو لگنا ہی ہے' مگر تب تک تمہیں اس قابل ہوجانا چاہیے کہ تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہوسکو۔ ویسے بھی ہر سال سیکڑوں کیڈٹ بھرتی ہوتے ہیں' تمہارے ماموں کو کیا معلوم کہ ان کے نام کیا ہیں اور وہ کون ہیں؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ یہ اتنا مشکل بھی نہیں تھا' جتنا وہ پہلے سمجھ رہا تھا۔

"ہمارا استنبول میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ حلقہ احباب بھی تھوڑا سا ہے۔ میں سب کو کہہ دوں گی کہ تم انقرہ گئے ہو' وہاں کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔"

"نہیں! انقرہ میں سلجوق عمران کے کزنز پڑھتے ہیں' وہ میرے ہم عمر ہیں' انقرہ کہا تو پول کھل جائے گا۔ یونان ٹھیک رہے گا۔" ممی نے نم مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں' تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔"

ممی کے بقول' ماموں کے آس پاس خاندان میں دور دور تک کوئی فوج میں نہ تھا۔ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں اگر کوئی آرمی فیملی تھی بھی تو سکندر شاہ کے مشہور زمانہ کیس کے بعد فرقان ماموں وغیرہ اب ایسے دوستوں سے احتراز برتتے ہیں۔ کرنل گیلانی ویسے بھی لاہور میں رہائش پذیر تھے' یوں جب وہ پاکستان گیا تو اسے اپنے ماموں کے شہر نہیں جانا پڑا تھا۔

ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر فرقان ماموں جان لیں گے کہ وہ ادھر ہی ہے اور اس وقت کا سوچ کر وہ خوف زدہ ہوجاتا تھا۔ ممی کے سامنے وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اپنی انا کے لیے کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی' اس کی عزت نفس بلاشبہ بہت مجروح ہوئی تھی' مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنے ماموؤں کے سامنے خود کو بہت کمزور محسوس کرتا تھا۔ وہ واقعی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے یہی خوف تھا کہ وہ اسے اس کے باپ کا طعنہ دیں گے اور وہ ایک دفعہ پھر ٹوٹ جائے گا۔

رؤف گیلانی بہت اچھے اور دھیمے مزاج کے حامل انسان تھے۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے باپ کی ساری زیادتیاں نظر انداز کرکے انہوں نے اسے اپنے گھر جگہ دی اور پھر ہر موقع پہ اس کی مدد کی۔ صرف مالی مدد وہ ان سے نہیں لیتا تھا' مگر اخلاقی طور پہ وہ ہمیشہ اس کا سہارا بنے رہے۔ وہ اور حماد اکٹھے کیڈٹ بھرتی ہوئے تھے اور ترقی کی منازل انہوں نے اکٹھے طے کی تھیں۔ وہ سکندر شاہ غدار کا بیٹا ہے' یہ بات کبھی بھی اس کے لیے تازیانہ نہیں بنائی گئی۔ اب رؤف گیلانی' ان کی بیگم ارسلہ' حماد اور اس کی چھوٹی بہن نورالعین (عینی) اس کے لیے دوسری فیملی کی طرح تھے۔ چھاؤنی میں عمومی طور پہ آپ کے اپنے کردار اور اعمال کو آپ کی پہچان کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا' نہ کہ آپ کے پرکھوں کے کردار اور اعمال کو۔ اس نے اپنا نام جہان ایس احمد لکھنا شروع کردیا۔ زیادہ تر وہ اپنے سرنیم احمد کے ساتھ ہی پکارا جاتا تھا مگر جب کبھی پورا نام لکھنا یا بتانا ہوتا' وہ جہان سکندر احمد ہی لکھا اور بتایا کرتا۔

کرنل گیلانی کہتے تھے "مسلمان اپنی زندگی میں اپنے باپ کے نام سے ہی پکارا جانا چاہیے اور باپ کا نام اسے کبھی اپنے نام کے آگے سے ہٹانا نہیں چاہیے' چاہے باپ جیسا بھی ہو۔ بہت عرصے بعد اس نے بالآخر اپنے احساس کمتری کو دبا لیا تھا۔ رشتے ختم نہیں کرسکا تھا۔ ختم کرنے اور دبانے میں خلیج جتنا فرق تھا' اور یہی فرق اس کی ذات میں ایک خلیج چھوڑ گیا تھا۔

وہ چلا گیا تو ممی نے مصلحتاً" ماموؤں سے ٹیلی فونک

WWW.PAKSOCIETY.COM

رابطہ استوار کرلیا' تاکہ اگر کبھی وہ یہ خبر جان لیں تو ممی کو معلوم ہوجائے اور ایک دفعہ فرقان ماموں نے باتوں باتوں میں کہہ بھی دیا کہ کسی نے ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا کرنل سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹڈ ہے؟ تو جواباً" ماموں نے بہت فخر سے بتایا کہ ذلت و شرمندگی کے مارے سکندر شاہ کا خاندان کبھی بھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کارنامہ بھی تو خاصا شرمناک سر انجام دیا تھا انہوں نے۔ وہ کوئی اور جہان ہوگا۔

ممی خاموش ہوگئیں' پھر انہوں نے ماموں کو یہی کہا کہ وہ کوئی اور ہی ہوگا۔ ماموں کے ذہن میں ایک غلط تصور قائم تھا کہ غدار کا بیٹا فوج میں کبھی بھرتی نہیں ہوسکتا' اس لیے انہوں نے اس معاملے کی کبھی چھان پھٹک نہیں کی۔ شاید کچھ عرصے بعد وہ جان بھی لیتے' مگر تب تک اس کا تبادلہ وہاں ہوگیا' جہاں کبھی' کوشش کرنے سے بھی پوسٹ نہیں ملتی اور جو خود کو "خفیہ والوں" میں شامل کروانے کی رتی بھر بھی کوشش نہ کرے' وہ وہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اب اس جاب کی ضرورت تھی کہ وہ اپنا سوشل سرکل محدود رکھے۔ منہ بند اور آنکھیں و کان کھلے رکھے اور اپنے کام کو بھی خفیہ رکھے۔

بالآخر وہ پچیس برس کی عمر میں' چھ ماہ کی ٹریننگ چار ماہ دس دن میں مکمل کرکے ایک ایجنٹ بننے جارہا تھا۔ "پاکستانی جاسوس" جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب اسے امید تھی کہ شاید وہ برسوں دیکھا جانے والا خواب اسے دکھائی دینا بند ہوجائے۔ گوکہ اس کی شدت میں کمی آچکی تھی مگر بہرحال وہ اب بھی اس کے ماضی کا آسیب بن کر اس کے ساتھ تھا۔

فوج اور ایجنسی میں (اس زمانے میں) آپ کا ایک ہی ہدف' ایک ہی دشمن' ایک ہی تعصب' ایک ہی نفرت کا منبع ہوتا تھا۔

Bloody Neighbours!

جس رات اسے پہلی دفعہ غیر قانونی طور پہ بھارت جانا تھا' اس سے پچھلے روز اس کے انسٹرکٹر کی موجودگی میں' عرصے کے مطابق ڈاکٹر نے اس کی داہنی طرف کی ایک ڈاڑھ نکال کر اس کی جگہ ایک خاص پلاسٹک کی بنی مصنوعی ڈاڑھ لگادی تھی جس میں سائنائڈ سے بھرا کیپسول تھا۔ سائنائڈ جو کنگ آف پوائزنز تھا۔ یہ کیپسول ایک شیشے کے خول میں بند تھا اور زبان کی مدد سے باہر نکل آتا تھا۔ اگر غلطی سے نگل لیا جائے تو جب تک شیشہ نہ ٹوٹے' یہ باآسانی کوئی نقصان دیے بغیر جسم سے گزر جاتا ہے۔ لیکن اگر چبالیا جائے تو شیشہ ٹوٹ جائے گا' اور انسان چند پل میں مرجائے گا۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہوجائے اور تشدد برداشت نہ کرسکے اور اسے خدشہ ہو کہ مزید تشدد کی صورت میں وہ اپنے راز اگل دے گا' تو بہتر تھا کہ وہ اپنی اس زہر بھری ڈاڑھ کو نکال کر چبالے اور خاموشی سے جان دے دے۔

یہ اس سے بہتر تھا کہ وہ تفتیشی افسران کے سامنے بولنا شروع کرے' اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالے اور ملک کو نقصان پہنچائے۔ مرجانا' راز اگل دینے سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ سوا سال انڈیا میں ایک دوسری شناخت کے ساتھ رہا۔ کور شناخت وہ جعلی شناخت ہوتی ہے جس کے ذریعے جاسوس اس معاشرے میں متعارف ہوتا ہے۔ ہر کور کے ساتھ ایک لیجنڈ بھی ہوتا ہے۔ لیجنڈ اس فرضی ماضی کو کہا جاتا ہے جو اس جعلی کور کے پیچھے گھڑا جاتا ہے' مثلاً یہ آدمی کہاں پیدا ہوا' کہاں سے گریجویٹ ہوا' سابقہ بیوی کا نام' وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے پیچھے آپ کی ایجنسی اس لیجنڈ کو اتنے اچھے طریقے سے نبھاتی ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں تحقیق کرنے نکلے تو اس کو آپ کی جائے پیدائش کے اسپتال میں آپ کا نام رجسٹر میں لکھا بھی مل جائے گا' گریجویشن سرٹیفکیٹ بھی وہ دیکھ لے گا اور آپ کی سابقہ بیوی سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔ یہ سب تاش کے پتوں کے گھر کی مانند ہوتا تھا' جس کو بعض دفعہ ایک پھونک ہی اڑا کر بکھیر دیتی تھی۔ اس چیز کو ایجنٹ کا کور بلو (Cover blow) ہونا کہتے تھے۔

سوا سال اس کا اپنی ماں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا پاکستان میں صرف ایک شخص سے رابطہ تھا' جو اس کے "باس" تھے۔ وہ لوگ اپنا باس اس کنٹرولر یا ہینڈلر کو کہتے تھے جو ہمہ وقت جاسوس سے رابطے میں رہتا تھا۔ ممی کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو باس تک پہنچاتیں اور وہ اس تک پہنچاتے۔ باس کی ہر بات ماننا فرض تھا۔ بعض اوقات بھلے حالات میں بھی دو دو ماہ خاموشی سے گھر بیٹھنے اور اپنی سرگرمیاں محدود کرنے کا حکم ملتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ مسلسل کام کرنا ہوتا۔ بس جو ادھر سے حکم آئے' وہی کرنا ہوتا تھا۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جو اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیتے ہیں۔ اس نے بھی رکھوادی تھی۔

اور اپنی گردن رہن رکھوانا کیا ہوتا ہے' یہ اس کو تب علم ہوا تھا' جب سوا سال تک ریذیڈنٹ اسپائی کے طور پہ کام کرنے کے بعد ایک دن بہت اچانک وہ گرفتار ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ہمیشہ گرفتاری کے امکان کو مدنظر رکھا تھا مگر ڈی ایم آئی کی تحویل اور تشدد کیا ہوتا ہے' یہ اسے تب معلوم ہوا جب اس نے خود کو ان کی حراست میں پایا۔

ایک چھوٹے سے ڈھابے نما ہوٹل پہ وہ وقت مقررہ پہ "دوست" سے ملنے آیا تھا۔ دوست سے مراد اس کا کوئی فرینڈ یا عزیز نہیں جس سے اس کی دوستی تھی بلکہ وہ اپنے ملک کے ایجنٹس کو "دوست" کہا کرتے تھے۔ اس مقامی دوست کو اس تک چند اشیا پہنچانی تھیں۔ وقت جگہ سب کچھ دوست کا مقرر کردہ تھا۔ وہ پہلے بھی اس ساتھی جاسوس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ تیس بتیس برس کا خوش شکل سا پاکستانی تھا' جو بھارت میں بھارتیوں کی طرح ہی رہ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر کبھی جہان کو نہیں لگا تھا کہ یہی دوست اس کو یوں دھوکا دے گا۔

وقت مقررہ پہ اسے بلا کر وہ خود نہیں آیا۔ البتہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اس کے سر پہ کچھ دے مارا اور وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چند لمحے کے لیے واقعتاً" سنبھل نہ سکا اور بس۔ وہ چند لمحے اسے زندگی کے بدترین دور میں لے گئے۔

ڈی ایم آئی کی تحویل جو جہنم سے بھی بدتر تھی۔

اس کی آنکھوں کو پٹی سے اور ہاتھوں کو پشت پہ لوہے کے کڑوں میں باندھ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اتنے سارے اہلکار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا۔

اس پہلی ہی ضرب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ بھارت کی ڈی ایم آئی ایسی منظم گرفتاریوں کے لیے بہت مشہور تھی۔

کہیں کسی عمارت کے اندر ایک کال کوٹھڑی نما سیل میں لے جا کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی' پھر ایک آفیسر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر چہرہ اونچا کیا' اس دوران دو تین افراد نے پاؤں تک سے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ ایک نے منہ پہ لگی ٹیپ اتاری اور زبان اور تالو کے درمیان ایک بڑا سا لوہے کا ٹکڑا پھنسا دیا' جس سے اس کا منہ کھل گیا۔ ایک آدمی نے اب پلاس کی قسم کے آلے سے اس کے ہر ایک دانت اور داڑھ کو باری باری کھینچا۔ جیسے ہی وہ آلہ نقلی ڈاڑھ پہ آیا' زہر بھری ڈاڑھ کھینچ کر الگ ہوگئی۔

ایک وقت تھا جب بھارتی اور پاکستانی افسران اکٹھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے افسران سے ایک ہی کلاس میں تربیت لیا کرتے تھے اور یہ نقلی ڈاڑھیں لگانے کا طریقہ وہیں ان کو سکھایا جاتا تھا۔ سو انہوں نے پاکستانی جاسوس کو گرفتار کرتے ہی سب سے پہلے اس کا فرار کا واحد راستہ ختم کیا' پھر چار افراد نے مکوں اور ٹھڈوں سے مار مار کر اسے اتنا بے حال کر دیا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ قریباً" دو گھنٹے گزرے تھے کہ وہ واپس آئے' اور دوبارہ آنکھوں پہ پٹی باندھ کر اسے اپنے ساتھ چلاتے باہر لے گئے۔ کہیں وہ اپنے سیل سے تفتیشی سیل کا فاصلہ اور سمت نہ جان لے اور اس طرح فرار ہونے کا کوئی منصوبہ ترتیب دے لے' اس لیے اسے ہر چند

WWW.PAKSOCIETY.COM

قدم بعد لٹو کی طرح گھمایا جاتا تاکہ وہ سمت کھو دے اور پھر وہ آگے چلاتے۔ وہ جانتا تھا کہ تفتیشی سیل اس کے سیل سے قریب ہی ہے مگر وہ جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ وہ اپنے قدم گننے لگ گیا۔ قریباً ساٹھ قدم کے بعد وہ اسے ایک کمرے میں لائے، کرسی پہ بٹھایا اور ہاتھ پاؤں کرسی کے ساتھ باندھے پھر آنکھوں سے پٹی اتاری۔

تاریکی سے تیز روشنی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے میز پہ ایک بڑے ریفلیکٹر میں لگا بلب روشنی کے ٹارچر کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی سے آنکھوں میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے بے اختیار چہرہ پیچھے کر کے آنکھیں سکیڑیں اور سامنے دیکھنا چاہا۔ میز کے اس پار دو افراد کرسیوں پہ بیٹھے تھے جو اپنے حلیے اور شخصیت سے ڈی ایم آئی کے سینئر آفیسرز لگتے تھے۔ ایک آدمی اس کے دائیں جانب ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا، جیسے ہاتھوں میں کچھ چھپا رکھا ہو۔

وہاں ہونے والی تمام گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس پہلی گفتگو میں اس کو بتایا کہ اس کے پاس فرار کا راستہ نہیں ہے۔ ان کی جیلوں سے مردہ یا لاپا ہج ہو کر ہی لوگ نکلتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ پاک اسپائی (پاکستانی جاسوس) ہے، اس لیے وہ سب سچ سچ بتا دے۔ اس صورت میں وہ اس کے ساتھ رعایت برتیں گے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی گرفتاری دوست کے کہنے پہ عمل میں آئی ہے، اس کے باس تک کو معلوم نہ تھا کہ وہ دوست سے کدھر ملے گا۔ ڈھابے پہ ملنے کا وقت صرف دوست کو معلوم تھا اور پھر جس منظم طریقے سے وہ گرفتار ہوا، صاف ظاہر تھا کہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ وہ جاسوس ہے لیکن اس کے پاس جو اسمگلر والا کور تھا، (یہ کہ وہ ایک اسمگلر ہے اور اس دوست نے کسی پرانے بدلے کے باعث اسے جاسوس کہہ کر پھنسوایا ہے) وہ کور اسے اب مرتے دم تک قائم رکھنا تھا۔

اس کا انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔

نام؟ فرید حیات۔

قومیت؟ پاکستانی۔

دین؟ اسلام۔

شہر؟ سیالکوٹ

کس نے تربیت دی؟

"جدی پشتی اسمگلرز ہیں ہم ہمارے باپ دادا ہماری تربیت کرتے ہیں۔" اس نے اپنی ازلی بے نیازی سے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں۔" اس رعب دار آفیسر نے غصے سے کہا تھا۔ "بتاؤ، بھارت کس لیے آئے تھے؟"

"ہیروئن اسمگلنگ کے لیے۔"

افسر نے ایک انگلی سے اشارہ کیا اور جہان کے ساتھ کھڑے آدمی نے کمر کے پیچھے چھپائے چمڑے کے تلے سے ملتی جلتی شے پوری قوت سے اس کے سر پہ ماری۔ ایک، دو، تین پوری تین ضربوں کے بعد اس کا دماغ جیسے گھوم گیا۔ وہ سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی بدترین ضرب تھی۔

"ہاں اب بولو! کس لیے آئے تھے؟"

"تمہاری ماں سے ملنے۔"

ایک دفعہ پھر ساتھ کھڑے آدمی نے اس کے سر پہ وہ تلا مارا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کھال تک کٹ گئی ہو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ کرسی پہ پیچھے بندھے ہاتھوں کے ساتھ، آنکھیں سختی سے میچے ذرا سا کراہا تھا۔ درد ــــ تکلیف ــــ جلن۔

"اب بتاؤ! کس لیے آئے تھے؟" وہ پھر پوچھ رہے تھے۔

ہر بار اس نے وہی جواب دیا۔ تیرہ، چودہ دفعہ انہوں نے سوال دہرایا اور اتنی ہی ضربیں اس کے سر پہ پڑیں، پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو وہ واپس اپنے سیل میں زمین پہ لیٹا تھا۔ آنکھیں کھولنے پہ ہر سو دھند تھی ـ کانوں میں باقاعدہ آوازیں آ رہی تھیں۔ سر اتنا دکھ رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی پھٹ جائے گا۔ کنپٹی کے قریب سے خون نکل کر جم گیا تھا۔ سر میں گومڑ اور جسم پہ کئی جگہ نیل پڑے تھے جیسے اس کے بے ہوش ہونے کے بعد بھی وہ اسے مارتے رہے تھے۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو وقت جیسے کئی برس پیچھے استنبول پہنچ گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھالتے ہوئے سمندر کنارے چل رہا تھا۔ دادا بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آگے نکل گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ پیچھے مڑے اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کل تمہاری ماں کی سالگرہ ہے۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہو گا۔ ہر وقت کاموں میں جو الجھی رہتی ہے۔ یوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی تحفہ لے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر اس کو بتانا مت۔ کل اسے سرپرائز دیں گے۔ نہیں بتاؤ گے نا؟" پھر رک کر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟"

جہان نے آنکھیں کھولیں۔

ٹھنڈے فرش پہ دکھتے جسم کو اس نے محسوس کیا اور دھیرے سے بڑبڑایا۔ "مجھے راز رکھنے آتے ہیں دادا!"

اس کا وہ بدترین درد جو پھر ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا، اس کا آغاز اسی جیل سے اسی روز ہوا تھا۔ پھر چند گھنٹے بعد تو ایک ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے اس کے زخموں پہ دوا لگائی۔ کھانے کو اسپرین کی دو گولیاں دیں اور چند مزید درد کی دوائیں اس اینٹ کے ساتھ رکھ دیں جس کو تکیہ بنا کر وہ آنکھیں موندے فرش پہ لیٹا تھا۔

رات میں وہ ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اب کی بار اس کی موجودگی میں ہی چند تفتیشی اہلکار اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے جانے کے لیے آئے تو ڈاکٹر نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

"تم دیکھ نہیں رہے، اس کا سر کیسے زخمی ہے۔ مجھے اس کو زندہ رکھنے کا حکم ہے، میں اس کو زندہ رکھوں گا۔ اپنی تفتیش بعد میں کرنا۔ آج تم نے مزید اس کو ٹارچر کیا تو یہ مر جائے گا۔"

جہان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھا جو ان اہلکاروں پہ غصہ ہو رہا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس ہو لیے۔ ڈاکٹر اب تاسف سے سر جھٹکتا اس کے سر کی پٹی کرنے لگا تھا۔

"یہ انسان نہیں ہیں، یہ درندے ہیں۔" وہ ساتھ ہی زیر لب انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ جہان بس اپنی نڈھال نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم فکر مت کرو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔" پھر وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "میں مسلمان ہوں۔ اگر تمہیں قرآن یا جاء نماز چاہیے تو اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔"

جہان چند لمحے خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"کیا تم مجھے سورۃ الایمان لا کر دے سکتے ہو؟"

"ہاں، بلکہ میں تمہیں پورا قرآن منگوا دیتا ہوں۔"

"منگوا دو۔" وہ ہولے سے مسکرایا اور آنکھیں پھر سے موند لیں۔

کیا مسلمان تھا یہ ڈاکٹر جسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ قرآن میں الایمان نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے۔ گدھا نہ ہو تو۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مجرموں، خصوصاً" جاسوسی کے مجرموں کی تفتیش کا پرانا طریقہ تھا۔ ایک آفیسر آپ پہ بے حد سختی اور ٹارچر کرتا ہے، جبکہ دوسرا آپ کی طرف داری کرتا ہے۔ خود کو آپ کا ہمدرد ثابت کرتا ہے، تاکہ ایسے حالات میں جب انسان کو اپنے قریب کوئی نظر نہ آئے، وہ خود کو مدد کے لیے آنے والا فرشتہ ثابت کرے اور اہم معلومات اگلوا لے۔

بہرحال، وعدے کے مطابق اردو ترجمے والا قرآن اور جائے نماز اس کو لا دی گئیں۔ وضو کا پانی بھی دیا گیا۔ یہ اس کال کوٹھڑی کا واحد روزن تھا ورنہ وہ دن بہت تاریک تھے۔ اپنے ملک سے دور ایک دشمن ملک میں دشمنوں کے درمیان زخمی ہو کر قید رہنا، یہ اس دنیا کا سب سے تکلیف دہ امر تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ روزانہ اس کو تفتیشی کمرے میں لے جاتے۔ کبھی بازوؤں کے درمیان راڈ پھنسا کر دیوار سے لگا کر پیٹا جاتا‘ کبھی الٹا لٹکا کر گرم پانی کی بالٹی میں سر ڈبویا جاتا۔ اس کے پاس کہنے کو بس ایک ہی بات تھی۔

”I am not a spy“۔(میں جاسوس نہیں ہوں)

وہ چونکہ ایک دوست کے ہاتھوں پکڑوایا گیا تھا‘ اس لیے ان کو اس بات میں قطعاً“ کوئی شک نہ تھا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ ان تکلیف دہ‘ پر تشدد دنوں میں جہان نے اس ساتھی ایجنٹ سے بہت نفرت کی تھی جس نے چند پیسوں کے لیے اسے اور نہ جانے کتنے لڑکوں کو پکڑوایا تھا۔ اس نے واقعتاً“ قسم اٹھائی کہ زندگی میں اگر کبھی اسے موقع ملا تو وہ اس آدمی سے بدلہ ضرور لے گا‘ لیکن یہ موقع اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے اس دوست کا نام جانتا تھا‘ نہ ہی کوئی دوسری شناخت اور اس دنیا کے ساڑھے چھ ارب انسانوں میں اس ایک آدمی کو وہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کبھی وہ واپس جا سکا تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسی کوششیں عموماً“ کامیاب نہیں ہوا کرتیں اور یہ بھی کہ واپسی ان دنوں بہت ناممکن سی چیز لگتی تھی۔

قریباً“ بارہ دن بعد اس نے سورج اس وقت دیکھا جب وہ اسے اس کے سیل سے نکال کر باہر برآمدے میں لائے‘ جہاں ایک طرف صحن میں تپتی ریت بچھی تھی اور دوسری طرف برف کے بڑے بڑے بلاک پڑے تھے۔ وہ پہلے اسے تپتی ریت پہ لٹاتے اور ایک فوجی اپنے بھاری بوٹ اس کی کمر پہ رکھ کر کھڑا ہوتا‘ پھر ٹھنڈی برف پہ لٹاتے۔ تپش اور جاڑے کا عذاب قریب تھا کہ وہ فالج سے ہی مر جاتا مگر اس کی انا اور مردانگی کو گوارا نہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس کے لبوں سے اف تک نکلے‘ مگر بعض اوقات کراہنے اور درد سے بلبلا اٹھنے سے وہ خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ تب اسے بہت غصہ‘ بہت بے بسی محسوس ہوئی تھی۔

پھر وہ اندھیر دن اور رات اس کے اندر سے ہر چیز آہستہ آہستہ نگلنے لگے۔ اپنی ذات کا وقار اور عزت نفس تو وہ کھو چکا تھا‘ پھر جب ہر روز وہ اسے بے پناہ زور دے کر کے نیم جاں حالت میں سیل کے سخت فرش پہ پھینک کر چلے جاتے تو اندر موجود ہر جذبہ فرش کی گرمی میں بھسم ہونے لگتا۔ جیل جانے سے قبل وہ اتنا تلخ اور بے حس نہیں تھا۔ زندگی اور زندگی کی تمام ترنرمی اس کے اندر موجود تھی۔ مگر ان تاریک دنوں نے ہر چیز اپنے اندر جذب کر لی۔ وہ دن اور رات کا حساب نہ کر پاتا۔ آہستہ آہستہ رات دن برابر ہو گئے۔

اس نے وقت کا حساب مکمل طور پہ کھو دیا۔ جب کھانا آتا تو معلوم ہوتا کہ رات ہو گئی ہے۔ دال کی پلیٹ اور دو روٹیاں جو پہرے دار سلاخ سے جان بوجھ کر یوں ترچھا کر کے تھماتا کہ اس کے پکڑتے پکڑتے پلیٹ زمین پہ گر جاتی۔ اسے اس گندی زمین سے دال اٹھا کر کھانی پڑتی جس کو چباتے ہوئے بھی کرچ کرچ کی آوازیں آتی تھیں۔ زندگی‘ خواہشات‘ امیدیں‘ امنگیں‘ اس کے اندر سب کچھ مر گیا تھا۔ ساری دنیا اور اس کی ہر چیز من گھڑت فسانہ تھی۔ اگر کہیں کوئی حقیقت تھی تو وہ یہ تنگ‘ تاریک‘ غلیظ سا سیل تھا۔

وہ اس روز بھی فرش پہ لیٹا چھت کو خالی خالی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اسے ممی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے سوچتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ ان سے عرصے سے رابطے میں نہیں تھا مگر اب تک تو شاید ان کو علم ہو گیا ہو کہ وہ زیر حراست ہے۔ کیا وہ پھر کبھی ان سے دوبارہ مل سکے گا؟ کیا وہ پھر کبھی پاکستان کو دیکھ سکے گا؟ اس نے سوچنا چاہا تو ہر طرف مہیب اندھیرا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا‘ نہ ہی اس کا ملک کبھی اسے تسلیم کرے گا۔ کوئی ملک اپنے جاسوس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔

اس نے خود یہ زندگی چنی تھی اور اس تمام اذیت کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دس زندگیاں دی جائیں‘ تب بھی وہ یہی جاب چنے گا۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ پچھتا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور

سوچتا تھا کہ اس پاکستانی جاسوس کے گھر والوں نے نہ جانے کتنا عرصہ اس کا انتظار کیا ہو گا‘ جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تھا لیکن اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اس کی نعش کی بے حرمتی اللہ کی زمین نے نہیں ہونے دی تھی۔ تب اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ اسے بھی لاوارث نہ چھوڑا جائے۔ پچھلی رات بھی پہرے داروں نے سیل میں دو سنپولیے چھوڑ دیے تھے‘ جنہیں اس نے اپنے تکیے والی اینٹ سے مارا تھا۔ اگر کل کو اس کے سوتے ہوئے وہ اس کو مار دیں اور اس کی لاش کو دریا میں بہا دیں تب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ نام چاہیے تھا‘ نہ شہرت‘ نہ ستائش‘ اسے بس ایک عزت دار جنازہ چاہیے تھا۔

وہ بہت اذیت ناک روز و شب تھے۔

اسی وقت‘ جب وہ سوچوں میں غلطاں تھا‘ پہرے دار اس کے سیل میں لا کر کسی کو پھینک گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردن ذرا سی موڑ کر دیکھا۔

وہ ایک کم عمر لڑکی تھی‘ جو بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس نے پاکستانی طرز کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور دوپٹا پھٹا ہوا تھا۔ چوٹی سے الجھے ہوئے بال نکل رہے تھے۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا‘ اسے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

”کون ہو تم؟“ وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے گردن ذرا سی موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ ہم پوری فیملی کرکٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں جانے نہیں دیا۔ یہ کہتے ہیں‘ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔“

وہ روتے روتے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ اسے بیس دن ہو گئے تھے‘ ان لوگوں کی قید میں اور وہ بہت دکھی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی روداد سنتا رہا۔ ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ سپاہی دوبارہ آئے اور اسے کھینچتے‘ گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ بے اختیار خوف سے روتی چلاتی‘ جہان کو دیکھ کر اسے مدد کے لیے بلاتی رہی۔

جہان نے گردن واپس موڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تین دن تک روز رات کو وہ اس لڑکی کو لے جاتے۔ ٹارچر سیل قریب ہی تھا۔ وہاں سے اس کی دردناک چیخیں‘ آہیں‘ سسکیاں‘ یہاں تک صاف سنائی دیتیں۔ صبح کے قریب وہ اسے سیل میں واپس پھینک جاتے‘ اس حالت میں کہ وہ مزید زخمی ہوتی اور لباس پہ تازہ خون ہوتا۔

تیسری صبح وہ اٹھا‘ اپنے درد کو بھلائے‘ اس نے پانی کے برتن سے ایک گلاس بھرا اور اس کے قریب لے کر آیا۔ وہ بند آنکھوں سے نڈھال سی کراہ رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کی آنکھوں کو دیکھا تو ایک دم جیسے کوئی یاد ہر سو چھانے لگی۔۔۔۔

فریحہ ایکان رضا۔۔۔۔ خوب صورت اور طرح دار فریحہ۔۔۔۔

وہ ایک روز ان کے گھر گیا تو اس نے لاؤنج میں بیٹھی فریحہ کو اپنی بھنوؤں کو تراشتے دیکھا تھا۔ علی کرامت کی ممی اپنی بھنوؤں کو نہیں تراشتی تھیں۔ ان کے ابرو قدرتی تھے مگر اچھے لگتے۔

”آپ کیوں مسز فریحہ کی طرح اپنی آئی بروز کو شیپ نہیں دیتیں؟“ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

”اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں اپنی مرضی سے رد و بدل نہیں کرتے بیٹا! اللہ تعالیٰ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔“

وہ اس نیم بے ہوش پڑی لڑکی کی بھنوئیں دیکھ رہا تھا۔ بالکل فریحہ کی طرح کمان کی شکل میں بنی ابرو بہت صاف تھیں۔ اگر وہ ایک ماہ سے زیر حراست تھی تو ابھی تک ابرو کی شیپ خراب کیوں نہیں ہوئی تھی؟ کیا اسے جیل میں ابرو تراش ملا کرتا تھا؟

”لعنت ہے!“ اس نے گلاس پورا کا پورا اس کے چہرے پہ انڈیلا اور اٹھ کر واپس اپنی جگہ پہ آ گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی مگر زیادہ حرکت نہیں کی۔

پورا دن وہ اسی لڑکی پہ کھولتا رہا تھا۔ ایسے اسٹول

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیجنگ اکثر جیل میں مطلوبہ ملزم کے ساتھ ڈالے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی داستان اور اپنی چیخیں سنا کر ملزم کو ڈرا سکے اور وہ اپنی زبان کھول دے یا کم از کم اس کی ہمدردی لے کر وہ اسٹول پیجن اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

وہ دونوں جب بھی سیل میں ایک ساتھ ہوتے، وہ کراہنے کے دوران بھی اس کو مخاطب کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ پہلے پہل وہ نظرانداز کرتا رہا، پھر اس لڑکی سے جواباً "سوال پوچھنے لگ جاتا۔ کہاں سے آئی ہو؟ اچھا فیصل آباد سے۔ کس طرف گھر ہے تمہارا؟" وہ لڑکی چند ایک الٹے سیدھے جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔

وہ اب دن رات اپنے فرار کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ وہ جیل اتنے زیادہ پہروں میں بند تھی کہ وہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ کرے تو کیا کرے؟ اسے صرف اتنا ڈر تھا کہ اگر وہ اسے پولی گراف ٹیسٹ پہ لے گئے تو سچ جھوٹ کا فیصلہ ہو جائے گا اور انجکشن دے کر وہ اس سے بہت کچھ اگلوا لیں گے۔ پھر اس کی ایجنسی اس کا کبھی اعتبار نہیں کرے گی۔ وہاں یہی کہا جائے گا، وہ غدار کا بیٹا تھا، وہ باپ جیسا ہی نکلا۔ کیا کرے، کدھر جائے؟

پورے پچیس دن بعد وہ اسے سیل سے نکال کر ایک مختلف کمرے میں لے آئے جہاں الیکٹرک شاکس کا انتظام تھا۔ بجلی کے جھٹکے لینے کا مطلب تھا، ساری عمر صحت کے مختلف مسائل کا شکار ہو کر وہ فوج کے لیے ناکارہ ہو جائے۔ اس نے سوچنے میں بس ایک منٹ لگایا۔

"اوکے، اوکے! آئی ایم اے اسپائی۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اعتراف کر لیا۔ "مجھے شاکس مت دو، میں سب بتاتا ہوں۔"

تفتیشی ٹیم دوبارہ بیٹھی۔ ریکارڈنگ کا انتظام ہوا۔ سوال و جواب اور بیان دوبارہ لیے گئے۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان کو بتانا شروع کیا کہ وہ سویلین جاسوس ہے۔ اپنی ایجنسی کا نام اسے نہیں معلوم، اور چند دوسری کہانیوں کے بعد اس نے بتایا کہ اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو اس کو اپنے ساتھی جاسوس سے ملنا ہے۔ وہ ان کو وہاں لے جائے گا، تاکہ وہ اس ساتھی کو گرفتار کر لیں اور اس کے ساتھ رعایت برتیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس جیل سے وہ نہیں بھاگ سکتا، ہاں کھلی فضا میں شاید یہ ممکن ہو۔ اس نے کہا کہ اگر تیرہ تاریخ کو وہ نہیں آیا تو پھر ایک یا دو ہفتے بعد اسی جگہ پہ وہ دوبارہ آئے گا۔

خوب وارن کرنے اور جھوٹ بولنے یا فرار کی کوشش میں ملنے والی سزا کے بارے میں ڈرا دھمکا کر وہ یہ خطرہ لینے کو تیار ہو گئے۔ وہ انہیں ایک پرہجوم جگہ پہ لے آیا مگر وہاں اتنی سیکیورٹی اور مکمل انتظامات تھے کہ ادھر سے فرار ہونا کسی اسپائیڈر مین کے لیے تو ممکن تھا، مگر انسان کے لیے نہیں۔ وہ چپ چاپ واپس آ گیا۔

اگلے ہفتے وہ پہلے سے زیادہ سیکیورٹی کے ساتھ اسی جگہ پہ لے جایا گیا۔ اس کا کوئی دوست ادھر نہیں آنا تھا۔ سو کوئی نہ آیا۔ تین گھنٹے اس پل پہ ادھر ادھر ٹہل کر وہ اس سے ہٹ کر ایک بک اسٹال پہ چلا آیا۔ ہر طرف سادہ کپڑوں میں موجود سیکیورٹی اہلکار اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کا ارادہ گھنٹہ بھر مزید ٹہل کر یہاں سے واپس ہو لینے کا تھا۔ کون سا کسی نے آنا تھا۔ اب اتنی گرمی میں وہ کیوں خوار ہو رہا ہے؟

رسالہ رکھ کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ شاپ سے نکلتی تین لڑکیاں ہنستی، باتیں کرتی یوں ایک دم اس کے سامنے آئیں کہ وہ ان سے ٹکرا گیا۔

"اوہ!" جس لڑکی سے وہ ٹکرایا تھا، وہ ایک دم اتنی بوکھلائی کہ اس کی کتابیں اور فائل نیچے جا گریں۔ وہ جلدی جلدی معذرت کرتا اس کی کتابیں اٹھانے لگا۔

وہ کالج یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں تھیں۔ جس سے وہ ٹکرایا تھا، اس نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا چہرہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جہان کے ساتھ جھک کر اس نے اپنی فائل اٹھائی اور کچھ اس طرح سے اٹھائی کہ اس پہ لکھے الفاظ واضح ہو گئے۔

وہ بہت کوشش سے اپنی حیرانی ظاہر کیے بغیر اٹھا۔ دل ایک دم زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ لڑکیاں جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھال کر واپس مڑ گئیں۔ وہ خود کو پرسکون رکھتے ہوئے پھر سے بک ریک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک کتاب اٹھا کر اس نے چہرے کے سامنے تان لی تاکہ اس کے تاثرات اس کے نگرانوں سے چھپ سکیں۔

اس لڑکی کی فائل پہ ایک آفیسر کا نام، رینک اور اس کی تفتیشی ٹیم میں شمولیت کا دن لکھا تھا۔ ساتھ میں پہچان کے لیے جہان کا اپنا کوڈ نمبر اور اس کے کوڈ نیم کا مخفف بھی لکھا تھا۔ اے آر پی۔

Agent Rose Petal

اس میں اور گلاب کی پنکھڑی میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ یہ بس ایک کوڈ نیم تھا، جیسے عموماً ہوا کرتے تھے۔ شاید جس نے الاٹ کیا تھا، اس کے سامنے اس وقت روز پیٹل ٹشو کا ڈبا رکھا ہو، بہرحال اس لڑکی کی فائل پہ لکھے یہ الفاظ پہچان کے لیے کافی تھے۔ اس نے کتاب واپس رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں دکان کے شیشے کے دروازے کو دیکھا جہاں دور مخالف سمت جاتی تین لڑکیوں کا عکس نمایاں تھا۔

اسی پل فائل والی لڑکی نے گردن ذرا موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تھی۔ مہ جبیں، خوب صورت عورت۔۔۔

اگلے ہی لمحے مہ جبیں واپس پلٹ گئی۔ وہ تینوں لڑکیاں اب بس پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ اتنے عام سے انداز میں ہوا تھا کہ ان درجنوں نگرانوں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس چلے آئے۔

اب اس کے پاس مزید ایک ہفتے کا وقت تھا۔ اگلے ہفتے اس کو آخری دفعہ ان لوگوں کو اسی جگہ پہ لے کر جانا تھا۔ اس کے تعاون کے پیش نظر ہفتے دس دن اس پہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کھانا بھی قدرے بہتر مل رہا تھا۔ شاید وہ سمجھے کہ اگر وہ راز اگل دے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ تب بھی وہ مارا جائے گا مگر اب اسے امید تھی۔ اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اسے بس اس آفیسر کا انتظار کرنا تھا جو چند دن میں ادھر آ جائے گا اور فرار میں اس کی مدد کرے گا۔

پورے ایک ماہ دس دن بعد اس کو اس عقوبت خانے سے رہائی ملی تھی۔ وہ رہائی جو بمشکل وہ چھین پایا تھا۔ پھر تین ماہ وہ ایک سکھ سیاست دان کے بنگلے میں حفاظت کے پیش نظر رہتا رہا۔ ڈیڑھ برس بعد وہ جن حالات سے گزر کر پاکستان پہنچا، وہ ناقابل بیان تھے۔ جب وہ واپس لاہور پہنچا تو اس کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ مسلسل علاج اور دیکھ بھال کے بعد ظاہری زخم تو مندمل ہو گئے مگر وہ سر کا بدترین درد، جس کا منبع ایم آر آئی سے بھی نہ مل سکا تھا، اس کے ساتھ رہا۔ اس نے کبھی اپنے اس سر درد کو ظاہر نہیں کیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بیماری یا معذوری اس کے سروس ریکارڈ کو خراب کرے اور وہ میدان جنگ سے واپس بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔ ان کی ایجنسی کا ایک مشہور زمانہ مقولہ تھا کہ "ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور زمانہ جنگ میں اپنی کی ہوئی جنگ کا نتیجہ دیکھتے ہیں۔" ابھی وہ مزید جنگ کرنا چاہتا تھا۔

مگر اس جنگ اور قید نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے سروس ریکارڈ میں Reliable Under Torture (ریلائبل انڈر ٹارچر) کی ڈگری میں آ گیا تھا، وہاں دوسری طرف اس کے اندر بہت کچھ مر گیا تھا۔ وہ جو ایک فیملی بنانے کی، ایک حسین لڑکی سے شادی کر کے اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے، وہ خواہش مر گئی تھی۔ وہ دنیا سے بے اعتبار ہو چکا تھا۔ اس کے اندر اتنی تلخی بس چکی تھی کہ اب وہ ایک فیملی مین نہیں رہا تھا۔ وہ بس ایک ایجنٹ تھا۔ یہی اس کی زندگی، اس کی محبت، اس کی فیملی تھی۔ جب حکومت نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو ملک کی خدمت کے قابل بنایا تھا تو بہتر تھا کہ وہ یہی کام کرے۔ ماموؤں سے بغض و عناد،

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتقام لینے کی خواہش، سب جیل نے نگل لیا تھا۔ اگر کچھ بچا تھا تو وہی ایک احساس کمتری جو ماموؤں کا سامنا کرنے کا سوچ کر اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا۔ بس، اور کچھ نہیں۔

رہائی کے کچھ عرصے بعد وہ ممی کے پاس ترکی گیا تو ایک اچھی خبر اس کی منتظر تھی۔ ممی نے اپنی جمع پونجی ملا کر جہانگیر والا گھر پھر سے خرید لیا تھا۔ دادا کا بنایا گھر، ان کا اپنا گھر۔ مگر اب اس کو اس گھر نے بھی بہت زیادہ خوشی نہیں دی۔ وہ تو بس ایک خواہش تھی، پوری ہوگئی۔

قریباً" تین برس قبل وہ اپنے ترک پس منظر کے باعث ترکی بھیجا گیا، یہاں وہ دو کورز کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ایک اپنی پاکستانی شناخت "جہان سکندر" اور دوسری ایک انڈین شناخت "عبدالرحمٰن پاشا۔"

اپنے کام کے سلسلے میں آج کل وہ اسلام آباد واپس آیا ہوا تھا اور ممی کے مسلسل زور دینے پہ وہ بالآخر ماموں کے گھر جانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل میں اپنی منکوحہ کو اتفاقیہ دیکھ لینے کے بعد اس کا ارادہ مزید ڈانواڈول ہو گیا تھا اور بعد میں بھی شاید وہ ماموں سے ملنے کی کوشش کرتا، مگر وہ لڑکی استنبول آ رہی تھی، یہ خیال اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ ایسا کرنا تھا جس سے وہ اس لڑکی کو روک پائے، مگر کیا، یہ ابھی اسے طے کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بیسن کی ٹونٹی پہ جھکا چہرے پہ پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مکروہ صورت اس کی جلد سے ہر نشان چھوڑ کر چکی ہے تو اس نے چہرہ اٹھا کر باتھ روم کے آئینے میں دیکھا۔ ماتھے پہ سامنے کو گرتے اس کے گھرے بھورے بال گیلے اور منہ دھلا دھلایا ہو چکا تھا۔ اس نے اسٹینڈ سے لٹکتا تولیہ اتارا اور چہرے کو رگڑتا باہر آیا۔

لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی آن پڑا تھا۔ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تولیہ ایک طرف ڈالا، پھر لیپ ٹاپ گود میں رکھتے ہوئے اپنا موبائل نکالا۔ اسے ممی کو فون کرنا تھا۔

دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ مختصر سا لے نے گیا۔ ذہن کے پردوں پہ آج کے واقعات پھر سے چلنے لگے تھے۔

گزشتہ رات ماموں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لائحہ عمل تشکیل پا رہا تھا۔ جو آخری چیز وہ اپنی مشکل زندگی میں نہیں چاہتا تھا، وہ اپنی بیوی کا اس شہر میں آ کر رہنا تھا، جہاں وہ پہلے ہی ایک مقیم ایجنٹ کی حیثیت سے دو زندگیاں گزار رہا تھا۔ اب اسے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کو روکنا تھا۔ جب اس نے کچن میں سفید پھول رکھے تھے تو اس کے ذہن میں مکمل لائحہ عمل نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ جاتے وقت اس کی کار پہ ایک جی پی ایس ٹریسر چسپاں کر آیا تھا۔ وہاں کھڑی دو گاڑیوں میں سے چھوٹی والی یقیناً" اسی کی تھی۔ وہ اس لڑکی پہ نظر رکھنا چاہتا تھا اور آج کل اس کے پاس اتنا ڈھیر سارا وقت تھا کہ وہ اس پہ نظر رکھ سکے اور پتا نہیں کیوں، جب بھی وہ اس کے بارے میں سوچتا، اس کو وہ لڑکی کے نام سے ہی سوچتا۔ وہ اس کا نام نہیں لیا کرتا تھا۔ کچھ تھا، جو اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ امریکی سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کی وجہ سے آج کل ادھر تھا۔ وہ بھارتی نژاد امریکی شہری تھی اور اس کی پاکستان سے دو ماہ بعد روانگی تھی جہان کی دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس کی اگلی پوسٹنگ استنبول میں امریکی سفارت خانے میں ہو رہی تھی۔ اگر اس تک رسائی حاصل کر لے تو استنبول میں اس کے بہت سے کام آسان ہو سکتے تھے۔ مسئلہ بس اتنا تھا کہ وہ اس کی کار تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اپنی کار کا شیشہ صرف اور صرف کسی خواجہ سرا بھکاری کے لیے کھولتی تھی کیونکہ اسے خواجہ سرا کی بددعا سے ڈر لگتا تھا۔ غالباً" خاندانی وہم تھا، جسے وہ آفیسر امریکا میں اتنے برس رہنے کے بعد بھی نہیں ختم کر سکی تھی۔ صرف اس کی کار کے انتظار میں اب اسے روز شام میں خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان راستوں پہ پھرتا تھا جہاں سے وہ گزرتی تھی۔

کسی دوسرے کے لیے شاید یہ بہت عجیب بات ہو، مگر اس کے لیے نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خواجہ سرا بننا بالکل ایسے تھا جیسے کسی ڈاکٹر کے لیے مکمل سفید اوور آل کی بجائے آف وائٹ اوور آل پہننا۔ ایسی تبدیلی جو محسوس ہوتی نہ ہی بری لگتی۔ اپنے کیریر کے دوران وہ اتنا کچھ بن چکا تھا کہ بہت عرصہ ہوا وہ حس ہی ختم ہو چکی تھی جو عجیب و غریب حلیے کا احساس دلاتی۔

اپنے ذاتی کاموں کے لیے البتہ ایسے حلیے اس نے کبھی نہیں بدلے تھے، لیکن اب اس کی زندگی ذاتی رہی ہی نہیں تھی۔ اگر آج وہ حیا کی گاڑی کو ٹریس کر کے اس سے ملنے گیا تھا، تب بھی اس کے ذہن میں اپنی اسی "جعلی" زندگی کی فکر تھی جو وہ استنبول میں گزار رہا تھا۔

وہ آئس کریم پارلر جہاں وہ اس لڑکی کی گاڑی کی موجودگی کا علم ہونے کے باعث آیا تھا، اس جگہ سے زیادہ دور نہ تھا، جہاں آج کل اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہاں خواجہ سرا اکثر نظر آتے تھے، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی اصلی خواجہ سرا ہو۔ آدھے پروفیشنل اور باقی آدھے خفیہ والے ہوتے تھے، جو ایسے روپ دھار کر حساس جگہوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

وہ اس لڑکی کو ترکی جانے سے روکنا چاہتا تھا اور کل تک تو وہ اس سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر آج پتا نہیں کیوں، اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے۔ وہ اسے کبھی نہیں پہچان سکتی۔ اسے یقین تھا وہ کیا، ممی بھی اسے اس حلیے میں نہیں پہچان سکتی تھیں۔

اس روز اس لڑکی نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال حسب معمول کھلے تھے۔ وہ سلش پیتے ہوئے سوچ میں گم، غالباً" شیشہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ اس کے شیشے پہ جھکا تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس کے سفید، گلابی چہرے کو خوفزدہ ہوتے دیکھا۔ تمام تر گھبراہٹ کے باوجود اس نے ٹھنڈا ٹھار سلش جہان کے منہ پہ الٹ دیا۔ تب وہ پیچھے ہوا تھا۔ اسے سلش نے پیچھے نہیں دھکیلا تھا، بلکہ اس کی جرأت پہ وہ حیران ہوا تھا۔ گزشتہ روز اگر اسے لگا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی نازک سی لڑکی ہے، تو ایسا نہیں تھا۔ وہ کافی پراعتماد اور ایک دم سے ردعمل ظاہر کر دینے والی لڑکی تھی۔ چلو، کوئی تو اچھی بات تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا اور اب حلیہ ٹھیک کر کے ممی کو فون کر رہا تھا۔ ممی نے فون اٹھاتے ہی سب سے پہلے وہی پوچھا جس کی اسے توقع تھی۔

"تم ماموں سے ملنے گئے تھے؟"

"جی، مگر......"

"ابھی میری صائمہ بھابھی سے بات ہوئی ہے، انہوں نے تو نہیں بتایا۔" وہ حیران ہوئیں۔

"آپ دو منٹ تسلی سے میری بات سنیں گی؟"

پورے دو منٹ اس کی بات تسلی سے سن لینے کے بعد بھی ممی بولی تھیں۔

"تم آج چلے جاؤ، آج فرقان بھائی کے گھر رات میں کھانا بھی ہے۔ سب اکٹھے ہوں گے۔ تم ان سے ایک دفعہ مل لو، پھر بعد میں حیا کو اعتماد میں لے کر بتا دینا۔ بات ختم۔"

اور اس کے جو ہاتھ میں آیا، اٹھا کر میرے اوپر دے مارنا ہے، اس نے بے اختیار سوچا تھا، پھر چند منٹ لگے اسے ممی کو راضی کرنے میں اور بمشکل وہ اس بات پہ متفق ہوئیں کہ ابھی ماموں سے ملنے کے بجائے بہتر ہے کہ پہلے وہ ماموں کی بیٹی سے ملے، ہو سکے تو اسے روک دے اور اگر اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ پانچ ماہ کے لیے استنبول آ رہی ہے، تو پھر اسے ان لوگوں کو اپنے بارے میں آگاہی نہیں دینی چاہیے۔ یہ اس کی جاب کے اصول کے خلاف تھا۔ اسے ترکی میں اپنے اردگرد کوئی ایسا شخص نہیں چاہیے تھا جو اس بات سے واقف ہو کہ اس کا نام عبدالرحمٰن پاشا نہیں، یا جہان سکندر نہیں، بلکہ میجر جہان سکندر احمد ہے۔ اس نہج پہ پہنچ کر ممی راضی ہو گئیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ٹھیک ہے، تم کرو جو تم کرنا چاہتے ہو میں انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم اسلام آباد میں ہو۔" وہ خوش نہیں تھیں مگر خفا بھی نہیں تھیں۔ اس نے سکون کی گہری سانس اندر کھینچی۔ اب اس کے پاس اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے چند روز تھے۔

فون بند کرنے کے بعد وہ فوراً" اٹھا اور اپارٹمنٹ مقفل کر کے باہر آیا۔ ممی نے فرقان ماموں کے گھر فیملی ڈنر کا بتایا تھا۔ اگر وہ یہی بات کارڈ پہ لکھ کر ایک روز پرانی تاریخ کے مہر زدہ لفافے میں ڈال کر گلاب کے پھولوں کے ہمراہ اس کے گھر دے آئے تو یقیناً" وہ اس کی توجہ پالینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی کوئی بات سنے گی۔

آج بھی وہ اسی پھول والے کے پاس آیا تھا' اور آج بھی اس کے پاس سرخ گلاب نہیں تھے۔ اس نے دل ہی دل میں پھول والے اور سرخ گلاب' دونوں پہ لعنت بھیجتے ہوئے سفید گلاب خرید لیے۔ بار بار وہ موبائل پہ اپنے ٹریسر کا اسٹیٹس چیک کرتا تھا۔ اس کی کار ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔

اپنی مصروفیات میں سے اس لڑکی کے لیے وقت نکالنا ایک دم ہی اسے بہت دلچسپ لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ داور کی مہندی کی دوپہر تھی۔ جب ممی کا فون آیا۔ وہ اس وقت آفس سے نکل رہا تھا' یہاں سے اسے اپنی وہ کار لینے جانا تھا' جو اسے اسلام آباد میں استعمال کرنی تھی۔ ممی کا نمبر اسکرین پہ جلتا بجھتا دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ شاید ممی نے ذہن بدل لیا تھا' ورنہ وہ اس طرح اچانک کال نہیں کرتی تھیں' ماسوائے ہنگامی صورت حال کے۔

"جی ممی! خیریت؟" اپنے دفتر کی مین بلڈنگ سے دور ہٹ کر سڑک کنارے چلتے وہ ان سے بات کرنے لگا۔

"تم آج جا کر ماموں سے مل لو۔"

وہی ڈھاک کے تین پات' وہ جی بھر کر بے زار ہوا۔

"ممی! کل رات ہم نے کس بات پہ اتفاق کیا تھا' آپ بھول گئیں؟"

"جہان! میری بات سنو۔ مجھے خدشہ ہے کہ سلیمان بھائی حیا کی شادی کہیں اور نہ کر دیں۔"

"تو کر دیں!" وہ یہ نہ کہہ سکا گو کہ وہ یہی کہنا چاہتا تھا مگر جب بولا تو آواز میں پتا نہیں کہاں سے خفگی در آئی تھی۔

"وہ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں کسی اور سے اس کی شادی؟ ہمارا نکاح ہوا تھا' منگنی نہیں جو وہ اپنی مرضی سے توڑ دیں۔"

"وہ خلع بھی لے سکتے ہیں اور تم جانتے ہو ایک دو پیشیوں میں فیصلہ ہو جایا کرتا ہے بچپن کے نکاح کا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے ذمے دار ہم ہوں گے۔"

"اور وہ خود کسی چیز کے ذمے دار نہیں ہیں؟"

"جہان سکندر! میں نے تمہاری پرورش اس منتقم مزاج سوچ کے ساتھ تو نہیں کی تھی۔" انہیں جیسے دکھ ہوا تھا۔ وہ فوراً" نادم ہوا۔

"اچھا' آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا کہ اگر ہم اس رشتے پہ خاموش ہیں تو بات وہ بھی نہیں کرتے۔"

"وہ بیٹی والے ہو کر کیسے خود سے بات کریں؟ کیسے کہیں کہ ہماری بیٹی کو رخصت کروا کر لے جاؤ؟ ایسے اپنی بیٹی کو کوئی ہلکا نہیں کرتا۔"

"ہاں' میرے ماموؤں کا غرور اور انا......" ادھر ممی کہہ رہی تھیں۔

"وہ ہماری طرف سے مایوس ہو چکے ہیں' اسی لیے سلیمان بھائی حیا کے لیے آنے والے رشتوں پہ غور کر رہے ہیں۔" وہ ایک دم بالکل چپ ہو گیا۔

"آپ کو کس نے کہا یہ؟" یہ تو طے تھا کہ وہ بلا تحقیق کسی بات پہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔

"صائمہ بھابھی نے ابھی فون کر کے بتایا ہے۔ ان کے بقول سلیمان بھائی کو ہمارا انتظار بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فرقان بھائی سے خود کہا ہے کہ ان کے کسی دوست نے اپنے بیٹے کے لیے حیا کا رشتہ بھجوایا ہے

اور آج وہ فرقان بھائی کو اس لڑکی سے ملوائیں گے۔ شاید ان کے کسی بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے' باہر سے پڑھ کر ابھی آیا ہے' فرقان بھائی نہیں ملے ابھی اس سے۔"

وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا۔ کیوں' وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

"تم آج چلے جاؤ۔ میں اس رشتے کو ٹوٹتا نہیں چاہتی جہان!" وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

"جب وہ لوگ مجھے بے حد غیر اہم سمجھ کر میرے منتظر ہی نہیں ہیں تو کیا فائدہ جانے کا؟"

"بھابھی بتا رہی تھیں' حیا ہمارا پوچھ رہی تھی۔ اسے انتظار ہو گا۔"

"کیوں؟" وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں بیٹا! میں کبھی کبھی خود کو اپنی بھتیجی کی مجرم سمجھتی ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں' میں یہ رشتہ نہیں ٹوٹنے دوں گا۔"

"یعنی تم جا رہے ہو؟" وہ جیسے کھل اٹھیں۔

"اب یہ بھی نہیں کہا تھا میں نے۔ بس آپ مجھ پہ بھروسا رکھیں' میں سب فکس کر لوں گا۔"

اور ممی خاموش ہو گئیں' ان کو شاید اس کی اس قابلیت پہ بھروسا تھا کہ وہ اپنے اردگرد موجود ہر خراب چیز کو فکس کر لیا کرتا تھا۔ رشتوں اور چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ شاید ممی نے یہ بھی سوچا ہو۔

آج اس کو دیکھتے ہی پھول والے لڑکے کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

"صاب! آج سرخ گلاب بہت سارے ہیں۔"

"مگر مجھے سفید ہی چاہئیں۔" اس نے بٹوہ نکالتے ہوئے دو ٹوک انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ لڑکے کا چہرہ بجھ سا گیا' مگر پھر بھی وہ جلدی جلدی سفید گلابوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

سفید گلاب بے شک بہت سے لوگوں کے نزدیک دشمنی کی علامت تھے مگر بہت سے اسے امن اور صلح کی نشانی ہی گردانتے تھے۔

وہ آج ان کے گھر کے اندر نہیں گیا' بلکہ ان کے گھر کے مقابل ایک زیر تعمیر بنگلے میں چلا آیا۔

سرخ اینٹیں' آدھی بنی دیواریں' وہ گھر رات کے وقت ویران پڑا تھا۔ مزدور وغیرہ کب کے جا چکے تھے اور اب وہ وہاں اوپری منزل کے کمرے میں بیٹھ کر باآسانی سامنے سلیمان ماموں کے گھر کے کھلے گیٹ سے سب دیکھ سکتا تھا۔

مہندی کا فنکشن دونوں گھروں کے قریب ہی ایک کھلے پلاٹ میں شان دار سی قناتیں لگا کر کیا گیا تھا۔ اسے تقریب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ صرف سلیمان ماموں کے کھلے گیٹ کو دیکھ رہا تھا جہاں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ خواتین کی تیاری اور الٹے سیدھے فیشن! وہ روایات اور قدریں۔ جن کا ذکر ممی اکثر کیا کرتی تھیں' وہ اسے اپنے ننھیال کی خواتین میں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ داور کی بہن تو شاید باقاعدہ اسکارف لیا کرتی تھی مگر وہ بھی اسے سلور لہنگے میں بنا سر ڈھکے ادھر ادھر پھرتی نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں شادیوں پہ لوگ سب بھلا دیتے ہیں؟ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

بہت دیر بعد جہان نے بالآخر اسے دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنی ممی کے عقب میں چلتی برآمدے سے اترتی ڈرائیو وے تک آ رہی تھی' جہاں سلیمان ماموں ایک فیملی کے ہمراہ کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ سنہرا لہنگا اور ٹیکا اسے مزید حسین بنا رہا تھا مگر وہ اسے پھر بھی "مرہ جمیلہ" نہیں لگتی تھی۔

سلیمان ماموں اب اس کا تعارف ان لوگوں سے کروا رہے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ صاحب' خاتون' اور غالباً" ان کا بیٹا۔

اس نے اپنے سیل فون میں دوربین کا لینس نکالا اور ان کو فوکس کیا۔ اب وہ ان کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ تینوں مہمان بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے' بالخصوص ان کا بیٹا۔ اس کی نظریں تو بہت ہی... اسے پتا نہیں کیوں پھر سے غصہ آنے لگا' اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

تب ہی اس نے حیا کے چہرے کی جوت کو ماند پڑتے دیکھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی وہ ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گیٹ سے باہر آ کر اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارا صاف کیا۔

اس نے موبائل کے بٹن کو چند ایک دفعہ دبایا۔ وہ اس کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کوئی تصویر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے مل کر خوش نہیں تھی شاید یہی وہ رشتے والے تھے جن سے آج سلیمان ماموں کو فرقان ماموں سے ملوانا تھا۔ وہ اس پہ خوش اس لیے نہیں تھی کہ یہ رشتہ اس کے لیے ان چاہا تھا۔

دل کے کسی کونے میں اسے ایک گونہ اطمینان سا نصیب ہوا۔ جیسے تسلی سی ملی ہو، جیسے ڈھارس سی بندھ گئی ہو وہ اب پہلے جتنا ناخوش نہیں تھا۔

وہ بہت دیر ادھر ہی بیٹھا رہا۔ اسے فنکشن دیکھنے کی آرزو نہ تھی، بس وہ اس کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود تھا۔ وہ اسے ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی دیر گزری، تب وہ اسے واپس آتی دکھائی دی۔ وہ گھر کے اندر جا رہی تھی۔ کیا اسے اس سے ملنا چاہیے؟ یا اس کے ترکی آنے کا انتظار کرے؟ وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کا فون بجا۔

اس نے سیل فون کی اسکرین کو دیکھا، پھر بے اختیار چونکا۔ یہ اس کی ترکی والی وہ سم تھی جو پوسٹ پیڈ تھی اور کبھی اس کے تو کبھی ممی کے زیر استعمال رہتی تھی۔ یہ نمبر ماموں کے پاس تھا اور اس میں ماموں کا نمبر محفوظ بھی تھا اور اب اس نمبر سے کال آ رہی تھی۔ ماموں کے گھر سے کال؟ وہ لمحے بھر کو گڑبڑا سا گیا۔

مگر اس نے فون اٹھا لیا چونکہ یہ ترک نمبر تھا اس لیے وہ ایک ہی لمحے میں خود کو ترکی لے گیا۔ ایک پیشہ ور ایجنٹ ہونے کے ناطے اس کو یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ وہ ترکی سے باہر ہے اور اس کا نمبر رومنگ پہ ہے۔

وہ حیا تھی، ناقابل یقین۔۔۔ اور وہ ممی کا پوچھ رہی تھی۔ وہ ان کی منتظر تھی، ممی ٹھیک کہتی تھیں۔ اس سب کے باوجود جب وہ بات کرنے لگا تو اس کا لہجہ خشک ہی تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی کے ساتھ نرمی سے یا کھل کر بات نہیں کرتا تھا اور اس کو تو وہ ویسے بھی کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ پھر بھی، جب بات کے اختتام پہ اس نے حیا کی آواز کو بھیگتے ہوئے سنا تو اس کا دل دکھا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس نے وہ خط کا لفافہ نکالا جو وہ پھولوں کے ساتھ رکھنے کے لیے لایا تھا۔ ابھی اندر موجود سفید موٹے کاغذ پہ اس نے لکھا نہیں تھا اور اب اسے معلوم تھا کہ اس کو کیا لکھنا ہے۔

"اس لڑکی کے نام جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے، تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے۔"

یہ آخری بات محض اس کا گمان تھا، مگر کیا پتا وہ صحیح بھی ہو۔ اس نے پی کیپ سر پہ لی اور مفلر گردن کے گرد یوں لپیٹا کہ اگر اب وہ خود کو کوریر سروس مین کہہ کر گھر کے کسی ملازم کے حوالے وہ پھول کرے تو کل کو دن کی روشنی میں وہ اسے پہچان نہیں پائیں گے۔ پھول اور خط ایک ملازم کے حوالے کر کے وہ واپس چلا آیا۔ وہ صرف حیا کو چونکانا چاہتا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

☼ ☼ ☼

داور کی بارات کے روز اس کا قطعاً" ارادہ نہ تھا کہ وہ آج بھی حیا کے لیے ادھر جائے گا۔ آج ویسے بھی اسے اپنے کام بہت تھے۔ سیکنڈ سیکریٹری تک رسائی وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام وقت طلب ہوتے ہیں۔ صبر، انتظار اور خاموشی، یہ تین چیزیں اس نے اپنی جاسوسی مہمات کے دوران سیکھی تھیں۔ آج بھی اس کا کام نہیں ہو سکا تھا اور وہ واپس گھر جا رہا تھا، مگر صرف آخری منٹ میں اس نے یونہی سرسری سا سلیمان ماموں کے گھر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ معلوم نہیں وہ بار بار وہاں کیوں جاتا تھا۔

جب وہ ان کی گلی کے دہانے پہ پہنچا تو اس نے زن سے اپنے سامنے گزرتی گاڑی میں حیا کو دیکھا۔ وہ بے اختیار چونکا تھا۔ اس گاڑی میں اسے وہی کل والی فیملی نظر آئی تھی اور وہی بے باک نگاہوں والا فضول انسان گاڑی چلا رہا تھا۔

آخر وہ ان کے ساتھ کیوں جا رہی تھی۔

وہ فارغ تھا، اگر نہ ہوتا تب بھی ان کے پیچھے ضرور جاتا۔ جو بھی تھا، وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس وقت کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ تھی، جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھے نہیں لگے تھے۔ کل اسے وہ ان سے مل کر ناخوش لگی تھی، مگر آج وہ ان ہی کے ساتھ تھی۔ وہ کل غلط تھا یا آج؟ وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے میرج ہال کے ایک طرف حیا کو گاڑی سے اتر کر دوبارہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے دیکھا تو اسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ کیسے یوں کسی کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا وہ ہر ایک کے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی تھی؟ اسے شدید غصہ آیا تھا۔ ایک تو اس کا لباس، پھر وہ اتنا میک اپ کرتی تھی۔ اتنی نک سک سے تیار ہوتی تھی، اوپر سے رات کا وقت۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ابھی اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اس آدمی کی کار سے نکال لے اور اگر اس نے وہ عجیب سا حلیہ نہ اپنایا ہوتا تو شاید وہ یہ کر بھی دیتا۔

جب وہ گاڑی سے نکلا تھا تو فرائی پان بھی ساتھ ہی اٹھا لیا جو اپنے اس گیٹ اپ کے ساتھ وہ رکھا کرتا تھا۔ کاسلیت اس کے ہر "کور" میں نمایاں ہوتی تھی۔ اور جب اس نے اس نوجوان کے سر کے پچھلے حصے پہ فرائی پان مار کر اسے گرایا تو بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا، کوئی حق نہیں جتا سکتا تھا، مگر وہ اس لڑکی کو گردن سے پکڑ کر میرج ہال کے دروازے تک چھوڑ سکتا تھا۔

اور یہ اس نے کیا۔ اپنے لباس کا وہ گھٹیا سے رنگ کا دوپٹا بھی اس پہ اچھال دیا، مگر جب جانے لگا تو ایک دفعہ بہت سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اگر وہ بولا تو صرف ایک لفظ، جو اس کی زبان پہ آیا تھا۔ "بے حیا"۔ ہاں وہ اسی قابل تھی۔ پچھلے دو روز میں اگر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ جاگا تھا تو اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی دل سے اتر جاتا ہے جیسے کسی کے بارے میں انسان شک و شبہہ میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اس وقت ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ اس سے نہیں ملنا چاہتا تھا اور اگر وہ اسے استنبول آنے سے روک سکا تو ضرور روکے گا لیکن وہ ان کے گھر نہیں جائے گا۔ اس کا فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ ہر مشرقی مرد کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیوی ہر کسی کی گاڑی میں بیٹھ جانے والی لڑکی نہ ہو اور آج جو اس نے دیکھا اس سے نہ صرف وہ بدظن ہوا تھا بلکہ وہ اس لڑکی کے بارے میں شدید قسم کے شک و شبہے میں پڑ گیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جرأت نے اسے بوکھلا دیا ہو اور وہ فطری رد عمل کے تحت بھاگی ہو مگر کم از کم ایک بات واضح تھی کہ پسند ناپسند ایک طرف، مگر وہ کسی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اس لڑکے کے والد کے رشتہ بھیجنے میں حیا کی رضا شامل ہو اور اسی لیے وہ جہان یا ممی کی آمد کا پوچھ رہی تھی تاکہ جلد از جلد یہ رشتہ منطقی انجام تک پہنچ جائے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور سے شادی کر سکے۔

"لعنت ہے مجھ پر جو میں نے سلیمان ماموں کی بیٹی اور فرقان ماموں کی بھتیجی سے اچھی امید رکھی۔"

دل میں آئے بغض کو ختم کرنے کے لیے اسے بہت سا وقت چاہیے تھا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد ٹھنڈا ہو کر سوچنے پہ دل صاف کر لے۔ برسوں اس نے اس دنیا میں کام کیا تھا، جہاں ہر شخص کے دو سے زیادہ چہرے ہوتے تھے۔ دوسرے انسانوں پر سے اعتبار تو وہ بہت پہلے کھو چکا تھا، اب اپنی بیوی پر سے بھی کھو دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ ماموں سے ملنے نہیں گیا۔ امید دلائے بغیر رشتہ ختم کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بس چند دن وہ اس لڑکی پہ مزید نظر رکھے گا۔ آخر اسے ممی کو اس رشتے کو توڑنے کے لیے ٹھوس وجوہات بھی تو دینی تھیں۔

ایک دفعہ پھر وہ اپنی سوچ میں "حیا" سے واپس "اس لڑکی" تک آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ نوجوان جس کے ساتھ اس نے اس لڑکی کو بیٹھتے دیکھا تھا اور بعد ازاں اسے فرائی پان بھی دے مارا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ اگلے کچھ دن وہ بہت مصروف رہا اور اسے اپنے ماموؤں کے گھر کے قریب سے بھی گزرنے کا وقت نہ ملا لیکن شک کا جو کھٹکا اس کے دل میں پڑ گیا تھا‘ اس کی تصدیق کے لیے اس نے حیا کے ای میل ایڈریس پہ ”کلون“ لگا دیا تھا (اس کا ای میل ایڈریس ممی نے روحیل سے لے کر دیا تھا اسے) اس کلون ہیکر کے باعث اب اس ای میل ایڈریس میں جیسے ہی کوئی میل آتی یا باہر جاتی تو اگلے ہی سیکنڈ وہ اسے اپنے فون پہ موصول ہو جاتی۔ وہ اس لڑکے کا نام نہیں جانتا تھا اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا پھرے۔ اسے بس یہی معلوم کرنا تھا کہ اس کی منکوحہ کسی اور کے ساتھ وابستہ تو نہیں۔ اگر ہے تو بہت اچھا‘ کوئی ٹھوس چیز اس کے ہاتھ لگ جائے پھر ممی کو راضی کر لے گا۔ ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی‘ مگر اس کا تذبذب بہرحال ختم نہیں ہوا تھا۔

داور کی شادی کو آٹھ‘ نو دن گزر چکے تھے۔ اس سہ پہر جب وہ اپنے اپارٹمنٹ کا لاک کھول رہا تھا‘ اس کا موبائل بجا۔ دروازہ احتیاط سے تھوڑا سا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے آنے والا پیغام کھولا۔ وہ حیا کی ایک ای میل کی کاپی تھی‘ جو اس نے ابھی ابھی بھیجی تھی۔ دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے جہان نے موبائل کی اسکرین پہ چمکتا پیغام پڑھا۔

”نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم“ اس نے اچنبھے سے اس ایڈریس کو دیکھا جس کو ای میل بھیجی گئی تھی۔ اس کو کیا ضرورت پڑ گئی سائبر کرائم سیل کو میل کرنے کی؟

میل میں ایک ویب سائٹ پہ کسی ویڈیو کا پتا لکھا تھا اور ساتھ میں ایک مختصر سی شکایت تھی‘ جس کے مطابق اس کے کزن کی مہندی کی تقریب‘ جو کہ چند روز قبل منعقد ہوئی تھی‘ کی کوئی فیملی ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈال دی گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف پرائیویسی ایکٹ کے تحت شکایت کر رہی تھی کہ اسے فوری طور پر ہٹایا جائے۔

جہان نے ویڈیو کے پتے کو چھوا‘ مگر بہت بھاری ہونے یا نیٹ کی رفتار کم ہونے کے باعث کھل نہ سکی۔ خیر ویڈیو بعد میں دیکھ لے گا‘ ابھی اسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ جس سائبر کرائم سیل سے اس نے رجوع کیا تھا‘ وہ ایک غیر فوجی ایجنسی کا سیل تھا اور وہ میل کا جواب تین چار دن بعد ہی دیا کرتے تھے اور ان کا طریقہ کار ذرا پیچیدہ تھا۔ وہ پہلے شکایتی فارم بھیجتے‘ جو ایف آئی آر کے مترادف ہوتا اور پھر ایک دفعہ بیان لینے کے لیے ایجنسی کے تھانے ضرور بلایا کرتے تھے۔ اب یہ خاندانی لڑکیاں کدھر تھانے کچہری کے چکر کاٹتی پھریں گی‘ اس لیے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ اس سے لاکھ گلے شکووں کے باوجود وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

ممی سے اس نے حیا کا موبائل نمبر بھی ای میل ایڈریس کے ساتھ لیا تھا۔ (ممی سے حیا کا کوئی خاص رابطہ تو نہ تھا‘ بس ایک دفعہ فاطمہ مامی نے حیا کے موبائل سے کال کیا تھا تو نمبر آگیا۔) اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ سرکاری فون تھا‘ اس کا نمبر کسی کی سی ایل آئی پہ نہیں آتا تھا۔ صرف ”پرائیوٹ نمبر“ لکھا آتا تھا۔

آواز بدلنا کبھی بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ان کو اس چیز کی بہت اچھی تربیت دی جاتی تھی‘ مگر صرف آواز بدلنے میں غلطی کا‘ یا پکڑے جانے کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے Voice changing application بھی آن کر دی۔ یہ خودکار نظام اس کے لبوں سے نکلے ہر لفظ کو سیکنڈ کے دسویں حصے بعد حیا کی سماعت تک ایک مختلف مردانہ آواز میں پہنچاتا تھا۔

جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ خوب صورت‘ مگر مدھم سا گمبھیر پن لیے۔ صوفے پہ نیم دراز ہوئے‘ وہ بہت اطمینان سے ایسی باتیں کر رہا تھا‘ جو اس لڑکی کو چونکانے کے لیے کافی تھیں۔ ویڈیو ہٹانے کا وعدہ لے کر اس نے وہی بات کہی جو سائبر کرائم والے بھی لازماً کہتے۔ ”ہمارے آفس آ کر باقاعدہ رپورٹ کریں۔“ اس بات پہ وہ باقاعدہ سٹپٹا گئی اور پھر جلدی سے فون بند کر دیا۔ جہان نے قدرے اچنبھے سے ریسیور کو دیکھا۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی تھی؟ شاید مسئلہ سنگین تھا۔ اسے وہ ویڈیو دیکھ لینی چاہیے۔

قریباً دس منٹ بعد وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ اس ویڈیو کو کھول رہا تھا۔ جیسے ہی صفحہ لوڈ ہوا اور اوپر ویڈیو کا نام جگمگایا‘ وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے جیسے ویڈیو چلتی جا رہی تھی‘ اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہوتے گئے۔ پیشانی کی رگیں تن گئیں اور آنکھوں میں شدید غصہ در آیا۔

یہ تھا اس کے ماموں کا عزت دار خاندان؟ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں کی عزت و عصمت والی بیٹیاں؟

وہ مکمل طور پہ زنانہ فنکشن نہیں تھا۔ اسے پیچھے پس منظر میں ویٹرز اور ڈی جے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ بھی تو مرد تھے۔ ان سے کوئی پردہ نہیں؟ کوئی شرم‘ لحاظ نہیں؟ کیسے لوگ تھے یہ؟ کیا ہو گیا تھا پاکستان کو؟

دکھ‘ طیش‘ استعجاب۔ ایک دم وہ بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ بے حد غصے سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ جیل میں گزرے وہ ایک ماہ دس دن اس کے اندر بہت تلخی بھر گئے تھے اور گو کہ وہ اس تلخی کو دبا گیا تھا‘ مگر ختم نہیں کر پایا تھا اور دبانے اور ختم کرنے میں خلیج بھر فرق ہوتا ہے۔

اسے اتنا غصہ تو اس لڑکی کو اس گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا جتنا اس واہیات ویڈیو کو دیکھ کر آرہا تھا۔ یہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت باکردار اور اچھا تھا۔ بس وہ دونوں دو مختلف طریقوں سے پروان چڑھنے والے دو مختلف انسان تھے۔ دریا کے دو کنارے اور اب تو وہ ممی کی خوشی کے لیے بھی اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے ”میجر احمد“ یعنی اپنا نام فون پہ کیوں بتایا۔ بہرحال اس غلطی کو وہ کور کر لے گا۔ وہ اسے معلوم نہیں ہونے دے گا کہ وہی میجر احمد ہے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی مسئلہ اس کے اسکالر شپ کا تھا۔ جب یہ طے تھا کہ وہ اس کے ساتھ رشتہ نہیں رکھنا چاہتا‘ تو پھر وہ کیوں اگلے پانچ ماہ استنبول میں اس کے لیے ہلکان ہو؟ ممی کا خیال تھا کہ وہ آئے گی تو ان ہی کے پاس رہے گی اس صورت میں تو اور بھی مسئلہ ہو گا کہ وہ استنبول میں دو شناختوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی جہانگیر میں رہنا پڑتا تو کبھی بیوک ادا میں۔ اگر وہ دو دن بھی اس کے گھر رہی تو جان جائے گی کہ اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ ایسے میں اس کے لیے خود کو چھپا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب کہ اسے زندگی میں شامل نہیں کرنا تو پھر رازوں میں بھی شریک نہیں کرنا۔

وہ یہی بات بار بار سوچے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے ہاں کام کرنے کے دو طریقے بتائے جاتے تھے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ بلاواسطہ طریقہ وہ عموماً پہلے استعمال کرتا تھا‘ اگر وہ ناکام ہو جائے‘ تب بالواسطہ راستہ چنا جاتا۔

فی الحال وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ لڑکی ترکی نہ آئے۔ اس کی وجہ اس نے اپنے آپ کو یہی بتائی کہ وہ یہ صرف اور صرف اپنی دوسری زندگی میں کوئی گڑبڑ ہونے سے بچاؤ کے لیے کر رہا ہے۔ وہ آئے گی اور پھر وہ اس سے ملے گی‘ اس سے امیدیں وابستہ کرلے گی یا شاید وہ طلاق لینا چاہے‘ اس صورت میں ممی ہرٹ ہوں گی‘ اف۔۔۔۔ ان سارے مسئلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ کچھ ایسا ہو جائے جس سے وہ رک جائے اور استنبول جانے کا پروگرام منسوخ کر دے۔

حماد اس کے آفیشل کام میں آج کل اس کی مدد کروا رہا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کے بعد لمبی چھٹی پہ تھا‘ اس لیے باآسانی اس کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ اس نے حماد سے مدد لینے کا سوچا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"دیکھو! میں صرف تمہاری تسلی کے لیے تمہاری مدد کرنے پہ تیار ہوں' ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری بیوی ترکی پڑھنے جارہی ہے' تمہاری نگرانی کرنے نہیں۔ اس کو کبھی بھی تمہاری سرگرمیوں پہ شک نہیں ہو گا۔ تم ہر چیز ٹھیک سے سنبھالنا جانتے ہو اصل بات یہ ہے کہ تم اس کو وہاں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتے' تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم اس سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ اور اس صورت میں تمہیں اپنے ماموؤں کے سامنے ہارنا پڑے گا۔ تمہارا دل اس رشتے کو رکھنے پہ راضی ہے' مگر دماغ جو آج بھی اپنے ماموں سے انتقام لینے کا خواہش مند ہے' خائف ہے کہ کہیں دل کے جذبات انا پہ حاوی نہ ہو جائیں۔ پھر بھی میں جو کر سکا' کروں گا۔"

حماد نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ جہان خفگی سے سر جھٹک کر رہ گیا' جیسے اسے سچ سن کر برا لگا ہو۔ بہرحال' وجہ جو بھی ہو' وہ پاکستان سے روانگی سے قبل اس دردِ سر سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس نے وہ ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈالنے والے کو بھی ٹریس کر لیا تھا۔ وہ وہی مووی میکر تھا جو مہندی کی تقریب کی ویڈیو بنانے وہاں گیا تھا اور یہ کام اس نے اپنے موبائل کے کیمرے کے ذریعے ایک ویٹر سے لیا تھا۔ اس نے اپنی ایجنسی کے سائبر کرائم سیل والوں کے حوالے اس آدمی کو کرا دیا تھا' اور اس نے جس جس کو وہ ویڈیو دی تھی' وہ بھی نکلوالی تھی۔ پھر بھی' اگر نیٹ پر سے کسی نے اسے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہو تو اس کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ کہیں نہ کہیں تو وہ ویڈیو ضرور ہو گی۔ ساری دنیا سے تو وہ نہیں نکلوا سکتا تھا۔ بہرحال اس نے اس مووی میکر کے اکاؤنٹ کو اپنی دسترس میں لے لیا تھا۔ ویڈیو اس نے ہٹائی نہیں کہ ہٹانے کی صورت میں وہ لڑکی کبھی اس سے ملنے نہ آتی۔ مگر اس کا صفحہ بلاک ضرور کر دیا' یوں کہ اس کے ماموں کے گھر کے سیکٹر کے علاوہ وہ ملک میں کہیں بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اپنی ویڈیو ہٹوانے کے لیے وہ اس کے پاس ضرور آئے گی۔

اگلے روز اس کو حماد کے ساتھ چار پانچ گھنٹے سڑک پہ میڈم سیکنڈ سیکریٹری کی کار کے انتظار میں گزارنے تھے۔ وہ ایک ایسی مرکزی شاہراہ تھی جہاں ہر پل رش ہوتا تھا۔ اس کو موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ بھی یہاں سے گزرے۔ وہ عموماً" ہر وقت باہر ہی نکلی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔

اس سڑک پر تو نہیں مگر قریب میں ایک ذیلی سڑک پر وہ ایک ٹریفک جام میں ضرور پھنسی ہوئی تھی۔ جہان اور حماد کا کام آج بھی نہیں ہو سکا تھا سو اس نے سوچا' وہ یہ دوسرا کام نپٹا ہی دے۔ پاکستان میں اس نے عورتوں کو اگر کسی شے سے بہت ڈرتے دیکھا تھا تو وہ خواجہ سرا کی بددعا تھی' بالخصوص سفر سے پہلے اگر خواجہ سرا بددعا دے دے تو اس بدشگونی کے بعد لوگ سفر ترک کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بددعا کے اس اصل کو بھول جایا کرتے تھے کہ بددعا چاہے نیک آدمی دے' یا فاسق' چاہے معذور دے یا صحت مند' وہ تب تک آپ کو نہیں لگ سکتی' جب تک آپ اس کے اہل نہ ہوں اور اگر آپ اس کے اہل نہ ہوں تو وہ دینے والے پہ پلٹ آتی ہے مگر اسے امید تھی کہ اس کی بیوی بھی ان ہی ضعیف العقیدہ لوگوں میں سے ہو گی جو خواجہ سرا کی بددعا سے ڈرتے تھے۔

وہ صرف پانچ منٹ اس کام کے لیے نکال سکتا تھا' اسے واپس جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ مگر جب ان دونوں نے اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم اتنے غصے میں آ گئی کہ ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ حماد تو جانے کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ مگر وہ کچھ سننے پہ تیار نہ تھی۔ اس نے جیسے بھلا دیا تھا کہ ڈولی نے اس پہ کبھی کوئی احسان کیا تھا۔ وہ کوئی بات سننے پہ تیار ہی نہ تھی' بلکہ مسلسل ان کو ہٹنے اور جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہاں تک ہوتا تو ٹھیک تھا' مگر وہی اس لڑکی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت۔

اس نے حماد کی انگلیاں شیشے میں دے دیں۔

وہ ذرا سا زخم اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا' اگر حماد کا وہ ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

فریکچر کے بعد اب تندرستی کی طرف نہ بڑھ رہا ہوتا۔ ایسے میں اس کی وجہ سے وہ ہاتھ زخمی ہوا۔ اسے شدید غصہ آیا۔ دوسری طرف اس کا دوسرا کام بھی نہیں ہو سکا تھا' ان دونوں باتوں پہ وہ شدید غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

وہ اسے نہیں روک سکا۔ اسے اپنی یہ بے بسی غصہ دلا رہی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ منظر جب وہ اس لڑکے کی کار میں بیٹھ رہی تھی اور وہ ویڈیو۔ وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا' پھر بھی ایک دفعہ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے کسی طرح اسکالرشپ لینے سے باز رکھ سکتا تھا تو یقیناً" وہ اسے ترکی میں نہیں دیکھے گا۔ اس لیے یہ ملاقات اہم اور ضروری تھی۔

وہیں بستر پہ لیٹے لیٹے اس نے اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ملایا۔ کافی گھنٹیوں بعد اس نے فون اٹھالیا اور چھوٹتے ہی ملنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو اور اس کے انداز سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ملنے آئے گی۔ پتا نہیں اس نے ان سفید پھولوں کے بارے میں اپنے گھر میں کیا بتایا ہو گا۔ شاید اس نے کوئی بہانہ کر دیا ہو۔ شاید پھول چھپا دیے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ کل اپنے ابا کو ساتھ لے آئے۔ ویسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو درمیان میں لائے گی۔ جو بھی تھا' وہ لڑکی کافی باہمت اور اپنے مسائل خود حل کرنے والی لڑکی لگتی تھی۔

اس سے ملنے کے لیے ایک جعلی سیف ہاؤس کا انتظام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سب انتظام اس نے خود ذاتی طور پہ کیا تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ اس سے اسکرین کے پیچھے سے بات کرے گا۔ جیسے بعض اوقات کچھ لوگوں کو تفتیش یا پوچھ گچھ کے لیے بلا کر بات کی جاتی تھی۔ اس نے اپنا درست نام میجر احمد بتا کر البتہ غلطی کی تھی ہو سکتا ہے فرقان ماموں کی وہ بات کہ سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹڈ ہے' اس نے سن رکھی ہو اور وہ اس بارے میں شبہات کا شکار ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دادا کا نام بھی معلوم ہو اور اب اگر ایک میجر احمد اس کے سامنے خود کو چھپاتا ہے تو وہ دو جمع دو کر کے یہ جان سکتی تھی کہ وہ کون ہے۔

وہ اتنی ذہین تھی یا نہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ خود ایک کاملیت پسند تھا۔ اس کی کور اسٹوری میں کوئی خامی' کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے' یہ اس نے اپنی جاب کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے پاس حیا کو دینے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ کیوں اس سے اسکرین کے پیچھے بات کر رہا ہے اور وجہ بہت سادہ سی تھی۔

وہ اسے یہ تاثر دے گا کہ اس کا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ اسکرین چونکہ فروسٹڈ گلاس کی تھی تو اس کے پیچھے اگر وہ احمد کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھتی تو جھلسا ہوا حصہ نمایاں نہ ہوتا' دھندلے شیشے کے باعث اسے کالی گہرے رنگ کا برن بناتا تھا۔ وہ یہی قیاس کرے گی کہ وہ اپنے احساس کمتری کا شکار ہے اور اسی لیے ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے آنے سے خائف ہے۔ ایک کامل اور ٹھوس وجہ۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اگر وہ اس کی بات نہیں سمجھتی اور اسکالرشپ سے پیچھے نہیں ہٹتی تو وہ ایک آخری کوشش کے طور پہ حماد کو اس سے بات کرنے کو کہے گا اور حماد کے نزدیک اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ خود کو میجر احمد ظاہر کر کے اس سے مل لے اور کسی بھی طرح اسے سمجھا دے کہ اس کے شوہر کے لیے یہ درست نہیں ہو گا کہ وہ وہاں جائے اور یہ کہ اس کا شوہر کہیں اس کی وجہ سے مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ ابھی اس گفتگو کا پورا متن طے ہونا باقی تھا' مگر یہ طے تھا کہ وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ اس کا کوئی رشتے دار ان کے قریب استنبول میں رہے۔ یہ اس کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔

"مجھے لگتا ہے تم اپنی مسز کے آنے سے خائف اس لیے ہو کہ تم کہیں ان کی محبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

کہیں تم ان سے متاثر نہ ہونے لگو اور کہیں تمہارے پاس ان کو اپنی زندگی سے نکالنے کی وجہ ختم نہ ہوجائے۔" حماد اس کا مکمل ساتھ دے رہا تھا مگر ساتھ میں وہ مسکرا کر ایسا تبصرہ بھی کردیا کرتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر نظر انداز کردیتا۔

جب وہ میجر احمد کے اس خود ساختہ آفس آئی تو چیکنگ کے بہانے اس کا موبائل اس سے لے لیا گیا اور اس میں ایک بہت وسیع رینج کا حامل جی پی ایس ٹریسنگ ڈیوائس ڈال کر واپس کردیا گیا۔ اگر وہ ترکی چلی جائے، تب یہ ڈیوائس اس کے بہت کام آئے گا۔

جب وہ اندر آئی اور جہان اس سے مخاطب ہوا تو سب سے پہلے اس نے اسے یقین دلایا کہ اس ویڈیو کو وہ شہر کے ایک ایک بندے سے نکلوا چکا ہے۔ یہ سچ تھا۔ کم از کم شادی کے فنکشن کی مووی بنانے والے جس مووی میکر کی یہ حرکت تھی، اس نے پوچھ گچھ پہ ہر اس شخص تک ان کو رسائی دے دی تھی جس کو اس نے یہ ویڈیو دی تھی، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے ویڈیو مزید آگے کی ہو، یا لوگوں نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کرلی ہو، یا کسی بھی دوسری صورت میں کہیں نہ کہیں وہ ویڈیو ضرور کسی کے کمپیوٹر میں پڑی ہوگی۔

لیکن بعض باتیں انسان غیر ارادی طور پہ کہہ دیتا ہے۔ جیسے جب اس نے بتایا کہ اس نے صرف صبر نہ کرسکنے کے باعث ملاقات کا بہانہ بنایا تھا تو لمحے بھر کو وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ان پچھلے چند دنوں میں دیکھے جانے والے ناقابل برداشت مناظر کے باوجود وہ اس لڑکی سے بغیر کسی وجہ کے ملنا چاہتا تھا؟ یا پھر جو وجوہات اس کے پاس تھیں، وہ محض اس کے قریب رہنے کا جواز تھا؟ شاید حماد ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں دو بہت مختلف سے لوگ کبھی بھی ایک نہیں ہوسکیں گے۔

اس ملاقات میں اس نے اس لڑکی سے چند ایک سوال پوچھے، جن پہ حسب عادت وہ تپ اٹھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اسے نصیحت کرنا چاہ رہا تھا، اس نے ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیا، نہ ہی اس کی بات میں دلچسپی لی۔ تب اس نے وہ سوال کیا، جس سے وہ شادی کے بارے میں اس کی ترجیحات جان سکے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فوراً" انکار کردے گی، مگر کس وجہ کی بنا پہ؟ اور جب اس نے وجہ بتائی تو لمحے بھر کو وہ خود بھی چونک کر رہ گیا۔ وہ جتنے یقین اور استحقاق سے "میرا شوہر، میرا شوہر" کہہ رہی تھی۔ وہ پھر سے اپنے بارے میں بے یقین ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فرقان ماموں کے وہ الفاظ دہرائے، جو انہوں نے ممی، ابا اور اس کی پاکستان واپسی کے بارے میں کہے تھے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ابا کے بارے میں کتنا جانتی ہے؟ مگر وہ حسب عادت بھڑک کر اٹھ گئی۔

تب اس نے اپنے قریب رکھے سرخ گلابوں کے بکے میں (کہ آج اسے واقعتاً "سفید گلاب نہیں ملے تھے، نہ اس نے تگ ودو کی تھی۔) ایک ننھا سا کارڈ لکھ کر ڈالا۔

"آنے کا شکریہ۔ اے آر پی۔"

کارڈ اس نے پھولوں کے اندر رکھ دیا۔ اس کے ساتھی نے بعد میں باہر جا کر حیا کو پھول دینے چاہے، مگر اس نے تو ان کو دیکھا تک نہیں اور چلی گئی۔ وہ جیسے بہت غصے میں تھی۔

ان تمام دنوں میں یہ وہ پہلا دن تھا، جب جہان نے اس پہ بہت وقت صرف کیا تھا۔ گوکہ وہ بنیادی طور پہ اتنا چوکس آدمی تھا کہ اسے وقت نکالنا آتا تھا، مگر ابھی تک، جو وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ صرف اسے اسکالر شپ لینے سے روکنے کے لیے کررہا ہے۔ خود بھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر وہ اس کے سامنے آئی بیٹھی تھی تو اس نے ہر بات کہہ دی، سوائے اسکالر شپ نہ لینے کے۔ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ ان کی گفتگو جس نہج موڑ پہ آرکی تھی، اس کے بعد اس کو کسی کام سے منع کرنے کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کر وہی کام کرے گی۔

مگر وہ ایک دفعہ پھر سے کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دو دن وہ اپنے کام پیک اپ کرتا رہا۔ اس کا کام ٹھیک سے نہیں ہوپایا تھا کیونکہ میڈم سیکنڈ سیکریٹری واپس جارہی تھیں کسی میٹنگ کے سلسلے میں۔ اس کے پیشے میں اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ بہت دن بہت صبر و تحمل سے کسی معلومات کے ملنے کے انتظار کے بعد ایک دم سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

تیسرے روز وہ رات میں پھر جناح سپر مارکیٹ کے ایک ویران سے چبوترے پہ اسے ملا تھا۔ دنیا کے ہر حساس ادارے میں سب سے زیادہ قدیم اور کسی حد تک گھسا پٹا طریقہ جو کسی بھی شخص کا احسان و اعتماد جیتنے کا اپنایا جاتا تھا۔ وہ یہی تھا کہ پہلے آپ اپنے مطلوبہ شخص کو کسی مصیبت میں گرفتار کروائیں، پھر عین وقت پہ پہنچ کر خود کو ہیرو ثابت کردیں۔ اگر اگلا شخص عقل مند ہوا تو آپ کی حرکت جان جائے گا اور کبھی بھی آپ کا احسان مند نہیں ہوگا۔ اسے انہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی عقل مند ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں جان پائی کہ لڑکے اسے کس کے کہنے پہ ستا رہے تھے۔ اسے اس روز وہ ذرا غائب دماغ لگی تھی۔ جیسے کسی بات پہ الجھی ہوئی ہو۔ وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ آج پھر اس کی گفتگو میں شوہر کا تذکرہ تھا۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کیوں کررہی ہے؟ تاکہ رشتہ ختم کرسکے؟ یا پھر رشتہ نبھا سکے؟

جو بھی تھا، وہ میجر احمد کا امپریشن اس پہ بہت اچھا ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے شک بھی پڑے کہ وہی ڈولی دراصل میجر احمد ہے۔ چبوترے پہ جانے سے قبل اس نے چند ایک رسمی فقرے ریکارڈ کرکے اس ریکارڈنگ کا ٹائم لگا دیا تھا۔ عین وقت ہونے پہ حیا کا فون بج اٹھا۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میجر احمد کی احسان مند ہے بھی یا نہیں، مگر اس نے عادت کے مطابق پوری بات سنے بغیر ہی جھڑک کر فون رکھ دیا۔ وہ میجر احمد کو پسند نہیں کرتی، وہ جان گیا تھا۔

پھر اسے وہ گاڑی والا لڑکا یاد آتا تو لگتا کہ وہ واقعی جہان سے رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ شاید میجر احمد کے سامنے وہ اپنے شوہر کا ذکر صرف دھمکی کے طور پہ کررہی تھی تاکہ وہ اسے تنگ نہ کرسکے۔

جب وہ جانے لگی تو اس نے وہی کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی بددعا سن کر وہ رک جائے۔ پھر وہ چبوترے کی دیوار کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ تب بھی اسے امید تھی کہ وہ مڑ کر ضرور آئے گی۔ یہ دیکھنے کہ وہ کون ہے اور کیوں ہے؟ مگر وہ ذرا سی رکی، مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آگے بڑھ گئی۔ اس کا ذہن واضح طور پہ کہیں اور الجھا تھا۔

جہان کا کام نہیں ہوسکا تھا۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ اس کو اب واپس جانا تھا۔ پندرہ جنوری کو اس کی فلائٹ تھی۔ اس کے پاس اب صرف ایک دن تھا۔ صرف اور صرف اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"میں صرف تمہاری تسلی کے لیے ان سے بات کرلوں گا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ تم اب خود نہیں چاہتے کہ وہ رک جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اس کے لیے کوئی مؤثر طریقہ اپناتے۔ ان کے پیپر ورک میں مسئلہ کرواتے۔ ان کے والدین کو کسی طرح اپروچ کرکے انہیں باز رکھنے کا کہتے۔ مگر تم جو بھی کررہے ہو، وہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو روک سکو، بلکہ اس لیے ہے تاکہ تم ہر دوسرے دن ان سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا موقع پیدا کرلو۔ تمہارا دل کہتا ہے کہ تم یہ رشتہ نبھاؤ اور یہ کہ وہ ضرور ترکی آئیں تاکہ تم ان کو بہتر طور پہ جان سکو مگر تمہارے دماغ میں تمہارے ماموؤں کے خلاف جو عناد بھرا ہے۔ وہ تمہیں یہ رشتہ توڑنے پر اکساتا ہے۔ تم خود بھی کنفیوژڈ ہو جہان! کہ تمہیں کیا کرنا ہے مگر کبھی کبھی انسان کو خود سے سچ بول لینا چاہیے۔ اس سے بہت سی کنفیوژن ختم ہوجاتی ہے۔"

مگر وہ حماد کی ایسی ساری باتیں نظر انداز کررہا تھا۔ اب بھی وہ اسی بات پہ قائم تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے قریب ترکی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ چونکہ اب اس کو روانگی کا حکم مل چکا تھا اور کل دوپہر میں اس کی فلائٹ تھی۔ سو وہ ایک آخری کوشش آج کے دن کرنا چاہتا تھا۔

حماد کو آج اپنی امی اور بہن عینی کے ساتھ شاپنگ پہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانا تھا۔ وہ لوگ اس کی شادی کی شاپنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف جہان اپنے اپارٹمنٹ میں پیکنگ کر رہا تھا۔ ساتھ میں وہ اپنے ٹریسر کا اسٹیٹس ضرور چیک کرتا تھا۔ صبح وہ ڈپلومیٹک انکلیو میں تھی، پھر پنڈی چلی گئی شاید۔

اس نے وہاں سے کچھ اٹھانا ہو، کیونکہ پھر وہ واپس ڈپلومیٹک انکلیو چلی گئی تھی۔ ابھی دوپہر پوری طرح سے نہیں چھائی تھی، جب جہان نے اسے ایف سیون کی طرف جاتے دیکھا۔ کل رات بھی وہ جناح سپر میں تھی، سو آج بھی شاید وہیں جا رہی ہو۔ اس لڑکی کو شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ بہرحال اس نے حماد سے بات کی۔ وہ لوگ ایف ٹین جا رہے تھے، مگر چونکہ وہ حیا سے بات کرنے کے لیے راضی تھا، اس لیے وہ جناح سپر چلا آیا۔

حماد اس سب کو ایک اتفاقیہ ملاقات کی طرح پلان کرنا چاہ رہا تھا چونکہ یہ طے تھا کہ وہ اسے اپنے میجر احمد ہونے کا تاثر دے گا۔ اس لیے یہ غلط لگتا کہ جو شخص اپنی بدصورتی کے باعث پہلے اس کے سامنے نہیں آرہا تھا۔ اب بالمشافہ ملاقات پہ راضی ہو گیا تھا۔ اپنی جاب میں وہ اکثر ایسے اتفاقیہ مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ لوگ احمق تھے، جو موقع ملنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مواقع ڈھونڈے نہیں، پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک بہت معصوم سے اتفاق میں وہ ایک ہی دکان میں اس سے ٹکرا جاتا۔ وہ یقیناً "اس کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھ کر چونکتی، اسی پل عینی اسے احمد بھائی کہہ کر پکارتی۔ عینی کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ آج وہ اسے مارکیٹ میں احمد بھائی کہہ کر پکارے گی۔ کیونکہ وہ کسی کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا نام حماد نہیں احمد ہے۔ عینی اپنے بھائی کی ان مشکوک حرکتوں کی عادی تھی۔ وہ شانے اچکا کر راضی ہو گئی۔ جو بھی تھا۔ اپنے بھائی کی مدد کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

"میں فیملی کے ساتھ مارکیٹ میں ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس شاپ میں جائیں گی؟" حماد نے وہیں سے اسے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا بیگ پیک کر رہا تھا۔

"وہ جو سعید بک بینک والا پلازہ ہے، اس میں جہاں ایک خالی چبوترہ سا بنا ہے۔"

"ہاں، مگر پھر کوئی بک فیئر لگا ہوا ہے۔ وہ خالی نہیں ہے۔"

"اس کے آس پاس کوئی کپڑوں یا جوتوں کی ایسی شاپ ہے، جس پہ سیل لگی ہو؟" وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں ایک چیز کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کپڑوں، جوتوں کی بہت شوقین تھی۔

"ہاں۔۔۔ آگے ایک جگہ سیل لگی ہوئی ہے۔"

"تم وہاں جاؤ، وہ ادھر ضرور آئے گی۔" وہ بہت وثوق سے بولا تھا۔

"او کے۔" حماد نے فون بند کر دیا۔

وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے پھر اسی نہج پہ سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے، یا پھر بس اس کی ہر پل خبر رکھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا؟ "جہان! تم کنفیوزڈ ہو۔" اس نے خود کو سرزنش کی۔

پورا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا جب حماد کا دوبارہ فون آیا۔ وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ حماد کا نمبر فون پہ دیکھ کر ایک دم اس کا دل بہت اداس ہوا۔ یقیناً "حماد نے اس سے بات کر لی ہو گی اور اب وہ ترکی نہیں آرہی ہو گی۔ اس نے کال موصول کی۔

"اچھی بے عزتی کروائی آج تم نے میری۔" حماد ایک دم شروع ہوا۔ جہان سیدھا ہو بیٹھا وہ سخت غصے میں اس کو ملامت کیے جا رہا تھا۔

"میرے بھائی! ہوا کیا ہے؟"

"بھابھی نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے پوری شاپ میں سب کے سامنے اعلانیہ جتایا کہ میں پچھلی بنا سڑک پہ گداگری کر رہا تھا۔ لعنت ہے مجھ پہ اور لعنت ہے اس دن پہ جب میں نے تمہاری مدد کرنے کا سوچا۔"

"اس نے۔۔۔ اس نے کیسے پہچانا؟" جب اس کے منہ پہ سلش گرا تھا۔ تب بھی اسے جھٹکا لگا تھا اور اب بھی ایسا ہی جھٹکا لگا تھا۔

"میرے ہاتھ پہ جو نشان ہے اور انگلیوں پہ جو انہوں نے اس دن زخم دیے تھے۔ ان ہی سے انہوں نے پہچان لیا اور میری فیملی کے سامنے اچھی خاصی میری بے عزتی کر دی۔"

"تو تم نے اس سے بات نہیں کی؟"

"میں اس سارے ہنگامے کے بعد کیا بات کرتا؟ میں تو جلدی سے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ شاپ کیپر آگیا۔ اس دن ثانیہ اور میں نے یہیں سے شاپنگ کی تھی۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ بس شکر تھا کہ اس نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر۔۔۔" غصے سے بولتے بولتے وہ ایک دم رکا۔ "تم جو چاہ رہے تھے کہ میجر احمد کا امپریشن اچھا پڑے، وہ اب نہیں ہو سکے گا، کیونکہ میں نے عینی سے کہا تھا کہ وہ مجھے احمد کہہ کر پکارے گی اور اس نے تمہاری مسز سے لڑتے ہوئے بھی میری ہدایت یاد رکھی۔"

"اس سے بہتر تھا، میں تمہیں کام نہ ہی کہتا۔"

"جہان! ایک منٹ، مجھ سے بول لو، خیر ہے، مگر خود سے جھوٹ مت بولو۔ سچے دل سے تسلیم کر لو کہ تم کبھی ان کو روکنا نہیں چاہتے تھے۔ تم اب بھی چاہتے ہو کہ وہ تمہارے استنبول ضرور آئیں۔ اس لیے اس بارے میں پریشان مت ہو اور جانے کی تیاری کرو۔ ویسے اچھی خاصی خوش اخلاق بیگم ہیں آپ کی۔"

اس کی آخری بات پہ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔ حماد ٹھیک کہتا تھا۔ اسے اپنے اندر کی کنفیوژن ختم کر دینی چاہیے۔ وہ اس کے ترکی آنے سے پریشان تھا مگر ناخوش نہیں۔ اس نے بالآخر خود سے سچ بول ہی لیا۔ وہ کسی لڑکی کے اپنے اعصاب پہ حاوی ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ لڑکی بھی وہ جو سلیمان ماموں کی بیٹی تھی۔ مگر اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جب اسے ماموں سے انتقام لینا ہی نہیں ہے تو پھر ان کے خلاف دل میں عناد کیوں رکھے؟ اور شاید وہ خود بھی یہ رشتہ نہ چاہتی ہو۔ جہان کو اس کا اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنا یاد تھا۔ "چلو ٹھیک ہے، وہ آجائے گی تو کبھی نہ کبھی وہ اس سے یہ بات کلیئر کر لے گا۔"

اب وہ مطمئن تھا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر شام اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی یک ٹک لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک لڑھک کر اب سوکھ چکے تھے۔ کہیں پس منظر میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگر وہ اس جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ صرف اس ایک شخص کو دیکھ رہی تھی، جو اس سے ہم کلام تھا۔ بہت مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سناتے ہوئے بھی درمیان میں اٹھ کر وہ کافی بنا لایا تھا۔ فارغ تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ مگر آج جب اس نے ویڈیو کے کھلتے ہی جہان کو بیوک ادا کے سفید محل میں موجود عبدالرحمٰن پاشا کے کمرے کی کمپیوٹر چیئر پہ بیٹھتے دیکھا تھا تو اسے لگا تھا وہ اس شخص کو نہیں جانتی، نہیں پہچانتی۔ وہ اس ویڈیو میں اور اے آر پی کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر پھر جیسے جیسے وہ سنتی گئی، اس کے اعصاب سن پڑ گئے۔

پہلے اسے شاک لگا، پھر غصہ چڑھا، مگر ایسا غصہ جو شطرنج میں اپنے ذہین مقابل کی چال پہ مات کھا جانے سے چڑھتا ہے اور پھر اس کی جگہ دکھ نے لے لی۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہ ہو، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ویڈیو کو وہیں روکا۔ ابھی وہ آدھی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک جہان نے اس آدمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ جس کے چہرے پہ حیا نے کافی الٹی تھی۔ اگر اس کا وہ غریب سا ریسٹورنٹ اونر جہان ہی عبدالرحمٰن پاشا تھا۔ عائشے اور بہارے کا عبدالرحمٰن پاشا۔ تو پھر بے چارا وہ کون تھا، جس پہ اس نے کافی الٹی تھی؟ اور وہ جس کو اس نے جہان کے ساتھ پینٹری میں دیکھا تھا۔ مگر ایک منٹ۔۔۔ اس نے دونوں کنپٹیوں کو انگلیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دباتے ہوئے سوچنا چاہا۔۔۔ اس کو کس نے کہا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن ہے؟ کسی نے نہیں۔ اس نے آنے کے ساتھ اس کی تصاویر دیکھ کر ازخود یہ فرض کرلیا تھا کہ وہی عبدالرحمٰن ہوگا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے کا ایک دوسرا بیٹا بھی ہے۔ ان کا اصلی بیٹا' گمشدہ بیٹا' جو عرصہ پہلے ادالار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں' وہی تو تھا ان کا گمشدہ بیٹا۔ تب ہی تو اس کی تصاویر گھر میں ہر جگہ لگی ہوئی تھیں۔ پاشا بے (مسٹر پاشا) اسی نام سے جہان اسے ریسٹورنٹ میں پکار رہا تھا' جب اس نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ عبدالرحمٰن پاشا اور پاشا بے دو الگ الگ لوگ تھے۔

فون مسلسل بجے جارہا تھا۔ اس نے اکتا کر میز پہ رکھے فون کو دیکھا۔ ابا کی سیکریٹری کو کہا بھی تھا کہ اسے مت ڈسٹرب کرے' مگر کوئی سنے تو۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"جی؟"

"میم۔۔۔ ولید صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اصرار کررہے ہیں۔ میں۔۔۔"

"نہیں بھیج دیں!" اس نے ناگواری کی اٹھتی لہر کو دبا کر کہا اور فون رکھا۔ صرف اس فضول آدمی کی وجہ سے اس کا کردار جہان کی نظروں میں مشکوک ہوکر رہ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں' وہ کمپنی کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھا۔ آج تو وہ اچھی طرح نبٹے گی اس سے۔

اس نے آفس کا لاک کھولا اور نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ لی۔ پھر لیپ ٹاپ بند کرکے فلیش ڈرائیو ڈبی میں واپس ڈال دی۔ باقی ویڈیو وہ گھر جاکر دیکھے گی۔ ویسے بھی شام ہونے کو آئی تھی۔ وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ابھی تک اس کے اعصاب شل تھے۔

دروازہ کھلا اور ولید لمبے لمبے ڈگ اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اس کے لبوں پہ ہمیشہ کی طرح استہزائیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔

وہ کرسی پہ ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں پہ کہنیاں جمائے اسے آتے دیکھتی رہی۔

"کیسی ہیں آپ میڈم ایم ڈی؟" اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔

"آپ بتائیں' کیا کام تھا؟" وہ خشک لہجے میں بولی۔ وہ رات پھر سے تازہ ہوگئی تھی۔ کیا سوچتا ہوگا جہان اس کے بارے میں؟ اف!

"کل بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں ہم آپ کے خلاف قرارداد لا رہے ہیں۔" وہ تپا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اس کی میز سے پیپرویٹ اٹھا کر انگلیوں میں گھمانے لگا۔

"کیسی قرارداد؟" اس نے حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھنے کی سعی کی۔

"آپ جانتی ہیں کہ تمام ڈائریکٹرز اگر مل کر ایم ڈی کے خلاف قرارداد لائیں۔۔۔ عدم اعتماد کی قرارداد تو ایم ڈی کو ہٹایا جاسکتا ہے۔"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید ولید نے تازہ تازہ کمپنی لاء پڑھا تھا۔ ورنہ اسے یہ خیال پہلے دن آجانا چاہیے تھا۔ "کل آپ اس آفس سے باہر ہوں گی۔ چچ چچ۔۔۔ مجھے افسوس ہورہا ہے مگر ہم نے بہت برداشت کرلیا آپ کو۔ آپ جیسی عورتوں کی جگہ گھر میں ہوتی ہے یاد رہے میں' ادھر نہیں۔"

وہ اب بھی لب بھینچے اسے دیکھتی رہی۔

"آپ یوں کریں' اپنی ضروری اشیا سمیٹ لیں۔ آخر کل آپ کو یہ جگہ چھوڑنی جو پڑے گی۔ میں یہی بتانے آیا تھا ادھر۔" وہ فاتحانہ انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیں!" اس نے انگلی سے ایک دم اتنے تحکم سے اشارہ کیا کہ وہ بے اختیار اگلے ہی پل واپس بیٹھا۔

"اب میری بات سنیں۔" حیا دونوں مٹھیاں میز پہ رکھے' کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔

"میں نے منگل والے روز ہیڈ آرکیٹیکٹ اور آپ کی گفتگو ریکارڈ کی تھی' سننا چاہیں گے؟"

ولید کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم ہوگئے۔

اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"کون سی گفتگو؟"

"انجان بننا آپ کو فائدہ نہیں دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ اس ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ پلان میں آپ کے آرکیٹیکٹ نے گڑبڑ کی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس کمپنی کو وہ پروجیکٹ مل گیا تھا۔ ان کے ساتھ آپ کے گہرے روابط ہیں۔ یہ ساری آپ کی اپنی کہی باتیں ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ ولید کے لب بھینچ گئے اور ابرو تن گئے۔

"آؤ تو کسی چیز کا ثبوت کبھی نہیں ہوسکتی مادام!"

"مجھے کورٹ میں کسی کو کچھ نہیں دکھانا۔ مجھے صرف اپنے ابا کو یہ سب بتانا ہے۔ ویسے بھی وہ اب ٹھیک ہورہے ہیں۔ اسی ہفتے دوبارہ جوائن کرلیں گے۔ آج جب گھر جاکر میں ان کو آپ کی اصلیت بتاؤں گی تو وہ اپنی بیٹی کی ہر بات فوراً مان لیں گے۔ ہماری کمپنی لاء کے مطابق اگر ایسا ٹریزن ثابت ہوجائے تو نہ صرف آپ کے شیئرز فریز ہوسکتے ہیں بلکہ ابا کو آپ جانتے ہی ہیں' وہ اپنے ساتھ دغا کرنے والوں کو یوں ہی نہیں چھوڑتے ہیں۔ سڑک پہ لے آئیں گے وہ آپ کو۔"

ولید کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔" وہ غصے سے غرایا تھا۔

"میں نے کمپنی کے ساتھ کوئی دغا نہیں کیا۔ اگر تم نے اپنے ابا کو کوئی الٹی سیدھی بات بتانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

اس نے مسکرا کر سر اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ کسی سے تو وہ بھی ڈرتا تھا۔

"میں دیکھ لوں گا تمہیں۔" ایک شعلہ بار نگاہ اس پہ ڈال کر وہ مڑا اور تیز تیز چلتا باہر نکل گیا۔

اس آدمی کو وہ سمجھانے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی اس ایک حرکت نے اسے جہان کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ جب جہان اس سے ملے گا تو وہ سب سے پہلے یہی بات کلیئر کرے گی۔

جہان؟ وہ ایک دم چونکی۔ یہ ویڈیو تو اس نے لاکر سے ایک ماہ قبل نکالی تھی' یہ ساری باتیں تو پرانی ہوگئیں۔ وہ ابھی کہاں تھا؟

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق محبتوں کے خوش نوا شاعر

سوہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کینوس کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سُر سنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیائیں تخلیق کی ہیں۔

افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پیشِ نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سوہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فاخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton,
Surry, KT67PW. U.K.
Phone: 0044-0208-397-0974

پنکی نے پزل باکس اسے تھماتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک وہ اسے کھول پائے گی تب تک وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔ نہیں وہ یوں ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ جہان کو ڈھونڈ لے گی۔ وہ اسے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

اس نے موبائل نکالا۔ صبح سے وہ سائلنٹ پہ تھا اور اماں کی کئی مسڈ کالز اور میسج آئے پڑے تھے۔ اس نے میسج کھولا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں ابا کی گاڑی اور ڈرائیور چاہیے تھے۔ اس لیے انہوں نے آفس فون کر کے دونوں کو منگوا لیا تھا۔ ایک اور پیغام میں انہوں نے بتایا کہ وہ ظفر کو اس کی گاڑی کے ساتھ بھیج رہی ہیں' وہ اسے گھر لے آئے گا۔

بس کار بھیج کر ظفر کو واپس جانے کا کہہ دیتیں' ضروری تھا کہ تایا ابا کا ملازم بھی ادھار لینے کا احسان لیا جائے؟ اسے خوامخواہ کوفت ہوئی۔ بہر حال اس نے سر جھٹک کر فون بک میں سے عائشے کے گھر کا نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ کوئی جواب نہیں۔ پھر اس نے حلیمہ آنٹی کا نمبر ملایا۔ وہ یقیناً "ان سے ہوٹل گرینڈ کا نمبر لے سکتی تھی' جہان وہیں ہوگا۔

"الو؟" وہ اداس' مگر باریک سی آواز' اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

"بہارے! میں حیا بول رہی ہوں۔"

"اوہ حیا۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟" وہ جیسے بہت اداس سی لگ رہی تھی۔

"میں گھر آگئی تھی مگر تم۔۔۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہو۔"

"سب چلے گئے ہیں' میں نہیں گئی' میں اکیلی رہ گئی ہوں۔" وہ جیسے آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "عائشے بھی نہیں ہے' آنے بھی نہیں ہے' سب چلے گئے۔"

"عب۔۔۔ عبدالرحمٰن؟ وہ کہاں ہے؟" اس کی آواز میں لرزش در آئی تھی۔

"وہ صبح آیا تھا۔ مجھے اتنا سارا ڈانٹ کر گیا ہے' اس نے کہا وہ جا رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ اب مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔"

"کدھر۔۔۔ کدھر گیا ہے وہ؟" ایک دم بہت سے آنسو اس کی پلکوں پہ آ رکے تھے۔

"مجھے نہیں پتا مگر۔۔۔" وہ جیسے ذرا ٹھہری۔ "اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں آنے سے کچھ دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ کدھر جائے گا۔ تمہیں پتا ہے حیا؟"

"نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔ "اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔" آنکھیں اس نے ہاتھ سے رگڑ کر صاف کیں۔ "مگر تم فکر مت کرو بہارے! میں اگلے ہفتے ترکی آؤں گی نا' مجھے اپنی کلیئرنس کروانی ہے' تب میں اور تم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔ ہم اسے ڈھونڈ لیں گے' تم میرے آنے تک وہاں ہوگی نا؟"

"مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔" وہ جیسے سارے زمانے سے خفا ہو رہی تھی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ کتنی ہی دیر وہ سر ڈیسک پہ رکھ کر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن صرف ایک بات پہ مرکوز تھا۔ جہان نے اسے جانے سے قبل نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے' پھر اس نے بہارے کو ایسا کیوں کہا؟ یہ ویڈیو تو پرانی تھی جبکہ بہارے نے جانے سے کچھ دن قبل کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ کب بتایا جہان نے اسے؟

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ وہ شاید اکیلی رہ گئی تھی۔ جب وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تو تایا فرقان بھی ساتھ ہی داخل ہوئے۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں؟" وہ ان کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئی تھی۔

"ہوں! کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔" وہ اسی سرد مہر لہجے میں بولے۔ تناؤ اور برف کی دیوار ابھی تک بیچ میں حائل تھی۔ اسے پھر سے اماں پہ غصہ آیا کہ کیا ضرورت تھی ظفر کو بلوانے کی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر چلا جاتا۔ وہ خود ڈرائیو کر کے آجاتی۔ ان کا احسان لینا ضروری تھا؟ اور جہان اس نے کب بتایا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟

گراؤنڈ فلور پر رکی تو اس نے پیچھے ہٹ کر تایا کو راستہ دیا' وہ نکل گئے تو وہ سست روی سے الجھی الجھی سی چلتی باہر آئی۔

جہان نے کب بتایا؟ جھولے پہ اس رات؟ یا اسپتال میں جب وہ دونوں ابا کے ساتھ تھے؟ یا۔۔۔

"بات سنو میری!" ولید پتا نہیں کہاں سے سامنے آیا تھا۔ حیا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوئی۔ لابی خالی تھی۔ سوائے شیشے کے دروازے کے ساتھ کھڑے گارڈ کے' جوان کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے؟"

"اگر تم نے سلیمان انکل سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا کروں گا۔" انگلی اٹھا کر چبا چبا کر بولتا وہ اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔ حیا نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"یہ دھمکیاں کسی اور کو دو۔ میں جا رہی ہوں گھر اور میں ابا کو سب صاف صاف بتا دوں گی۔ کر لو جو تم کو کرنا ہے!" اپنی ساری فرسٹریشن باہر نکال کر وہ اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ ولید کچھ کہے بنا تیز قدموں سے چلتا اس کے دائیں طرف سے گزر کر باہر نکل گیا۔

وہ گارڈ کو معمول کی ہدایات دینے کے بعد باہر کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ باہر آسمان نیلاہٹ بھری سیاہی سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی جہان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب بتایا تھا اسے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

وہ سیڑھیاں اتر کر اب ایک طرف بنے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی گاڑی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے اسے چند قدم اس لمبی' چوڑی سی روش پہ چل کر جانا تھا۔ وہ بہت غائب دماغی سے قدم اٹھا رہی تھی۔

اگر جہان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیا کو بتایا تھا تو اس نے بتایا ہوگا۔ وہ سیدھی طرح کوئی بھی بات نہیں کہتا تھا۔ اس کی ہر بات پہیلی ہوتی تھی۔ آخر کب بتایا اس نے؟ روش پہ چلتے ہوئے اس نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی۔

کہیں دور اسے کوئی پکار رہا تھا۔ اس کے نام کی پکار بار بار پڑ رہی تھی۔ وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ سن نہیں پائی۔ تیز روشنی سی اس کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ ساتھ میں ٹائرز کی آواز۔

ایک دم جیسے کسی خواب سے جاگ کر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ ولید کی گاڑی تھی اور وہ تیز رفتاری سے اسے روش پہ چلاتا آ رہا تھا اس کے اوپر چڑھانے کے لیے۔

"ولید رکو!" اس کے لبوں سے کراہ تک نہ نکل سکی۔ سانس رکا اور ساتھ میں پورا وجود شل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ تیز ہیڈ لائٹس اتنے قریب تھیں کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے صرف چہرے کے آگے دونوں ہاتھ کیے۔

دوسرے ہی لمحے بہت زور کی ٹکر نے اسے سڑک کے دوسری جانب لڑھکا دیا۔

گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

خواب خواہش اور زندگی

رابعہ رزاق

قیمت -/500 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رمشا خالد خان

حوا

اماں! بابا کا بہت خیال رکھیے گا۔ ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے سے منع کیا تھا مگر ان کی ضد سے آپ اچھی طرح واقف ہیں' میرے بے حد روکنے کے باوجود اکیلے پاکستان چلے آئے۔ دراصل آنا تو میں بھی ان کے ساتھ چاہتا تھا مگر۔"

ابھی وہ اپنے نہ آنے کا معقول جواز دینے ہی والا تھا کہ فراست علی خان نے جو لاؤڈ اسپیکر کا بٹن کھلا ہونے کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے مہران علی خان اور حوا بی بی کی ساری گفتگو سن رہے تھے' ہاتھ بڑھا کر کریڈل دبا دیا۔

حوا بہت انہماک سے بیٹے کی بات سن رہی تھی۔ اس طرح رابطہ منقطع کر دیے جانے پر چونکی۔ حیرت بس ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جھلملائی اگلے ہی پل ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں صبر و سکون اتر آیا تھا۔

"خان جی! آپ کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے میں لاتی ہوں۔" بغیر کوئی شکوہ کیے' اپنی ازلی نرم مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اٹھ گئی۔ فراست علی خان ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ انہیں تو ساری زندگی یہ حسرت ہی رہی تھی کہ وہ ان سے کوئی شکوہ کرتی۔ گریبان کے اوپری دو بٹن کھول کر دل کو مسلتے ہوئے وہ بے اختیار حوا کو ہی سوچنے لگے۔

"خان جی! آپ کی دوائی۔" حوا کے آواز دینے پر وہ چونکے۔

"تم ہی پلا دو۔" اسے اپنی گہری نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے فرمائش کی۔ اس کی سنگت میں ہمیشہ اک بے نام سا جذبہ ان کے دل میں ہمکتا تھا' جسے پہلے تو ناقابل توجہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ تھپک کر سلا دیتے تھے مگر آج نہ جانے کیوں وہ ایسا نہیں کر رہے تھے۔ شاید چند ماہ قبل ہونے والے ہارٹ اٹیک نے ان کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ انہیں مزاحمت نہ کرتا پا کر وہ جذبہ "فوراً" سے پیشتر جاگا اور پلک جھپکتے میں سارے لہو میں گردش کرتا ہوا آنکھوں میں یوں سمٹ آیا گویا صدیوں سے ان آنکھوں کا مکین ہو' ٹھیک اسی وقت باہر جاتی حوا نے اچانک پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کی نظر ٹکرائی اور خان جی کی آنکھوں میں مچلتے بے نام جذبے کو "محبت" کا عنوان مل گیا۔ وہی پاکیزہ اور سچی محبت جس کی تلاش میں وہ نصف صدی سے بھٹکتے پھر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

کچھ لوگ محبت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں' کچھ محبت پانے کے لیے' ان میں ایک تیسری قسم ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو محبت تلاش کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ فراست علی خان کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ "سچی محبت" کی تلاش میں انہوں نے روہی کے صحرا سے لے کر سوئٹزرلینڈ کی برف پوش وادیاں چھان ماری تھیں مگر نہ سلونی مٹیاریں ان

کے دل میں محبت کا جذبہ جگا سکیں اور نہ ہی سمندر سی نیلی آنکھوں والی حسیناؤں کے نینوں میں ڈوب سکے تھے۔ محبت کی تلاش میں بازار حسن کے چکر بھی بے سود ثابت ہوئے تھے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور کجرارے نینوں کے وار بھی ان کے قدموں کو زنجیر کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کیونکہ وہ سچی محبت کے متلاشی تھے۔ حسن پرست یا عیاش نہیں۔۔۔ وہ اسی تلاش میں سرگرداں تھے' جب پندرہ سالہ حوا جرگے کے فیصلے کے تحت ان کے نکاح میں دے دی گئی۔ ایک تو یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف تھی' دوسرا حوا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اس کی طرف مائل ہی نہیں ہوسکے، ویسے بھی وہ فطرتاً "سیاح تھے" محبت کی تلاش میں نگری نگری گھومنا ان کا مشغلہ و مقصد زیست ٹھہرا تھا۔ مہینوں بعد جب کبھی گھر لوٹتے تو جاگیر کا حساب کتاب سر اٹھا کر ارد گرد دیکھنے کی فرصت نہیں دیتا تھا۔ ادھر فارغ ہوئے ادھر نئے سفر کا آغاز۔۔۔

اور اب جب وہ اپنی تلاش میں ناکام ہو کر چونسٹھ سال کی عمر پوری کرکے "اپنی مٹی" میں دفن ہونے کی چاہ میں واپس لوٹے تھے تو پینسٹھویں سال کی پہلی صبح ہی انہیں حوا سے محبت ہوگئی تھی۔ وہی سچی محبت، جس کی تلاش میں وہ نصف صدی سے بھٹک رہے تھے۔

اس وقت ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی، جو لمبی مسافت اور برسوں کی ریاضت کے بعد عمر کی نقدی لٹا کر بھی منزل کے حصول میں ناکام ہو کر، امید کی ہر جوت بجھا کر مایوسی کا پیراہن اوڑھے شکستہ قدموں سے اپنے آشیانے کو لوٹے، جہاں سے اس نے پہلی اڑان بھری تھی تو اسی منزل کو بانہیں پھیلائے اپنا منتظر پائے۔

ایسے میں مسافر کے پاس صرف دو راستے ہوتے ہیں کہ یا تو غیر متوقع طور پر مل جانے والی منزل پر بیٹھ کر اپنی کوتاہ بینی کا غم منائے اور عمر کی نقدی ختم ہوجانے کا بین کرے یا پھر۔۔۔ سود و زیاں کے حساب کو پس پشت ڈال کر کسی فاتح کی سی شان سے آگے بڑھ کر منزل و مقصد پالے۔

بہت سوچ بچار کے بعد فراست علی خان نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور اطمینان سے آنکھیں موندلیں۔ یہ شاید فیصلے کی تاثیر تھی یا برسوں کی مسافت کی تھکن جو پاکستان آتے وقت وہ اپنے روم روم میں محسوس کررہے تھے، ایک دم یوں غائب ہوگئی جیسے سرے سے تھی ہی نہیں۔

حوا سوپ لے کر آئی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے، نیم دراز اسی کا انتظار کررہے تھے۔ وہ تپائی پر پیالہ رکھ کر مڑنے لگی، انہوں نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

تیرے بنا جو عمر بتائی، بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

اپنے جھریوں زدہ ہاتھ اس کے نازک شانوں پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ شعر پڑھا۔ حوا ان کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پایاں محبت دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ ماہ و سال کے انتظار کی تھکن آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔ گویا آج پچیس سال کی دن رات کی دعائیں قبولیت پاچکی تھیں۔ بہت نرمی سے اس کی پلکوں سے موتی چن کر وہ اپنی محبت کی شدتوں میں اسے بھگونے لگے۔۔۔ پھر محبت گواہ ہے۔ انہوں نے پینسٹھویں سال کا پہلا دن (عمر کا باقی حصہ) پوری سچائی سے حوا کے نام کرکے اگلی صبح کی پہلی اذان کے ساتھ ہی مطمئن ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلیں۔

ان کے قبیلے کا رواج تھا کہ پچاس سال سے کم عمر عورت خواہ کتنے ہی جوان بچوں کی ماں کیوں نہ ہوتی، عدت کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی دیور سے کردیا جاتا تھا۔ حوا فقط چالیس سال کی تھی، مگر اس نے عقد ثانی سے انکار کردیا۔ بیٹے مہران کے منانے پر بھی نہیں مانی۔

اس نے اپنی آدھی زندگی خان جی کی محبت کی چاہ میں کاٹی تھی اور باقی زندگی محبت کے اس ایک دن کی یادوں کو سینے سے لگائے خان جی کے نام پر خوشی خوشی بتادی۔

آخر کو حوا تھی نا۔۔۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ثوبیہ جبیں گل

آشنا ہیں تیرے قدموں سے

"تیاری بڑی خاص لگ رہی ہے۔ کہیں جانے کا ارادہ ہے یا ہو آئی ہو۔"

عائشہ میگزین کی ورق گردانی کرتی ہوئی شفق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جس کی رنگت معمول سے کہیں زیادہ چمک رہی تھی۔ وہ میگزین بند کر کے مسکرائی۔

"بس یوں ہی۔ آج اس نے بلایا ہے۔"

عائشہ نے بے ساختہ لمبی سانس بھری اور ہاتھ میں اٹھائے کپڑوں کو واپس فرش پہ ڈال کے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"شفق۔۔ ایسا کب تک چلے گا؟"

"کیا مطلب۔۔ کیسا؟" وہ سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو شفق۔۔! تم دونوں کی دوستی کو پانچ سال ہونے لگے ہیں۔ اس کا تم سے شادی کرنے کا ارادہ بھی ہے یا محض دل لگی۔"

"وہ ایسا نہیں ہے" اس کی بات کاٹ کر وہ تیزی سے بولی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے عائشہ کی بات بہت بری لگی تھی۔

"تم میری اکلوتی دوست ہو شفق! اور مجھے بہنوں

مکمل ناول

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بڑھ کر عزیز ہو۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی مصیبت یا پریشانی کا شکار ہو۔۔۔ بہتر ہوگا تم اپنی امی سے جلد از جلد اس بارے میں بات کرو۔۔۔ تاکہ اگر انہوں نے تمہارے لیے کہیں اور سوچا بھی ہوا ہے تو اسے ختم کریں۔"

وہ سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"یہی تو مسئلہ ہے عاشی!" وہ اسے پیار سے عاشی کہتی تھی۔

"امی ابو نے اپنی اولاد میں اتنا فاصلہ رکھا ہوا ہے۔۔۔ اور اسے پاٹنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔" انگلیاں چٹخاتے ہوئے وہ خاصی فکرمندی سے بولی۔

"او کے۔۔۔ ریلیکس۔۔۔" عائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مگر جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ تمہارا اٹھایا ہوا ایک قدم تمہارے مستقبل کے لیے خوش آئند بھی ہو سکتا ہے اور خطرناک بھی۔"

شفق نے پر تفکر نظروں سے عائشہ کو دیکھا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جس راہ پر وہ قدم رکھ چکی تھی۔ اس میں واپس پلٹنا دشوار تھا۔

☼ ☼ ☼

تعلیمی مدارج طے کرتے یہ اس کا چھٹا سال تھا۔ وہ ٹھیک سے شعور کی عمر میں بھی نہیں پہنچی تھی جب خلیل رضا سے اس کی دوستی ہوئی۔

خلیل رضا شفق کا پڑوسی نہیں تھا۔ لیکن اس کی رہائش اتنی دور بھی نہیں تھی۔ شفق سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ نادان بھی تھی۔

اسکول سے گھر گھر سے اسکول یہی اس کی زندگی کا کل محور تھا۔ دوسری طرف خلیل رضا تھا۔ اس سے پانچ سال بڑا۔۔۔ ایف ایس سی کا طالب علم آگے پڑھنے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے اس نے بارہا خلیل رضا کو دیکھا تھا۔ کسرتی جسم کے ساتھ اپنے مسلز کی نمائش کرتے ہوئے کچی پکی گلیوں میں آگے پیچھے دائیں بائیں۔ ان جگہوں کو جاگنگ ٹریک سمجھتے ہوئے اپنے تئیں وہ جاگنگ ہی کرنے آتا تھا۔

راستے میں ہر کسی پہ تبصرہ کرتی اس کی ہم عمر سہیلیاں۔۔۔ وہ بس ان کے ساتھ گھسٹتی تھی۔ اس کی سوچوں میں بس اس کی ذاتی زندگی کی گنجائش تھی۔

اس کا بیشتر وقت غائب دماغی کی سی کیفیت میں گزرتا تھا۔ اس کی وجہ اس کے گھر کا ماحول تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے ہی دیکھا تھا۔ کبھی عید تہوار پہ بھی وہ ایک دوسرے سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ خود وہ متضاد سی کیفیت میں ہمہ وقت چکراتی رہتی۔ کوئی کچھ پوچھ بھی لیتا تو اس کا جواب "ہاں یا نہ" سے آگے نہیں ہوتا تھا۔

ایسے میں عائشہ ایسی لڑکی تھی جس نے پہلی دفعہ اس ساکت ندی میں ہلچل پیدا کی۔ اس کے سامنے والے گھر میں یہ لوگ کرائے دار کے طور پر آئے تھے۔ دوستی کرنے میں پہل بھی عائشہ ہی کی تھی۔ عائشہ کی صورت میں اسے دوست مل گیا تھا۔ عائشہ ہی تھی جو ہر مشکل میں اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیتی تھی۔

گرمیوں سردیوں کی تعطیلات اس کی ہمیشہ بے کیف گزرتیں۔۔۔ اسکول بند ہونے سے لے کر اسکول کھلنے تک۔۔۔ اس مسکن کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ زندگی نہ تھا۔ صبح سے شام۔۔۔ پھر رات۔۔۔ چڑھتا سورج۔۔۔ اترتا سورج۔۔۔ یہ شب و روز ہوتے۔۔۔ اس کی کچی سی عمر سوچنے میں ہی گزر جاتی۔

اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہونے کے ناتے اوپر کی تمام ذمہ داریاں اسی پہ عائد ہوتی تھیں۔ اس کے بعد عمر دس سال کا۔۔۔ پھر مہربانو اور سارا جڑواں بہنیں۔ مہو اور سارا تیسری جماعت میں جبکہ عمر چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

مڈل اسٹیج پہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بجائے گرمیوں کی اضافی کلاسز کا شیڈول نیا نیا ہی تھا۔ اس کے لیے یہ سمر کلاسز نعمت مترقبہ سے کم تھیں۔ بے شک اب اسے بہت پہلے اٹھنا پڑتا۔ تمام افراد خانہ کے لیے صبح کا ناشتا بنا کے وہ اسکول جانے کے لیے وقت نکال پاتی۔

عائشہ کچھ ہی دن بعد ساہیوال اپنی نانی کے گھر چلی گئی تھی۔ چلچلاتی گرمیوں کی ایک دوپہر میں وہ باقی لڑکیوں سے الگ ہو کر سب سے چھوٹے راستے کا انتخاب کرتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ یہاں سے اس کا گھر نزدیک پڑتا تھا۔ چلتے چلتے اس نے امرود کے پیڑ پہ نگاہ دوڑائی جو راستے میں آتا تھا۔ درخت پہ پھل ابھی کافی کچا تھا۔۔۔ مایوسی سے اس کے قدم ست پڑے۔ جب ہی بے دھیانی میں اس کا پاؤں کسی چیز سے اٹکا۔ اسے زور کا دھکا لگا اور وہ منہ کے بل آگے کو لڑھک گئی۔

"آہ۔۔۔" ایک کراہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی مگر اس وقت دو مضبوط آہنی ہاتھوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی کہنیاں چھل گئی تھیں اور ان میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں۔۔۔ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟"

بھاری مردانہ آواز پہ اس نے تکلیف دہ تاثرات کے ساتھ ڈبڈباتی نظروں سے مقابل کو دیکھا۔ وہ پشت اس کی طرف کر کے اپنی سائیکل اٹھا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہینڈل پکڑے وہ اس کی طرف آیا۔ شفق گھبرا کے دور ہٹی۔۔۔ وہ قاسم انکل کا بیٹا خلیل رضا تھا۔

"مم۔۔۔ میں اپنے گھر جا رہی تھی۔" اس نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔

خلیل نے ٹھٹک کے اس گڑیا سی لڑکی کو دیکھا۔ سفید اسکارف سے احاطہ شدہ بیضوی چہرے پہ ایک شرارتی سی لٹ پھر بھی بالوں سے نکل کر اس کے چہرے سے آلپٹی تھی۔ سرخ ہوتی ہرنی سی خوابیدہ آنکھیں اور گلابی نیم وا لرزتے ہونٹوں کے ساتھ جھکتے ہوئے وہ اپنا بیگ جھاڑ رہی تھی جو مٹی میں گرنے کی وجہ سے گرد سے اٹ گیا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے آپ جناب کا تکلف نہیں کیا تھا۔

"شفق۔۔۔" وہ اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے وہاں سے جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"بڑا پیارا نام ہے۔" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں بولا تھا۔ شفق اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں خلیل ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا۔

"آؤ! تمہیں چھوڑ آؤں۔" اس نے اپنی سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔ شفق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔ "میں چلی جاؤں گی۔"

"دوبارہ ملوگی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے مڑی اور تیزی سے اپنی گلی کی طرف مڑ گئی۔ خلیل کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

یہ اس کا خلیل رضا سے تعارف کا پہلا دن تھا۔۔۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے کچے ذہن میں خلیل نام کے لڑکے کی کہانی کا آغاز ہو گیا تھا اور اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ ایسا راستہ چن چکی تھی جس کی منزل کا علم اسے خود بھی نہیں تھا۔

جب گھروں میں توجہ اور پیار کی کمی ہو جائے وہاں عموماً "لڑکیاں باہر کے چور راستے چن لیتی ہیں۔

خلیل رضا سے دوستی اس کے لیے ان ہی چور راستوں میں سے ایک تھی۔

☼ ☼ ☼

"آرام سے بیٹھو' گھبرا کیوں رہی ہو۔" خلیل نے محظوظ ہوتے ہوئے اس انار سی کلی کو دیکھا جو ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"اب میں جاؤں؟" وہ تھوڑا سا سرک کر کھڑی ہو گئی۔ خلیل نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اسکول یونیفارم میں وہ معصوم سی ہی لگتی تھی۔

"کہاں۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ اس کا ہاتھ زور سے جھٹکنے پہ وہ بری طرح اس سے ٹکرائی تھی۔ خلیل کو تو کوئی فرق نہیں پڑا' لیکن وہ خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

اسکول سے نکلتے ہی اس کی نگاہ بائیک پہ بیٹھے خلیل پہ پڑی' جو اس کے دیکھنے پہ اشارے سے اسے بلانے لگا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں آجائے گا۔ اپنی ہم جماعتوں سے نظر بچا کے وہ چپکے سے اس کی طرف آگئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"تمہیں دیکھنے!" کمال اطمینان سے کہہ کر اب وہ اسے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ تھوڑا جھجکی' لیکن پھر آرام سے بائیک پہ چڑھ گئی۔

"آپ کہاں لے جائیں گے۔" بائیک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل ۔۔۔ میں تھوڑا تھوڑا ڈر بھی تھا۔

"دور۔۔۔ بہت دور۔" وہ شگفتہ سے لہجے میں کہہ کر خود ہی ہنسا۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ ایک قریبی پارک میں موجود تھے۔ وہ پارک کی اختتامی حدود میں کونے میں موجود ایک ٹوٹے ہوئے سنگی بینچ پر بیٹھ گئے۔ شفق کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آج سے پہلے وہ کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہی تھی۔ پریشانی سے اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چلا تھا۔ وہ گھبرا کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

خلیل نے اسے کندھے پہ بیگ ڈال کر اسکارف اوڑھتے دیکھا اور مڑتی ہوئی شفق کا ہاتھ پھر سے تھام لیا۔ وہ مڑ کر بدحواسی سے اس کے چوڑے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

"ڈر کیوں رہی ہو۔۔۔ میں ہوں نا۔ چھوڑ آؤں گا۔"

"لیکن۔۔۔" کچھ دیر سوچ کی پرچھائیں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ پھر پریشان تاثرات سمٹ گئے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرائی۔ خلیل کا دل سمٹ کر پہلو سے آلگا۔ اسی مسکراہٹ کا تو اسیر ہوا تھا وہ۔

"تم نے بتایا نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"کیا؟" ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ یوں ہی اسکارف کے سروں کو کھول اور باندھ رہی تھی۔

"میں کیسا لگا؟" یہ کیسا سوال تھا۔ اس نے ایک پل سوچا۔

"پتا نہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"اب کب ملوگی؟" شفق خاموش رہی۔

"شفق۔۔۔!" وہ منتظر تھا۔

"میں بغیر کسی وجہ کے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ مجھے اجازت نہیں ہے۔" اس کا انداز مجرمانہ سا تھا۔

"اچھا چلو۔۔۔ اسی وقت۔۔۔ ٹھیک ہے' روزانہ۔۔۔!" اس نے پوچھا۔

"نہیں روزانہ نہیں۔ میری دوستوں کو شک ہو سکتا ہے۔۔۔ میں ان کے ساتھ جاتی ہوں۔ وہ میرے گھر شکایت لگا سکتی ہیں۔" اب وہ اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے لیے خلیل سے یوں چوری چھپے ملنا پریشانی کا باعث تھا۔

☼ ☼ ☼

"شفق۔۔۔! یہ کیا کیا یار تم نے؟" اس کی بات سن کر عائشہ گویا کرنٹ کھا کر دور ہٹی۔

"اس میں برائی کیا ہے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"ایک ہفتے سے روزانہ اس خلیل سے ملتی رہی ہو' دوستی بھی کرلی اور مجھے اب بتا رہی ہو؟"

اسے حد درجہ افسوس ہوا تھا۔ اس کی بہت اچھی دوست نے آج پہلی مرتبہ اسے اتنے دن ایک بات سے بے خبر رکھا۔

"کیوں۔۔۔؟ تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ آج اسے عائشہ کا خود کے لیے اتنا غصہ کرنا بالکل بھی نہیں بھایا تھا۔

"تم جانتی ہو۔۔۔ کتنا غلط کیا تم نے۔۔۔ اپنے ماں' باپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ یوں مردوں سے دوستی کرنا' گھومنا پھرنا یہ سب۔۔۔ شفق! تم ابھی چھوٹی ہو۔۔۔ یہ عمر نہیں ہے ایسے کاموں کی۔" عائشہ کے لہجے میں اس کے لیے حد درجہ پریشانی جھلک رہی تھی۔

"اچھا تم کتنی بڑی ہو گئی ہو۔۔۔ جو بی اماں بن کے مجھے نصیحتیں جھاڑ رہی ہو۔" شفق کو غصہ آگیا۔

"مجھے زندگی میں سوائے محرومیوں کے اور ملا ہی کیا ہے۔ ماں' باپ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ بہن' بھائی خود ابھی چھوٹے ہیں۔ میرے رشتہ داروں کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں اور اب اگر کہیں سے تھوڑی سی خوشی کا آسرا مل گیا ہے تو تم کیوں چاہتی ہو کہ وہ بھی مجھ سے چھن جائے۔" اس کے لہجے میں ٹوٹتے ارمانوں کی کرچیاں تھیں۔ وہ اب دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے رونے لگی تھی۔

"اتنے سے دنوں میں وہ تمہاری خوشی بھی ہو گیا شفق۔۔۔!" وہ ششدر رہی۔

شفق نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں چھائی حیرت اور تشویش کو دیکھا اور لب بھینچ کر چہرہ موڑ لیا۔۔۔ عائشہ کچھ پل اسے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے' جو تمہاری خوشی و مرضی۔" کافی دیر بعد وہ بولی بھی تو اس کی توقع کے برخلاف۔ اس نے جھٹکے سے اپنا چہرہ اس کی طرف موڑا۔

"عائشی!" اس کے چہرے پہ بے پایاں خوشی کا احساس امڈ آیا تھا۔ گویا ایک عائشہ کے مان جانے سے اس کے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں۔

"لیکن۔۔۔ دیکھو پلیز۔۔۔ اپنی حد کا خیال رکھنا۔۔۔ یہ دوستی صرف دوستی تک محدود رہنی چاہیے۔۔۔ جو کہ مجھے معلوم ہے۔۔۔ نہیں رہے گی۔۔۔ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔" وہ پر یقین ہو کر بولی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتے؟" وہ استفسار کرنے لگی۔

"بس نہیں ہو سکتے۔ یہ تم خود جان جاؤ گی۔" عائشہ گم صم سی تھی۔

خلیل رضا ایک سرکاری اسٹینو گرافر باپ کا بیٹا تھا۔ وہ تین بہن' بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ عقیل اس سے بڑا جبکہ حمیرا سب سے چھوٹی تھی۔ عقیل شادی شدہ تھا اور حمیرا ایک عام سی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ مڈل کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ چکی تھی اور اب پارلر کا کورس کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں پڑھنا وقت کا ضیاع تھا۔ خود خلیل بھی پڑھائی میں بالکل کورا تھا۔ رو پیٹ کر وہ ایف ایس سی تک پہنچا تھا۔ اس کا واحد مشغلہ گھومنا پھرنا تھا۔ آگے پڑھنے سے وہ بھی انکار کر چکا تھا۔

قاسم رضا گاؤں میں موجود اپنی آبائی زمین بیچ کر شہر آبسے تھے۔ یہاں ان کا ذاتی گھر تھا۔ قاسم صاحب نے بقیہ رقم سے شہر میں ایک کپڑوں کی دکان ڈال لی تھی۔ شام میں کاروبار اچھا چلتا تھا۔ خلیل اب دکان پر بیٹھتا تھا۔ یوں اس کے پاس وقت کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس کا جب دل کرتا اپنی دکان کھول لیتا اور جب اکتا جاتا تو سب بند کر کے ادھر ادھر نکل جاتا۔

شفق سے اس کی دوستی محض اتفاق تھا۔ لڑکیاں کبھی اس کی فرینڈ شپ میں شامل نہیں رہی تھیں۔ بس وہ پہلی ہی تھی جو نہ جانے کیوں دل و دماغ کو بھا گئی تھی۔ دونوں کی دوستی کو سال سے اوپر ہو گیا تھا۔

"میں کل نہیں آسکوں گی خلیل!" برگد کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

درخت پہ لٹکتی اس کی داڑھی نما جڑوں کو یوں ہی بے خیالی میں نوچتے ہوئے وہ اداس لہجے میں بولی۔

"کیوں؟" وہ پریشان ہو کر اس کی طرف مڑا۔۔۔

"خلیل۔۔۔ روزانہ ملنا اب کہاں ممکن رہا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، لیکن اب۔۔۔ نہ اب میں کوئی بچی رہی ہوں اور نہ اب وہ بے فکری کا دور۔۔۔ امی تو اب کڑی جرح کرنے لگی ہیں۔۔۔ میں کیا کروں۔"

وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔۔۔ خلیل نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ چہرے پہ اداسی رقصاں تھی۔۔۔ کچھ مسکرا کر وہ اس کے قریب آیا۔

"ابھی تو تم پہ اصل روپ آیا۔۔۔ میرا پھول ہو تم، اپنے بھنورے سے اتنی جلدی جدا ہو جاؤ گی۔۔۔ پگلی!" وہ اس کی شرارتی سی لٹ کو شرارت سے کھینچتے ہوئے بولا۔ شفق اس کی وارفتگی سے گھبرا کر اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"پاگل ہو تم۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن تمہارے پیار میں۔" وہ برجستگی سے بولا۔ "ویسے گھبراتے ہوئے تم بالکل میری دلہن لگتی ہو۔ سنو کب بنو گی میری دلہن؟"

شفق حیا سے سرخ پڑ گئی۔ اس کے گال تمتما اٹھے اور دل کی دھڑکنوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔ خلیل نے پہلی مرتبہ یوں کھلم کھلا اظہار کیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آیا۔۔۔

"میں محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔ ایک دن بھی تم نہ ملو تو دل یوں اداس ہو جاتا ہے جیسے پت جھڑ میں درخت۔" عجیب سی تشبیہ دے کر اب وہ اسے بے بس سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم کیا جانو خلیل۔۔۔ میرا تو پل پل تمہیں سوچتے گزرتا ہے اور تم آج اتنے عرصے بعد یہ اقرار کر رہے ہو۔" وہ کہہ کے رہی تھی۔

"اب تو کر دیا نا!" وہ دونوں ہی ہنس دیے۔ ان کی ہنسی میں خوشی کی کھنک محسوس کی جا سکتی تھی۔

اب وہ دونوں کچھ محتاط ہو گئے تھے۔ دونوں کے گھر والے ان کے لیے ظالم سماج سے کم تو نہ تھے۔ شفق کے ویسے بھی میٹرک کے امتحانات شروع ہو گئے تھے اور وہ مکمل یکسوئی چاہتی تھی۔ اگرچہ خلیل کے اقرار کے بعد اس کی سوچوں کی رو عجب انداز میں بھٹکنے لگی تھی۔ لیکن اب امتحانوں کے اختتام تک اس نے نہ ملنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اس کی پھوپھو بمعہ اہل و عیال کے ان کے گھر تشریف لا رہی تھیں۔ اس نے دوپٹے میں چھپا گفٹ الماری میں لا کے چھپایا۔۔۔ اور بے دلی سے کچن میں آ گئی۔

رشتہ دار بہت کم ہی ان کے ہاں رخ کرتے تھے اور آج خاص طور پر ان لوگوں کی تشریف آوری اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

ایک تو بدن جھلساتی گرمی میں کچن میں حاضری دینا ایک آزمائش ہی تھی۔۔۔ لیکن وہ کیا کرتی۔۔۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔۔۔ گھر کی سب سے بڑی بیٹی جو ٹھہری۔۔۔ اس نے تلخی سے سوچا۔۔۔ اس کی تمام سوچیں بدگمانی کی حدوں سے جا ملتی تھیں۔۔۔ تمام ذمہ داریاں بچپن ہی سے اس کے ناتواں کاندھوں پہ آ ٹھہری تھیں۔ مہو اب برتن دھو لیتی، جھاڑو لگا لیتی تھی۔۔۔ اس سے زیادہ کرنا اس سے زیادتی تھی شاید کہ یہ تو ابھی اس کے کھیلنے کے دن تھے۔ امی کا حکم تھا یہ۔

"اس سارے قصے میں۔۔۔ میرا کردار کہاں ہے امی؟"

بے آواز اس کے لبوں سے شکوہ پھسلا۔ "میں نے تو اس سے بھی چھوٹی عمر میں گھرداری سنبھال لی۔۔۔ گھر میں چیخ چیخ کا ماحول، ہر وقت بے سکونی کا رونا، ابو کی چیخم دھاڑ، بہن، بھائیوں کی الگ تکرار اور ایک میں بے وقعت، بے مول، جانے کیوں خوشیاں میرے نصیب میں نہیں۔"

پھوپھو کی آمد پر اس نے سرخ رنگ کا جوڑا زیب تن کیا تھا۔۔۔ یہ امی کی ہدایت تھی۔۔۔ اسے اچنبھا تو ہوا، لیکن تھوڑی دیر آئینے کے پاس کھڑی ہوئی تو خود ہی بھول گئی۔

خلیل کا پسندیدہ رنگ تھا۔ وہ اسے اگر اس وقت دیکھ لیتا تو پاگل ہو جاتا شاید۔

شانوں سے پھسلتے، کمر تک آتے اس کے ریشمی بال، براؤن آنکھیں، نیم وا ہونٹ، نچلے ہونٹ پہ ہلکا سا بھنور تھا۔ جو ہنستے ہوئے ہموار ہو جاتا تھا۔ ہاتھوں میں حنا کا سرخ رنگ۔۔۔ وہ شفق تھی۔ اپنے نام کی طرح۔۔۔ اسم بامسمیٰ۔۔۔ کیا تھا اس میں جو خلیل کو پسند نہ تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرائے گئی۔

جہاں زیب کو پھوپھو کے ساتھ آتا دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اچھا تو یہ وجہ تھی امی کی ہدایت کی۔ اسے کیا معلوم تھا پھوپھو اپنے سپوت اول کے ساتھ تشریف لانے والی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ اکیلی ہی آتی تھیں۔ آج کیا کوئی خاص مقصد تھا۔ اس کا دل برا ہوا۔ "کیا ضرورت تھی اتنا تیار ہونے کی؟" وہ خود سے الجھی۔

فریدہ پھوپھو اب اسے ساتھ لگا کے پیار کر رہی تھیں۔ لیکن ان کے انداز میں وہ والہانہ پن مفقود تھا جو رشتہ دار مہمانوں میں ہونا چاہیے۔۔۔ بس رسمی سا پیار کر کے وہ تو نشست سنبھال کے بیٹھ گئیں۔۔۔ نہ یہاں خاص استقبال تھا، نہ وہاں کوئی گرمجوشی۔۔۔ کبھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ امی اور پھوپھو میں ایک سرد جنگ سی کیوں رہتی ہے۔ اس کی ایک بظاہر وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی نند اور بھاوجیں تھیں۔ یعنی وٹہ سٹہ تھا۔۔۔ بیک وقت وہ پھوپھو اور ممانی کے عہدے پہ فائز تھیں۔

وہ سر جھٹک کے کچن میں چلی آئی۔ اس نے جہاں زیب کو جان کر نظر انداز کر دیا۔ جو پرشوق نظروں سے اسے مسلسل اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ نہ سلام، نہ دعا۔۔۔ اسے مقابل کے ردعمل کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ تو خود اپنی تیاری پہ جھنجلا رہی تھی۔

ایک رات وہ رہے۔۔۔ اگلی صبح روانہ ہو گئے۔ لیکن شفق نے دوبارہ نظر آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ جہاں زیب مایوسی سے واپس پلٹ گیا تو اس نے سکھ کا سانس لے کر شکر ادا کیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کمرے سے جھانک کر دیکھا۔۔۔ عاشی کی امی آئی تھیں۔۔۔ اور اس کی امی آداب میزبانی نبھا رہی تھیں۔ وہ بھی سلام کرنے کی غرض سے باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم آنٹی!" جھٹ سلام جھاڑا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! یہ لو تمہارا دوپٹا۔۔۔! تم نے رنگوانے کو دیا تھا نا۔" انہوں نے خاکی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے بلا تکلف تھام لیا۔

"رنگوا دیا عاشی نے۔۔۔ شکریہ آنٹی۔" وہ ممنونیت سے بولی۔

"ارے کوئی بات نہیں بیٹا! اچھا ہمارے گھر میلاد ہے کل، ضرور آئیے گا آپ لوگ۔" وہ میلاد کی دعوت دینے آئی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ کس سلسلے میں کروا رہی ہیں آپ۔" وہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کافی دن ہو گئے تھے خلیل سے ملے ہوئے۔ اس نے بھی تو خبر نہیں لی تھی۔

خود فراموشی کے عالم میں وہ اس کے تصور میں کھونے لگی۔ آج آخری پیپر بھی ختم ہوا۔۔۔ لیکن خلیل نے کوئی اشارہ، کوئی پیغام نہیں دیا۔ وہ اداس ہوئی۔

"ارے۔۔۔ ہاں۔۔۔!" وہ چونکی۔۔۔ اس نے دوپٹا جھٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ ایک سرے پہ بندھی گرہ دیکھ کے اس کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ در آئی اور عاشی پہ ڈھیروں پیار آ گیا۔

"آج پارک میں آ جاؤ۔"

ہمیشہ کی طرح اس ایک جملے نے ایک میٹھی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھیر دی۔ سب کام چھوڑ کر وہ شام کے لیے کپڑے منتخب کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"فریدہ نے جہاں زیب کا رشتہ دیا ہے اپنی شفق کے لیے! آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔" برجیس

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیگم نے بتایا۔

''ہوں۔۔۔ دیکھ لو!'' وہ بے توجہی سے گویا ہوئے۔ برجیس بیگم کو مزید زبان ملی۔ پرجوشی سے گویا ہوئیں۔

''عمران بھائی کو تو ویسے بھی شفق سے بہت پیار ہے۔ ان کی تو دلی خواہش ہے شفو کو بہو بنانے کی۔ دونوں کی جوڑی بھی تو خوب جچتی ہے نا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں دیواروں کو نہیں۔'' وہ خود ہی بولے جا رہی تھیں۔ اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو انہیں ٹوک بیٹھیں۔

''کیا کہوں۔ کیا بولوں میں ہاں۔۔۔ ہمیشہ تمہارے بھائی کی مرضی ہی تو چلی ہے آج تک۔۔۔ ہم تو جیسے ان کے اشاروں پہ ناچنے کو پیدا ہوئے ہیں۔''

وہ کاٹ کھانے کو دوڑے تھے۔ برجیس چپ ہو گئیں اور شفق خاموشی سے پلٹ گئی۔ دل گرفتہ سی اپنے بستر پہ گری۔ وہ کچھ دیر ٹھنڈی ہوا کھانے باہر نکلی تھی۔ لیکن امی، ابو کی باتیں سن کر تو اندر کی گھٹن مزید بڑھ گئی تھی۔

یہ کیا ہونے لگا ہے سب، کیا وہ نازک گھڑیاں آن پہنچی تھیں، جو ہر داستان کا مرکزی حصہ ہوا کرتی ہیں۔ خلیل کی منگنی اس کی چچازاد کزن اقرا سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ شفق کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ امتحانوں کے بعد اس کی چھٹیاں تھیں جب ہی پھپھو شگن کے لیے آنا چاہ رہی تھیں یہ بھی اسے امی نے ہی بتایا تھا۔ اب تو وہ ہر ملاقات میں خلیل کے سر ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو راضی کرے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت کہاں تھی، وہ ان سے اس سلسلے میں کچھ بھی کہہ پاتا۔ وہ سب اس سے خار کھاتے تھے۔ اس کی بات کو گھر میں چنداں اہمیت نہ دی جاتی تھی، کجا کہ وہ اپنی پسند بتا کر ان کے غصے کو ہوا دیتا۔

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہمدرد و ہم نوا تھے کہ ان کا ہر مسئلہ ایک سا ہوتا تھا۔

ایک ہفتے بعد منگنی رکھی گئی۔ اور وہ آج خلیل سے ملنے بوڑھے برگد تلے کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے شکستہ پا چلتا ہوا اپنی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔

''خلیل تم آخر کیا کر رہے ہو؟ میری منگنی ہو رہی ہے۔'' اس کے قریب آتے ہی وہ اسے جھنجھوڑ کر بے تابی سے بولی تھی۔

''ہاں تو کر لو۔'' وہ بے تاثر، سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔ شفق کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی، وہ بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''خلیل یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔ آنسوؤں کا گولا حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

''اب میں کیا کروں شفو۔۔۔ منگنی ہی ہو رہی ہے شادی تو نہیں نا۔۔۔ میں نے بھی کر لی تم بھی کر لو۔۔۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

اس کے لیے یہ سب کچھ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ایک وہی تھی جس کی جان پہ بن رہی تھی۔ اس نے بہت دفعہ ہمت کی کہ امی کو سب کچھ بتا دے لیکن ان کے حد کردہ فاصلے اور گریز کبھی اسے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے نہیں دیتے تھے۔ وہ اندر اندر ہی گھل رہی تھی۔

تب ہی لاہور سے رہائی کا سندیسہ آ گیا۔ منگنی فی الحال ملتوی کر دی گئی۔ وجہ جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ بے ساختہ سکون کا سانس خارج کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اس کا عارضی سکون بھی غارت ہو گیا۔ جہانزیب نکاح پہ زور دے رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ رسمی رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ دن گزر رہے تھے اور اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

دروازے پہ دستک ہو رہی تھی۔ وہ آلکسی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔ عاشی کا چھوٹا بھائی حمزہ کھڑا تھا۔ وہ اسے ایک چٹ دے کر بھاگ گیا۔ خلیل نے اسے بلایا تھا۔

گھر کی اسے کبھی پرواہ نہیں رہی تھی، سو ابھی بھی بنا بتائے نکل پڑی تھی۔ خلیل جلے پیر کی بلی بنا یہاں سے وہاں چکر لگا رہا تھا۔ آہٹ پہ لپک کے اس کی سمت آیا۔ پتا نہیں وہ کب سے منتظر تھا، وہ مرکزی گیٹ کے بجائے راہداری کی طرف سے آئی تھی۔ کیونکہ یہاں سے لوگوں کا گزر کم ہوتا تھا، دوسرے راستے سے تو کبھی

کسی کو بھی شک یا بھنک پڑ سکتی تھی۔

''کتنی دیر لگا دی تم نے شفو۔۔۔!'' وہ جھنجلا کر بولا تھا۔

''عائشہ بتا رہی تھی، تمہارے گھر والے تمہارا نکاح کر رہے ہیں؟'' وہ مطلب کی بات پہ آیا۔

''ہاں۔۔۔!'' اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکایا۔

''اور۔۔۔ تم نے زحمت بھی نہ کی مجھے بتانے کی۔ آنا گئی ہو اتنی جلدی۔۔۔ بس۔۔۔!''

اسے منہ کھولتا دیکھ کر وہ وہیں اسے روک کر بولا۔

''یہ یاد رکھنا شفق! تم میرے علاوہ کسی اور کی ہو سکتی ہو اور نہ میں ہونے دوں گا۔ سمجھیں تم۔'' وہ کچھ غصے سے اٹل لہجے میں بولا۔

''کب نہیں بتایا میں نے۔'' وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ''مجھے الزام دیتے ہو۔ تمہیں بتا دیتی تو کیا کر لیتا تھا تم نے۔ آتا ہی کیا ہے تمہیں صرف بڑھکیاں مارنے کے۔''

وہ پھٹ پڑی۔ کافی دنوں کا غبار آج نکل گیا۔ خلیل نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے خود سے قریب کیا۔

''چیلنج کر رہی ہو۔۔۔!'' لہجے کی گمبھیرتا اور چہرے پہ پڑنے والی اس کی گرم سانسیں اسے نظریں چرانے پہ مجبور کر گئیں۔

''اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ شفق بھی کٹھ پتلی کی مانند اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔

''بیٹھو۔''

اس نے بائیک اسٹارٹ کی۔ وہ چپ چاپ اس کے احکام کی تعمیل کیے گئی۔ تمام راستہ وہ خاموش رہے یہ ایک خستہ حال مکاں تھا جہاں اس نے بائیک لا کے روکی تھی۔

''یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس نے الجھن بھرے انداز میں پہلی بار زبان کھولی۔

''کچھ خاص نہیں۔۔۔'' اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔

''خلیل! تم کیا کر رہے ہو۔۔۔'' اب اس پر گھبراہٹ طاری ہو چکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

''پتا چل جائے گا۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔ شفق نے ایک نظر اسے دیکھا پھر۔۔۔ سرسراتے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں تم پہ بے پناہ اعتبار کرتی ہوں خلیل!''

''تمہارا اعتبار بے کار نہیں ہے۔'' وہ اعتماد سے بولا تھا۔

''تو پھر۔۔۔!''

''تو پھر یہ کہ مجھ سے شادی کرو گی؟'' اس نے اچانک ہی حملہ کر دیا۔ شفق بوکھلا کر رہ گئی۔

''تت۔۔۔ تم یہ پوچھنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو۔ یہ تو تم وہاں بھی پوچھ سکتے تھے۔''

''تو کیا تم انکار کر دیتیں۔''

وہ لاجواب ہو گئی۔ خلیل کو کوئی پکار رہا تھا۔ تب اس نے ہوش میں آ کے دیکھا۔ وہاں کچھ چہل پہل تھی۔ کسی چیز کا انتظام ہو رہا تھا۔ یا شاید خلیل نے کروایا ہو۔ وہ غائب دماغی سے سوچنے لگی۔ وہ اسے لیے اندر آ گیا تھا۔ اب وہ اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ کچھ سمجھ نہ پاتی۔

''خلیل! یہ کیا طریقہ ہے۔'' وہ اس کا بازو دبوچے گھبراہٹ میں بولی۔

''اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ شفو۔۔۔ اگر تمہیں اعتراض ہے تو ابھی بتا دو۔ وقت ہے ابھی۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ شفق بے کسی کی انتہا کو پہنچ گئی۔

''خلیل! یہ ٹھیک نہیں ہے سب۔''

''ہاں یا نہ۔۔۔؟'' وہ ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک لہجے میں بولا۔ اور وہ پل میں ہار گئی۔

''ایک دفعہ ہم ایک ہو جائیں تو پھر کوئی بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔''

وہ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے بہت پیار سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کبھی یہ چوری بھی کرنا ہوگا یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ کسی بھی قیمت پر اس کی بات نہ مانتے اور اگر ابو جی کو معلوم ہو جاتا تو وہ اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتے کجا اتنا بڑا قدم اٹھانا۔

کب نکاح کے بول پڑھائے گئے کب اس کے جملہ حقوق خلیل کے نام ہو گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو بس بے یقینی و خواب کی سی کیفیت میں گھری رہی۔ باپ اس کی زندگی میں پہلے بھی کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ آج اس کے نام کو بھی اپنے نام سے الگ کر کے اسے اپنی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔

ایک پل کو شرمندگی نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا لیکن۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس کی نیم رضامندی ہی سہی لیکن برخلاف کچھ نہیں ہوا تھا۔

خلیل نے اچھا خاصا انتظام کروایا تھا۔ اس کے دس بارہ دوستوں نے اس کے نکاح میں شرکت کی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سب کچھ کتنی آسانی سے ہو گیا۔ اب شاید خلیل کے گھر والے اسے قبول کر لیں۔ اپنے گھر والوں کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ تو اگر خلیل اسے بھاگنے کو کہتا تو شاید عمل کر جاتی اس پہ بھی۔

فی الحال اسے دیر ہو رہی تھی اور وہ خلیل کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو اپنے دوستوں کو نبٹا رہا تھا۔ یہ گھر بھی شاید اس کے کسی دوست کا تھا۔

"خلیل! بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔" وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

"نہیں آج تم میری مرضی سے جاؤ گی۔"

خلیل نے بھاری آواز میں کہتے ہوئے پاس آ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شفق کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ خلیل اس کی محبت کی طرح اس کے وجود کی دلکشی میں کھوتا چلا گیا۔ زماں و مکاں کھو گئے۔ اور وقت بھی پابندی کی قید سے نکل کر آزاد پنچھی بن گیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! شفق باجی آ گئی ہیں۔"

اس نے جیسے ہی اندر قدم رکھا۔ مہ پارو نے فوراً امی کو آواز دی تھی۔ اس کا سانس ایک لمحے کو رک سا گیا۔ تو کیا آج وہ نازک گھڑی آ ہی گئی۔ جس سے وہ ہمیشہ بچتی آئی تھی۔ دروازہ بند کر کے دل کڑا کرتے ہوئے وہ اندر آ گئی۔

"کہاں سے آ رہی ہے۔؟" امی اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی استفسار کر رہی تھیں۔ آج جرح کا انداز بدلا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پہ ایک نامعلوم خوف تھا آنکھوں کی سرخی سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی سے کتنی پریشان رہی ہوں گی۔

"میں وہ عائشہ کے گھر تھی۔" اس نے جان بوجھ کے جھوٹ بولا تھا کہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا اس بات کا، پہلی فرصت میں عائشہ کی ہی طرف چیکنگ ہوئی ہوگی۔ شاید وہ اس معاملے کو طول دینا چاہ رہی تھی۔

"جب میں نے منع کر دیا تھا تو کیوں گئی تو باہر؟ ہیں، اور کہاں گئی تھی، عائشہ کے ہاں؟ جھوٹی۔"

غصے اور پریشانی سے ان کی آنکھیں متورم تھیں وہ نہایت اضطراری کیفیت میں گھری وہ اس کی طرف بڑھی تھیں۔ شفق بے ساختہ ہی پیچھے ہٹی تھی۔

"کیوں۔۔۔! میں کوئی قیدی ہوں جو باہر نہیں جا سکتی۔" اس نے پہلی دفعہ ہمت کر کے زبان کھول ہی لی۔ برجیس بیگم جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔ یہ ہمت اور بے باکی۔ کون دے گیا تھا اسے۔ انہیں اشتعال آ گیا۔

"منحوس اب تو زبان بھی چلائے گی مجھ سے۔ بتا کدھر گئی تھی؟"

انہوں نے جھپٹ کر بغیر توقف کے یکے بعد دیگرے دو چار دھموکے اس کی پیٹھ پر جڑ دیے۔

"صبر کر ابھی تیرے ماموں کو فون کرتی ہوں۔ کل کے بیاہتے آج لے جائیں۔ عذاب مسلط ہو گیا ہم پہ تو۔"

"خبردار۔۔۔" وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ "خبردار اگر آپ لوگوں نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو۔ ورنہ۔۔۔"

اس کے سارے بال کھینچنے کی وجہ سے بکھر گئے تھے اور وہ لال سرخ چہرہ لیے "تنبیہاً" انگشت شہادت اٹھائے دانت پر دانت جمائے انہیں وارننگ دے رہی تھی۔ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ آج سے پہلے ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ جیسے آج ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسے اس سے بھی بری طرح مارا پیٹا تھا لیکن وہ اف تک نہیں کرتی تھی۔ کچھ تو تھا جو غلط ہو رہا تھا۔

ان کی چھٹی حس کا الارم بجا تھا۔

"ورنہ۔۔۔! بتا کیا کرے گی تو۔" وہ اس کے مدمقابل آ کھڑی ہوئیں۔

"میں بھاگ جاؤں گی خلیل کے ساتھ۔۔۔ ہاں۔۔۔ کوئی نہیں ہے یہاں میرا۔ صرف خلیل ہے۔ وہی مجھے سمجھتا ہے۔ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور تم خود تو ساری زندگی جہنم میں جلتی رہیں، ہمیں بھی جلاتی رہیں اور اب میرا مقدر بھی جہنم ہی بنانا چاہتی ہو۔ کتنی ظالم ہو تم۔ تم تو ماں کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو۔"

زارو قطار روتے، سسکتے اور مسلسل مظلومیت کی دہائی دیتے ہوئے وہ ہر رشتہ و تمیز بھول بیٹھی تھی بس یاد تھے تو اپنے اوپر ڈھائے گئے مظالم جنہیں وہ آج زبان دے چکی تھی۔ برجیس سے ایک انچ بھی آگے نہیں ہلا گیا۔

خلیل۔ اس ایک نام کی بازگشت تھی دل و دماغ پہ۔

"کون ہے یہ خلیل۔" وہ بے جان سی سرگوشی میں بولیں۔ شفق نے ان پہ کیا فرد جرم عائد کی۔ کیا الزام دیا، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا بس یاد تھا تو صرف ایک نام، ابھی جسے اپنی بیٹی کے منہ سے سن چکی تھیں۔

یہ کون تھا جس نے ان کی بیٹی کو باغی بنا ڈالا تھا اگر اس کے باپ کو پتا چل گیا تو۔ وہ انسان جس نے ساری زندگی انہیں کبھی اعتبار کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ کیا وہ اسے اتنی بڑی کوتاہی پہ معاف کر دے گا انہوں نے پتے کی طرح لرزتے اپنے دل کو قابو کرنے کی ناکام سی کوشش کی اور ایک بار پھر تنفر سے سکڑی سمٹی شفق کی طرف نظر کی جو مسلسل سسک رہی تھی۔

"کون ہے یہ بدذات؟" ان کے لہجے میں نفرت کی اتنی شدید کاٹ تھی کہ وہ لرز کر رہ گئی۔

"دیکھ جو بھی ہے یہ۔ آئندہ میں اس کا نام تیری زبان سے نہ سنوں۔ بس ہم تیری شادی زیب سے کر دیں گے، جو بھی ہے بھول جا سب کچھ۔ میں تیرے باپ سے اس کا ذکر بھی نہیں کروں گی۔" دوسرے ہی پل وہ پینترا بدل کر اسے سمجھاتے ہوئے لجاجت سے بولیں۔ وہ بہت بزدل تھیں اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔

"امی! میں جہاں زیب سے شادی نہیں کر سکتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ ہذیانی انداز میں چلا کر بولیں۔

"کیونکہ میں خلیل سے نکاح کر چکی ہوں۔"

بدقت تمام کہتے ہوئے وہ ان کے حواسوں پہ بم گرا چکی تھی۔ اس کے الفاظ تھے کہ بچھو کا ڈنک۔ وہ اچھل کر دور ہٹیں۔

"ہائے اللہ! یہ کیا کیا تو نے۔" وہ بے جان سے انداز میں کارپٹ پہ گر پڑیں۔

"یا اللہ! یہ کیا غضب ہو گیا۔" جب ہی دھڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ ان دونوں نے ہی بے حد سہم کر اس طرف دیکھا تھا۔

حماد صاحب خون آشام نظروں سے شفق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ شک باقی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے سب کچھ سن لیا تھا۔ شفق کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"اس لڑکے نے ہماری ناک کٹوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔" قاسم رضا آج ایک بار پھر اس پر برس رہے تھے۔ وہ ہاتھ باندھے مؤدب سا کھڑا اپنی عزت افزائی کروا رہا تھا۔

"کب سے چکر چل رہا تھا؟" وہ سرد مہری سے کہتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے بالکل اس کے پاس آکر کھڑے ہوئے۔ اس نے ایک لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھا جن میں مکمل سرد مہری اور اجنبیت تھی۔ اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کرلیں۔

اس کے پاس ان سب کے سوالوں کا ایک بھی تسلی بخش جواب موجود نہیں تھا' سو دم سادھ کے خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔

"اللہ مجھے معاف کرے۔ میں بھی بیٹی والا ہوں بہت دکھ ہوا مجھے اِس بے وقوف لڑکی کا باپ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے اپنی عزت کی بھیک مانگ رہا تھا صرف اس۔ اس بے غیرت کی وجہ سے۔ کیا ضرورت تھی اسے یہ ڈھونگ رچانے کی۔ شادی ہی کرنی تھی نا' اتنا ہی مرا جا رہا تھا تو ہم مر گئے تھے کیا؟"

غصے سے انہوں نے بیٹے پہ ہاتھ رکھ کے اسے دھکیلا تھا۔ خلیل نے بمشکل سنبھل کر پیچھے صوفے کی ہتھی کو پکڑا۔

"بس بھی کریں نا۔" اس کی ماں تڑپ کر آگے بڑھیں۔

"سارا الزام ایک میرے ہی بیٹے کے سر ہے کیا؟ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اگر اس نے غلطی کی ہے تو اس لڑکی نے کوئی گل نہیں کھلایا ہوگا۔ توبہ کیسی بے دید ہو گئی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔ جانے کیسی مائیں ہوتی ہیں جو بیٹیوں کو بے لگام چھوڑ دیتی ہیں۔"

"آپ جیسی ہوتی ہیں۔" قاسم رضا بھڑک کر بولے۔ انہوں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"یہ۔ یہ بھی تو اولاد ہے نا ہنجار' بے لگام۔ آپ کہاں تھیں اس وقت آمنہ بیگم! فرد جرم عورتوں پہ ہی نہیں' مردوں پہ بھی عائد ہوتی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے' شروعات اسی بے لگام نے کی ہوں گی۔ شکل دیکھو اس کی۔" وہ نئے سرے سے تپنے لگے۔

عقیل نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیل کو منظر سے گم ہو جانے کا اشارہ کیا وہ بے بس سی مسکین شکل بناتا کمرے سے نکل گیا۔ آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ نکاح کے بعد سے اس کا رابطہ شفق سے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد ہو گئی تھی۔ ذلیل تو وہ سب کی نظروں میں ایک ہفتے سے ہو رہا تھا۔ رہی سہی عزت کا جنازہ آج نکل گیا۔ خود اس کا یہ حال تھا اور شفق وہ بے چاری کیسے سہہ رہی ہوگی۔ ایک دم اسے اس کا خیال آیا تھا اور خود بخود ہی سوچوں کو جیسے رستہ مل گیا۔

"تم سے ایک دن بھی صبر نہیں ہو سکا شفو۔"

تصور میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنی مشکل میں ہوگی۔ ابو جی تو اس کی شکل دیکھتے ہی چلانے لگتے تھے۔ حمیرا بھی منہ موڑ کر چلی جاتی تھی۔ عقیل بھائی پہلے بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے پیچھے اس کی حمایت میں امی ہی رہ جاتی تھیں اِس واقعے کے بعد وہ جب بھی اس سے بات کرتیں ان کے لہجے کی واضح سرد مہری اسے خود سے بھی شرمندہ کر دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! باجی کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے کھانا نہیں کھانا۔ پانی کا گلاس بھی دور پھینک دیا ہے۔"

سارا نے شفق کے کمرے سے نکل کر منہ بسورتے ہوئے کہا تو انہیں مزید تاؤ آگیا۔

"تو اس سے کہو مر جائے' جان بخش دے ہماری' پتا نہیں اللہ نے کس غلطی کا عذاب ہمارے سر مونڈھ دیا ہے۔ ساری دنیا کے سامنے ماں باپ کو اس نے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ کمبخت پیدا ہو گئی میرے ہی گھر میں۔"

اسے کوستے کوستے ان کا سانس پھول گیا اور اب زمین پہ بیٹھ کے وہ رونے لگی تھیں۔

"امی! کیا ہے۔ چھوڑیں نا۔" وہ تینوں انہیں روتا دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئیں۔

ہر دوسرے دن شفق کھانا واپس کر دیتی تھی' وہ کمزوری ہونے کی وجہ سے دن بدن نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔

رات بہت حبس زدہ تھی۔ سانس لینا بھی دشوار تھا وہ کھڑکی کے پاس آکر سانس لینے لگی۔ تصور میں اسی دشمن جاں کا خاکہ ابھرتے دیر نہیں لگی تھی۔ جسے ملے ہوئے بھی دو ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے اپنے سپید ہاتھوں کو دیکھا اندھیرے میں تو وہ خود ہیولہ سی لگ رہی تھی۔ کتنے دن ہوئے اس نے تو اپنی صورت ہی آئینے میں دیکھنا چھوڑ دی تھی صرف ایک وہ شخص تھا جسے سوچتے سوچتے وہ خود کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

"خلیل۔ پلیز! ایسے نہ چھوڑو مجھے۔ میں مر جاؤں گی۔" اس کے تخیل کو مخاطب کر کے وہ بے بسی کے احساس سے سسکنے لگی تھی۔

"باجی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" مہرو اس کی پشت پر کھڑی استفسار کر رہی تھی۔ نیند سے بوجھل لہجہ وہ شاید اس کے رونے کی وجہ سے جاگی تھی۔ شفق نے آنسو پونچھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے ہی بٹھالیا۔

"اذیت کا احساس ہو رہا ہے مجھے اس لیے رو رہی ہوں۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولی تو لہجے میں بدستور آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"آپ خود کو کیوں تکلیف دے رہی ہیں باجی!"

مہرو نے رحم بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ شفق نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف نگاہ کی۔ بے پناہ معصومیت' بھولپن' بچپن کیا نہیں تھا اس کے چہرے پہ۔ اس پل اس نے مہرو میں خود کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی معصوم تھی بھولی سی' اس کی معصوم جوانی کے سارے ارمان ملیامیٹ ہو کر رہ گئے تھے ابھی تو وہ عمر کے اس دور میں داخل ہوئی تھی جب دل کی دھڑکتی خوابوں کی دنیا میں قدم رکھتی ہے۔ خلیل نے پہلی بار اس کی طرف سے غفلت کی تھی۔ ورنہ تو وہ اس کے والہانہ انداز کی عادی تھی۔ وہ اسے بھول گیا ہے۔ خلیل اس سے بے وفائی کر سکتا ہے۔ یہ سوچ ہی اسے مار ڈالنے کو کافی تھی۔

اس نے وحشت زدہ ہو کر مہرو کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"مہرو۔ تم۔ تم۔ وعدہ کرو۔ تم کبھی میری طرح نہیں بنو گی۔ کسی کے بہکاوے میں نہیں آؤ گی۔ میں جانتی ہوں تمہارا کردار میرے کردار کی طرح کمزور نہیں ہے لیکن پھر بھی میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ کبھی اس راہ کی مسافر مت بننا ورنہ وحشتیں تمہارا مقدر بن جائیں گی اور تم میری طرح برباد ہو جاؤ گی مجھے دیکھو۔"

وہ خود کو جیسے نوچ نوچ کر اپنی بربادی پہ ماتم کناں تھی۔ برجیس بیگم نے دروازے کی اوٹ سے خاموشی سے یہ منظر دیکھا اور واپس پلٹ گئیں۔

اپنے کمرے میں آتے ہوئے ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ انہوں نے بستر پہ لیٹے اس شخص کے منحنی سے وجود کو دیکھا جو رشتے میں ان کا شوہر اور بچوں کا باپ تھا۔ ان کچھ دنوں میں وہ گویا زندہ لاش کی صورت رہ گیا تھا۔ آپس کی ہم کلامی تو خواب ہو چکی تھی۔ مسلسل رت جگوں سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔

"مکافات عمل۔" ان کے ذہن پر جیسے ماضی کی کوئی فلم گردش کرنے لگی شفق کا یہ عمل ان کے رویے یا ماحول کا رد عمل تھا اس گھر کا ماحول بچوں کے لیے کبھی بھی سازگار نہیں رہا تھا۔ انہوں نے ماں کے رونے اور باپ کے خوف کو خود پر اس حد تک طاری کر لیا تھا کہ وہ لاکھ ان کی برین واشنگ کرتیں سب بے سود۔ انہوں نے بچوں کو پرسکون ماحول اور نارمل زندگی فراہم کرنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن حماد سب کیے کرائے پہ پانی پھیر دیتے تھے انہیں برجیس سے تو کیا اپنی اولاد سے بھی محبت نہیں تھی۔ یہ تو شاید ان کے لیے کمزور لمحوں کی یادگار ثابت ہوئے تھے۔

راشد ماموں امی کے اکلوتے بھائی تھے۔ مامی غیر خاندان سے تھیں۔ حماد اور فریدہ جڑواں تھے۔ مامی کی زندگی نے وفا نہ کی تھی۔ حماد اور فریدہ آٹھ سال کے تھے جب وہ سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ماموں نے مامی کی یادوں میں تن تنہا ہی دونوں بچوں کو پالا تھا۔ عمران اور برجیس اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھیں۔ عمران کا انجینئرنگ کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

آخری سال تھا جب فریدہ کو شریک سفر بنانے کی خواہش اس کے ہونٹوں پر مچلی تھی۔ جانے کب سے اس نے اپنی اس نک چڑھی کزن کو دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ اسی کی تو دلی مراد بر آئی چنانچہ بڑوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وٹہ سٹہ قرار پایا تھا۔ حماد کو اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھنا برجیس کی خوش قسمتی تھی اور وہ اپنی قسمت پر نازاں ہی تو تھیں لیکن حماد نے وہ طوفان مچایا کہ الامان کتنے دن وہ اپنے حق کی جنگ لڑتے رہے۔ وہ اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتے تھے۔

ان کے ذہن میں وٹے سٹے کا غلط تصور قائم تھا۔ ان کے خیال سے ایسی شادیاں انسان کو غلام بنا دیتی ہیں جب ہی شادی کی پہلی رات انہوں نے برجیس کو باور کروا دیا تھا کہ وہ ان سے کسی اچھائی کی امید ہرگز نہ رکھیں ان کا دل تو جب ہی ٹوٹ گیا تھا' وہ سر جھکا کر ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہیں ان کی ہر جائز و ناجائز بات کو ہنس کر سہہ جاتیں۔ بہت بے بسی کے عالم میں بھی انہوں نے کبھی مایوسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی ہمت ہی تو تھی یا شاید وہ ان سے محبت کرتی تھیں۔ بے پناہ محبت۔

جب ہی سرکاری تبادلے کے بعد جب وہ گورنمنٹ ہاؤس میں آئے تو حماد کو جیسے آزادی مل گئی۔ بات بے بات وہ انہیں پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

"آپ دوسری شادی کر لیں حماد۔ جسے آپ چاہتے ہیں۔" ایک دن وہ اسے کہہ اٹھی تھیں شاید اس طرح سے ان کی مشتعل فطرت کو قرار آجائے۔ "یوں خود کو اذیت تو مت دیں آپ۔!"

وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں تو حماد نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میری محبت اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے دوسرا درجہ حاصل ہو۔ مجھے کسی کو بھی اپنانا ہوا تو تم سے اجازت درکار نہیں ہو گی مجھے اور اس طرح کی قربانیاں دے کر تم سمجھتی ہو کہ میرے نزدیک اونچی ہو جاؤ گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میری آنکھوں میں تمہارے لیے محبت تو کجا رحم کا تاثر بھی نہیں آسکتا۔ تم میرے لیے قابل نفرت ہو۔ قابل نفرت تھیں اور ہمیشہ ہی قابل نفرت رہو گی۔ سمجھیں تم۔"

وہ گویا پھنکار کر بولے۔ حالانکہ جس اذیت سے بچنے کا وہ انہیں مشورہ دے رہی تھی وہ تو کہیں بھی نہیں تھی۔ اذیت تو ان کی اپنی ذات سے عبارت تھی۔ ہر لمحہ' ہر پل ٹھکرائے جانے کی اذیت' لفظوں کی مار سہنے کی اذیت' ان کے دیے گئے زخموں کی اذیت' حماد تو اپنی جھوٹی انا کی تسکین کرتے تھے۔ برجیس کبھی بھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیتی تھیں لیکن وہ کہیں نہ کہیں کسی بات کو ایشو بنا کر جھگڑا شروع کر دیتے تو وہ سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

معلوم نہیں پھر اتنا وقت کیسے بیتا' کب ان کی شفق بڑی ہوئی اور اس نے گھرداری سنبھال کر گھر کے ماحول کو بدلنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ انہیں کچھ پتا ہی نہ چلا تھا۔ دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ اب تو حماد کی دہشت بھی معنی کھو چکی تھی اب وہ زیادہ پروا نہیں کرتی تھیں کہ حماد کیوں چلا رہا ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہو رہے تھے' وہ مزید اپنے ہی بنائے گئے گنبد بے در میں مقید ہو رہی تھیں۔ کبھی زیادہ جھنجلاہٹ سوار ہوتی تو شفق بے چاری ان کے زیر عتاب آجاتی۔ کب اسے شعور آیا اور اس نے گھر کے ماحول سے تنگ آکر باہر مصروفیت ڈھونڈی۔ انہیں کبھی معلوم ہی نہیں ہوا شفق خوبصورت تھی' بیضوی چہرہ اور بال ماں کی طرح لمبے اور گھنے تھے۔ خاص طور پر ہونٹ اس نے برجیس کے ہی چرائے تھے۔ بھرے بھرے گلابی ہونٹ جو اس کے تیکھے نقوش کے ساتھ بڑے بھلے لگتے تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے شفق کو دیکھا ہی کب تھا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا اور وہ نیند سے کوسوں دور ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھیں رگڑیں اور دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھتے ہوئے وقت کا تعین کیا۔ کتنی عجیب بات تھی' سالوں پہ محیط ان کا ماضی کتنی جلدی سمٹ گیا تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر بستر پر لیٹے اس وجود کو دیکھا جس نے زندگی بھر سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں جینے دیا تھا۔ وہ عزت' احترام کبھی نہیں بخشا جو ان کا حق تھا۔ آج ان کی اپنی اولاد نے کیسے انہیں دو کوڑی کا کر چھوڑا تھا۔ ساری انا ایک مشت خاک ہو گئی تھی۔ انہوں نے شکست خوردہ حماد کی معافی قبول کر لی تھی۔ لیکن دل پھر نہیں پلٹتا۔ ندامت نے انہیں آگھیرا تھا تو کب' جب وقت کا پنچھی اپنی اڑان بھر چکا تھا۔ ان کے ابھی بہت سے کھاتے حماد صاحب کی طرف کھلتے تھے۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ سو وہ اٹھ کر دل جمعی سے وضو کرنے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"جی بھائی! آپ نے بلایا تھا۔" خلیل دروازے پر کھڑا اجازت مانگ رہا تھا۔ عقیل نے ایک نظر اس کے مجنوں جیسے بکھرے حلیے پر ڈالی اور سر ہلا کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں! وہ تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔ بیٹھو۔"

خلیل ناسمجھی سے انہیں دیکھتے ہوئے پاس پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دراز سے کچھ پیپرز نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ کیا ہے۔؟" اس نے حیرانی سے پیپرز تھامے۔

"ڈائیورس پیپرز ہیں۔ ان پہ سگنیچر کر دو۔" وہ آرام سے بولے اور خلیل کے ہاتھوں میں پیپرز لرز کر رہ گئے۔

"طلاق۔ لل۔ لیکن۔ کیوں۔؟" وہ احتجاجاً بولا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے؟ اتنے نادان تو نہیں ہو تم۔" ان کے ماتھے پہ دو شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ خلیل کا چہرہ پل بھر میں متغیر ہوا۔

"یہ زیادتی ہے۔ میں نے شفق سے نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا جو معافی کے قابل نہ ہو۔" اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

عقیل نے اس کے ٹوٹتے لہجے سے اس کی اس لڑکی سے محبت کا اندازہ لگایا تھا اس کے چہرے پہ غور کیا تو وہاں وحشتوں کا اک جہاں آباد نظر آیا۔ انہوں نے افسوس بھری نظر اپنے جوان بھائی پہ ڈالی۔ گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

"یہ ہمارا نہیں' دوسری پارٹی کا مطالبہ ہے۔ اگرچہ ہمیں تمہارے اس اقدام سے تکلیف ضرور ہوئی تھی لیکن مجبوری سے ہی سہی قبول کر چکے تھے۔" وہ بے لچک انداز میں بولے۔ خلیل کے تنے ہوئے تاثرات یکدم ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"شفو۔ شفق نے طلاق کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کیوں کرے گی۔"

"معلوم نہیں۔ لیکن اس کے باپ کی یہی تکرار ہے۔" عقیل نے اس کے بکھرتے اعصاب سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو بس پھر بڈھے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہونے والی۔ شفق میری محبت ہے اور اسے چھوڑنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ اٹل لہجے میں کہتا ہوا ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ عقیل نے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پہ رکھ دیے۔

"میری مانو گے؟" وہ کہہ کر کچھ دیر اس کی مضطرب نظروں سے الجھتا رہا پھر بولا۔

"اپنی اس نادانی کو بھول جاؤ ہمیشہ کے لیے۔"

"بھائی! آپ بھی۔" وہ صدمے سے گنگ ہو گیا۔

"ہاں! میں تمہیں ایک اچھا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"اچھا مشورہ ہے یہ۔ میری زندگی چھیننے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ سب لوگ' آخر کیوں۔؟" وہ بپھر کر بولا۔

"دیکھو خلیل! تمہارے پاس اس وقت دو راستے ہیں۔ ایک کٹھن ہے۔ ایک سہل۔ اختیار تمہارے پاس ہے۔ ابو جی نے دو شرطیں رکھی ہیں تمہارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

آ گے۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم شفق کو باقاعدہ بہو بنا کر لے آئیں گے۔ لیکن پھر تمہیں اس گھر اپنے حصے کی متوقع جائیداد سے اور گھر والوں سے بھی شاید ہاتھ دھونے پڑیں۔ جہاں مرضی ٹھکانا ڈھونڈو رہو اور جیو۔ ہمارا کوٹہ ختم ہو گا۔" خلیل گم صم سا ہو گیا۔

"اور دوسری شرط یہی ہے طلاق والی۔ شفق معصوم ہے کم عمر ہے۔ اسے کوئی اور اچھا انسان مل جائے گا تمہاری شادی اقراء کے علاوہ اور کسی سے نہیں ہو سکتی۔ یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس سے حمیرا کے رشتے پہ آنچ آ سکتی ہے۔ ادلے بدلے کے رشتے یہی وصف لیے ہوتے ہیں اور ابو جی کو تم جانتے ہو۔ کچھ بھی ہو جائے لیکن حمیرا کے لیے وہ شروع سے ہی بہت پوزیسو رہے ہیں' اسے کچھ رنج پہنچے۔ وہ برداشت نہیں کریں گے۔"

"چاہے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔" خلیل نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

"ابھی تو وقت ہے میرے بھائی! خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو کہ تمہیں پچھتاوا نہ ہو۔ چچا جی اپنی چہیتی بیٹی کو جہیز میں کئی ایکڑ اراضی بھی دے رہے ہیں۔" عقیل نے لالچ کا ٹکڑا لگایا۔ وہ خاموش رہا۔

"دیکھو یار! تمہاری کوئی خاص تعلیم نہیں ہے جس سے تم ایک خاطر خواہ جاب حاصل کر سکو۔ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے جب بھوک بھوت بن کر تمہارے سروں پہ ناچے گی تو ساری محبت اڑن چھو ہو جائے گی تب واپس بھی آنا چاہو گے تو سارے راستے مسدود ہو جائیں گے یار۔۔۔ یہ آج کی دنیا تو محبت سے ہی عاری ہو گئی ہے تم کس دنیا کے باسی ہو۔ یہاں اب دو ہی چیزیں اہم ہیں بس۔ "پیٹ اور پیسہ" پیسہ کماؤ اور پیٹ بھرو۔ پیٹ بھرو پھر پیسہ کماؤ۔ مت کرو اپنی زندگی عذاب۔" عقیل اسے "تفصیلاً" سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے کچھ وقت چاہیے۔" کافی دیر بعد وہ پست سے لہجے میں بولا تھا۔ عقیل نے سکون کی سانس لی اونٹ پہاڑ کے نیچے آ رہا تھا اب آہستہ آہستہ۔

"او کے! لیکن ذرا جلدی۔" خلیل ان کی پوری بات سنے بغیر کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

رات وہ ایک پل کے لیے بھی سکون سے نہیں سو سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شفق کا مسکراتا چہرہ بار بار آتا اور چھن سے غائب ہو جاتا۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جو اس نے ان پانچ سالوں کے دوران اس کے ہمراہ گزارا تھا۔ وہ نازک سی گڑیا۔ جسے وہ ڈر کے مارے یوں نہیں چھوتا تھا کہ کہیں کانچ کی مانند ٹوٹ نہ جائے۔ اس کی کھنکھناتی ہنسی، جس کے سحر میں وہ مبہوت ہو کے رہ جاتا تھا۔ اس کے بال۔۔۔ اس کی ساحر آنکھیں' گداز لب۔۔۔ سب کچھ ہی تو۔۔۔ وہ کیا تھی۔۔۔ یہ کوئی خلیل رضا سے پوچھتا۔۔۔ مجسم رعنائی کی صورت۔۔۔ جسے شرعی رشتے کی ڈور میں باندھ کر اپنا استحقاق بھرا حق وصول کر چکا تھا۔

اس وقت اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جسے اس کا من پسند کھلونا دے کر واپس چھین لیا ہو۔

"جس دن تم نے مجھ سے بے وفائی کی وہ دن تمہاری اور میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

اسے اپنے ہی لفظوں کی بازگشت کہیں قریب سے سنائی دی تھی۔ سو وہ کسے دوش دیتا۔ بے وفا تو وہ خود نکلا تھا۔ اتنی سی عمر میں اسے ایسا کرب۔ داغ لگ جائے گا۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں پہ تتلیوں کے رنگ بھی نہ ہٹے ہوں گے اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچے۔

"شفق۔۔۔" اس کا دل رو رہا تھا۔

غنودگی میں جاتے بار بار اس کی آنکھوں کے آگے ایک بچی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کا دامن تھامے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجائیں کرتی آتی۔ وہ اس کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوتی تھی۔ اس کی سسکیوں پہ اس کا ذہن فٹ سے بیدار ہو جاتا۔

"شفق۔۔۔ میں بہت برا ہوں شفق۔۔۔ تمہارا خلیل بے وفا نکلا۔ میری جان اسے معاف کر دینا۔۔۔ میں کچھ نہیں دے پاؤں گا تمہیں۔۔۔ تمہاری آنکھوں میں خواب سجانے کا قصوروار ہوں میں۔۔۔ مجھے معاف کر دو شفق میں۔۔۔ خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔۔۔"

آدھی رات کو وہ اپنے حواسوں پہ اس کی اتنی جاندار موجودگی پہ گھبرا کر بلک پڑا تھا۔ وہ چھ فٹ کا اونچا لمبا مرد اپنی بے بسی پہ رو رہا تھا۔ اس کے ذہن و دل نے بس ایک فیصلے پہ مہر ثبت کر دی تھی جسے چاروناچار اسے قبول کرنا ہی تھا۔ کیونکہ یہ واقعی ایک تلخ حقیقت تھی کہ۔

محبت کے گھاؤ وقت کے مرہم سے بھر سکتے تھے۔ لیکن پیٹ کا کشکول محبت کے سکوں سے نہیں بھر سکتا تھا۔

اس دن اس کا بخار معتدل تھا۔ اب وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ رضائی میں دبکے وہ کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ لیکن اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پہ جیسے ٹک سی گئی تھیں جب ہی کسی نے اس کی طرف کچھ اچھالا تھا۔ وہ چونک کے مڑی اس کے تکیے کے پاس کوئی رجسٹری تھی اس نے پھینکنے والے کو دیکھا برجیس سپاٹ چہرہ لیے دروازے کے بیچ کھڑی تھیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔؟" رجسٹری کھولنے کے بعد ان کاغذات پر نظر پڑتے ہی وہ انہیں دور پھینکتے ہوئے بولی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ ان کو وحشت زدہ نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔ اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ برجیس آگے بڑھیں۔

"شفق۔۔۔!"

"مت مجھے ہاتھ لگائیں۔۔۔ اب آپ لوگ خوش ہیں۔" وہ چلا کر بولی۔

"کیا ملا مجھے برباد کر کے۔۔۔ آپ کو۔۔۔ خلیل میرے ساتھ ایسے نہیں کر سکتا۔" وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ رہی تھی۔

"آپ لوگوں نے اسے مجبور کیا ہے۔" وہ چلا رہی تھی۔

"تم نے ہمیں ذلیل کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی شفق۔۔۔! تمہیں سینے پہ سجانے کا ہمیں کیا شوق ہے بھلا۔ تمہارے ابو نے ان لوگوں سے بہت کہا کہ وہ لوگ باقاعدہ شادی کروالیں۔ لیکن اس لڑکے نے تمہیں طلاق بھجوادی کہ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں یا واسطہ نہیں ہے۔"

انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے باور کروایا تھا۔ انہیں شفق کی معصوم جوانی پہ بہت بہت ترس آیا تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا۔ بیٹی کی خوشیوں کو دیکھنے کے ارمان ان کے دل میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ لیکن وہ بے بس تھیں' کچھ بھی کرنا ان کے کنٹرول سے باہر تھا۔ شفق بے یقینی سے ان کے چہرے کو دیکھ کر رہ گئی۔

"خلیل نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟"

اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں کو آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔ جن کی لکیروں میں اس کی بدنصیبی کی داستان رقم تھی۔

"وہ ایسے نہیں کر سکتا میرے ساتھ۔" یک دم ہی وہ چلا کر بولی اور پھر بیٹھتی چلی گئی۔

"تم تو کہتے تھے کہ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ پھر کس نے یہ جرأت کی؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو میرے ساتھ؟ میرا کیا قصور تھا؟"

بے یقینی کی سی کیفیت میں اس کا دل مسلسل رو رہا تھا۔ اس دن وہ اتنا روئی تھی کہ ایک بار اسے لگا تھا کہ اس کے بعد شاید اس کے آنسو ختم ہو جائیں گے۔ لیکن جب بھی وہ اس دشمن جان کو سوچتی نجانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلابی ریلا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا۔ گزرنے والا ہر پل اس کی یاد سے شکووں سے عبارت ہوتا۔ اس کے لیے تو جیسے ہر دن اذیت اور ہر رات سزا تھی۔ عائشہ آتی تو وہ اس سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ امی تو بس اسے کھانا کھلانے کے لیے بلواتی تھیں کہ اس نے اپنی ضد سے خود کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

خلیل تو جیسے لاپتا ہو گیا۔ اس دن کے بعد ان کی فیملی نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شفق نے دیوانہ وار کتنے ہی چکر اس کے گھر اور دکان کے لگا لیے تھے لیکن وہ ہوتا تو نظر آتا۔ اسی ادھیڑ بن میں جانے کتنے دن گزر گئے۔ عائشہ اس کے پاس آئی۔ شفق نے حالات سے شاید سمجھوتا کرلیا تھا یا شاید صبر۔ اب وہ خود ساختہ ہڑتال نہیں کرتی تھی گھر کے کاموں میں بھی تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کے انداز سے تو لگتا تھا کہ وہ تمام انہونیاں قبول کرچکی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پہ نامعلوم سا کرب' انجانا سا دکھ ہمہ وقت نظر آتا رہتا۔ عائشہ کافی دن بعد اس سے ملنے آئی تھی۔

"آؤ عاشی!" کافی دیر بعد یہ دو لفظ بولی تھی۔

"میں کچھ بتانے آئی ہوں۔" وہ بلاتوقف جلدی جلدی بولی۔ اس کے لہجے میں اضطراب چھلک رہا تھا۔ شفق نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ سرعت سے نظریں چرا گئی۔

"خلیل واپس آگیا ہے۔ میں نے اسے مارکیٹ میں دیکھا تھا۔" شفق سے ہلا نہیں گیا۔

"کیا...؟" اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا۔ آناً" فاناً" آنسوؤں نے اس کی خوبصورت آنکھوں کا محاصرہ کیا تھا۔

"وہ... شادی بھی کرچکا ہے۔" عاشی نے تیزی سے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

"شفق۔" وہ اس کی طرف بڑھی۔ وہ کھلی آنکھوں اور بے جان چہرے سے عاشی کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کو دھوکا دینا' دھوکا دے کر اپنا دل بسا لینا کہاں کا انصاف ہے۔ اور اس کی زندگی میں تو لاتعداد دھوکے ہوئے تھے... تو کیا... یہ بھی سہی... اس نے کس اذیت میں خود کو سمیٹا تھا۔ عاشی اس کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی اور دھواں اس کی آنکھوں کے آگے چھا گیا تھا۔ جب ہی بے ساختہ اس نے امڈ آنے والی ابکائی کو روکا تھا اور واش روم جاتے ہوئے دو دفعہ وہ جھٹکا لے کر رکی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو شفق۔" وہ واپس آئی تو عاشی اسی کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پہ فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔ شفق نڈھال ہو کر بستر پر گر سی گئی۔

"تمہیں ابھی بھی لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں...؟" اس نے شکوہ کناں نظروں سے عاشی کو دیکھا۔ بات کتنی بڑھ چکی تھی' یہ کوئی اس سے پوچھتا۔

"اب تو خلیل سے ملنا ناگزیر ہے۔" اس نے لمحوں میں فیصلہ کرلیا۔ دل کا نقصان تو ہو ہی گیا تھا تو کیا اس بے درد کو آزاد چھوڑ دیتی اس سے حساب ہونا چاہیے تھا۔ کیا قصور تھا اس کا۔ کس جرم کی پاداش میں ایسی سزا مقدر ٹھہری تھی اور اگر دھوکہ ہی دینا تھا تو نکاح کرنا کیا ضروری تھا۔ یونہی چھوڑ دیتا تو وہ رو دھو کر صبر کر ہی لیتی۔

☆ ☆ ☆

اس نے دور ہی سے اندازہ کیا تھا کہ دکان میں رش بہت کم تھا۔ وہ ایسے ہی وقت پر نکلی تھی جب گاہکوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی اس کے اشتعال میں بے پناہ شدت آتی جا رہی تھی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سرخ انگارہ ہوچکی تھیں۔ اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر کی ٹھنڈی فضا میں قدم رکھا اور وحشت زدہ ہرنی کی مانند اسے کھوجا۔ ہمیشہ کی طرح وہ سائیڈ کاؤنٹر پر بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا۔ چہرے پہ ازحد سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ تیر کی مانند جھپٹ کر اس تک پہنچی تھی اور جھٹکے سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی ساکت ہوگیا اس حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔

"تم..." ایک پل کو اس کی آنکھوں میں تڑپ' حیرت' شناسائی کی رمق جاگی تھی۔ جبکہ اگلے ہی پل معدوم ہوگئی تھی اور زمانے بھر کی اجنبیت چہرے پہ سجائے وہ خود کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے لگا۔

"تم نے... مجھے برباد کردیا... خلیل... ! تم سمجھتے کیا ہو کہ بچ جاؤ گے۔"

آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ خلیل نے بمشکل خود کو اس کے شکنجے سے آزاد کروایا اور جب بولا تو... اس کے لہجے کی کاٹ سے ہی

شفق مرنے والی ہوگئی۔

"آئم سوری... میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ بہتر ہوگا تم بھی یہ سب بھول جاؤ۔"

اوہ میرے خدا! کیا مشورہ تھا یہ۔ زندگی کوئی کھیل تو نہیں کہ بندہ ہار پہ صبر کرلے۔

"تم نے میری زندگی کو کھلونا سمجھ رکھا ہے؟ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی خلیل۔ میں نے اپنے ماں باپ کو دکھ دیا۔ میں اجڑ گئی۔ تو تم کیسے مجھے برباد کرکے خوش رہ سکتے ہو۔" خلیل نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"مجھے معاف کردینا شفق! میں مجبور ہوگیا تھا۔" وہ بدقت تمام خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ سامنے اس کی زندگی مجسم دھڑک رہی تھی۔ جسے اپنے ہی ہاتھوں شجر ممنوعہ قرار دے چکا تھا۔

اتنے اجڑے حلیے میں بھی اس کی تمام تر رعنائیاں اجاگر ہو رہی تھیں۔ اسے افسوس کے ساتھ پچھتاوا ہوا۔ کاش وہ سب مجبوریاں اس کی راہ میں حائل نہ ہوتیں تو آج۔ وقت کے بھی عجیب کھیل ہیں۔ پانچ سالوں کی ریاضت میں اس نے شفق کو کچھ لمحوں کی ہمراہی بخشی تھی۔ اور اپنا اسیر ہونے تک وہ اس سے زندگی چھین چکا تھا۔

"جاؤ یہاں سے۔ لوگ دیکھ لیں گے۔" اس سے برداشت ہی نہ ہو پا رہا تھا۔ "میں تم سے تمام تعلق توڑ چکا ہوں۔" بے رخی کا خول پھر چڑھ گیا تھا۔ اس نے شفق کو باہر کا رستہ دکھایا تو وہ مزید بپھر گئی۔

"تم کیسے مجھ سے تعلق توڑ سکتے ہو؟ کہاں گئی تمہاری نام نہاد محبت۔ تم لاکھ چاہو مجھ سے اپنا تعلق توڑ ہی نہیں سکتے۔ اور اب تو بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ تمہاری جھوٹی محبت کی نشانی میرے وجود میں پل رہی ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔" بے بسی کے احساس سے وہ رو پڑی۔

"جھوٹ... تم ورغلا رہی ہو مجھے۔" اس نے شفق کو پرے دھکیلا۔

"خلیل پلیز۔ ایسا نہ کرو میرے ساتھ۔ پلیز۔ خلیل..." وہ اب دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اس سے اپنی محبت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ خلیل دیکھو۔"

"میں کچھ دیکھنا سننا نہیں چاہتا۔ تم مجھے بلیک میل کررہی ہو۔ لیکن میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ اور ویسے بھی میں شادی کرچکا ہوں۔" اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے شفق کو بازو سے پکڑ کر باہر کردیا اور ساتھ ہی دروازہ مقفل کردیا۔ وہ شیشے کے اس پار اس بے حس انسان کی چوڑی پشت کو دیکھ سکتی تھی۔

"ورغلایا تو تم نے مجھے تھا۔" جانے وہ کتنی دیر دروازے کی ناب پہ ہاتھ رکھے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

وہ مڑ ضرور گیا تھا لیکن خود پر جمی اس کی نظریں وہ اچھی طرح محسوس کرسکتا تھا۔ کتنا کڑا امتحان تھا۔ وہ ضبط کررہا تھا۔ شیشے کے اس پار اس کی موی گڑیا کھڑی تھی۔ جو اس کی بے توجہی پہ بری طرح پگھل کر پانی بن رہی تھی۔ جانے کتنی دیر وہ اسے دیوانہ وار دیکھتے ہوئے مسلسل کھٹکھٹاتی رہی تھی۔ اس کی آہوں سے سسکیوں سے شیشہ بھی دھندلا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے شفق کو مایوسی سے واپس مڑتے دیکھا۔ وہیں اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔ ایک دم ہی اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا اور وہ کاؤنٹر پہ سر رکھے اگلے ہی پل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

اتنے دنوں سے جیسے وہ بے جان وجود کے ساتھ پھر رہا تھا۔ آج خود کو محسوس ہوا تھا اپنا آپ... اسے یاد آیا۔ دل تو آج سے چھ سال پہلے وہ کسی پر نچھاور کرچکا تھا۔ سو وہ اس کے پاس تھا ہی کہاں۔ آج ادراک ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

دن پر لگا کر رخصت ہو رہے تھے۔ جہان زیب جاب کے سلسلے میں اسلام آباد چلا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پھوپھو کی آمد ملتوی ہوگئی تھی۔ جہان زیب روز ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس سے بات کرتا تھا۔ البتہ شفق نے کبھی بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ ہر بار اس کا لازمی پوچھتا تھا۔

"شفق! تمہاری پھوپھو آرہی ہیں۔" امی اندر آئی تھیں۔ اس نے دعا کے لیے اٹھائے گئے ہاتھوں کو اپنے چہرے پہ پھیرا اور آہستگی سے آنسو صاف کرکے کھڑی ہوگئی۔ جائے نماز سمیٹ کر اس نے دوپٹا کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کب آرہی ہیں۔"

"اس اتوار کو۔" جواب ملا۔ دفعتاً" اس کی نظر امی پر پڑی تو ان کی نظروں کو خود پہ مرکوز پایا۔ وہ اسے اوپر سے نیچے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ شاید انہیں اس کے وجود میں ہونے والی ظاہری تبدیلیوں کا ادراک ہوگیا تھا۔ شفق نے قدرے گھبرا کر رخ بدلا۔

"شفق۔۔۔" ان کی سرسراتی سی آواز نے اس کے گرد طواف کیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔ ایک انہونی سی ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

"جو میں سوچ رہی ہوں، وہ غلط ہے نا۔" انہوں نے اسے جھنجوڑ کر تصدیق چاہی۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا اشارہ کس سمت تھا۔ اس نے بدقت تمام نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر جانے کہاں سے ان میں بجلی بھری اور وہ دیوانہ وار اس پہ جھپٹ پڑیں۔

"کمینی! تو مری کیوں نہیں اور کتنا خون چوسے گی ہمارا۔۔۔ کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تو نے بے غیرت۔۔۔ یا اللہ! اسے اٹھالے کسی طرح۔" وہ اسے مار، مار کے نڈھال ہوگئیں۔ شفق کارپٹ پہ گول مول سی ہوئی خود کو بچانے کی کوشش میں اور سمٹ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا گناہ سرزد ہوگیا میرے خدا جو سزا میں اس منحوس کو پیدا کردیا تو نے۔۔۔" ان کی دہائی جارہی تھی۔۔۔ شفق نے بلبلا کر ماں کو دیکھا۔

"یہ میرا جائز بچہ ہے۔ امی۔۔۔ نکاح کیا تھا میں نے۔۔۔ بار، بار گناہ کہہ کر توہین مت کریں میری۔" روتے ہوئے اس نے ایک ایک لفظ ہچکیوں میں ادا کیا تھا۔

"اٹھ۔۔۔! چل میرے ساتھ۔" وہ منہ گھٹنوں میں چھپا کے رونے لگی تھی۔ جب امی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا تھا۔

"مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔" وہ ان کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے دور ہوتے ہوئے بولی۔

"شفق۔۔۔ ہم تیری شادی کردیں گے بیٹا۔ کسی کو کیا خبر ہوگی۔ جو بھی قصہ ہے ابھی تمام ہوجائے تو بہتر ہے۔" وہ پینترا بدل کے پھر اسے سمجھانے لگیں۔

"نہیں امی! کچھ بھی ہوجائے۔۔۔ میں یہ گناہ نہیں کروں گی۔" وہ الٹے قدموں پیچھے سرکتے ہوئے واش روم میں قید ہوگئی۔

"یا اللہ۔۔۔ رحم کر ہم پہ۔۔۔! اب اور بدنامی نہیں سہہ سکتے۔" وہ آج ایک دفعہ پھر تقدیر کی سفاکی پہ نوحہ کناں تھیں کہ سکون ان کے نصیب کا حصہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جہاں زیب! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" پھوپھو دو دن سے آئی ہوئی تھیں اور وہ ایک بار بھی کھل کر ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج جہاں زیب بھی چلا آیا تو وہ کچھ دیر کو اسے تنہا پا کر اس تمام قصے کو نپٹانا چاہ رہی تھی جو ابھی ہونا باقی تھا۔ اسے کسی بھی صورت گوارا نہیں تھا کہ جہاں زیب اس کا ہم سفر بنتا۔ وہ کچھ حیرت سے اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔۔۔ دفعتاً" اس کا موبائل بجا تھا۔

"اوہ۔۔۔ بیڈ لک یار۔۔۔!" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے موبائل نکالنے لگا۔

"ہیلو۔۔۔ جی بابا! نہیں، کچھ بھی نہیں، بس آپ کی ہونے والی بہو سے گپ شپ ہونے لگی تھی کہ آپ کباب میں ہڈی بن گئے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شفق کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔۔۔ جہاں زیب بات کرنے کے دوران وقتاً" فوقتاً" ایک والہانہ نظر اس پہ بھی ڈال رہا تھا۔۔۔ پھر شاید کوئی اہم بات تھی کہ وہ چلتے ہوئے گیلری میں چلا گیا۔ شفق ست قدموں سے چلتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ بند کرکے ایک گہرا سانس لے کر اپنی تنہائی کو وجود میں جذب کیا۔

"کتنا خوش تھا جہاں زیب، خلیل سے زیادہ خوب صورت، تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھا۔ لیکن اس نے خلیل کو چاہا تھا۔ اس سے ہی عشق کیا تھا اور اس نے کیا، کیا اس کے ساتھ۔" ہونٹ بھینچ کر اس نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹا تھا۔

"کاش! مجھے خلیل نہ ملا ہوتا۔۔۔ یا پھر میں نے اس سے محبت نہ کی ہوتی یا پھر اتنا بڑا قدم نہ اٹھایا ہوتا۔ اے کاش! امی، ابو نے مجھ پر نظر رکھی ہوتی۔ مجھے روک لیا ہوتا۔"

وہ رو رہی تھی۔ اپنے کیے پہ پچھتا رہی تھی۔ جس کا کوئی حاصل نہیں تھا۔ غلطیوں کے بعد پچھتاوا ہی مقدر بنتا ہے اور اب تو کئی لاحاصل کاش اس کی تقدیر بن گئے تھے۔

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تمہیں بہت اچھی لڑکی مل جائے گی جہاں زیب! خدا کرے تمہیں کوئی بہت اچھا ملے۔ میں بہت بری ہوں۔" وہ مسلسل گریہ کررہی تھی۔ اس نے تصور میں کہتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔ وہ بدنصیب ٹھہری تھی۔

وہ ایک دم جیسے سوتے سے چونکی تھی۔ باہر غیر معمولی شور سنائی دیا تھا۔ وہ جاننے کی غرض سے باہر نکلنے لگی تھی کہ باہر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم جامد کردیے۔

"تین دن سے میں آئی بیٹھی ہوں اور اب تم بیٹی کے کرتوت گنوا رہی ہو۔۔۔ کیسے ہوگئی شفق کی شادی، ہمیں تو نہیں پتا۔" اتنی کرخت آواز تھی۔۔۔ اس نے بلا ارادہ ہی دروازہ مضبوطی سے پکڑا۔

اس کی ماں کس ضبط سے اس کا مقدمہ لڑنے پر تیار ہوئی ہوگی۔ اس پل سوچتے ہوئے اس نے جانے کتنی بار خود کو ملامت کیا تھا۔ ان کا کیا قصور تھا۔ وہ چاہتیں تو اس کی خواہش کا گلا گھونٹ کر آرام سے چلتا کرسکتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی اس کی خوشی کو مقدم رکھ کر ماں ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے پانچ سالوں کی محبت پہ اٹھارہ سالوں کی محبت قربان کردی تھی اور آج ماں کی محبت سامنے آئی تھی کہ اس نے اتنے اہم رشتوں پہ اس کی خوشی کو ترجیح دی تھی۔ اسے خود پہ رونا آیا۔ اپنی قسمت پہ رونا آیا۔ جس نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے جب جہاں زیب چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے ایسی نظروں سے شفق کو دیکھا کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس پل اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں ہمیشہ کے لیے دفن ہوجاتی۔ لیکن ایسا ناممکن تھا۔ جہاں زیب نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

مڑتے وقت اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ جسے چھپانے کے لیے وہ تیزی سے مڑ گیا تھا۔ لیکن وہ دیکھ چکی تھی۔ اسے زندگی میں بے شمار رشتے ملے تھے۔ جن کی اس نے کبھی قدر نہیں کی تھی اور جس کی قدر کی، وہ اسے مٹی میں رول کر چلا گیا تھا۔ یہ اس کی بدنصیبی ہی تو تھی کہ وہ کبھی اچھے برے کی پہچان نہیں کرپائی تھی۔ اس نے پتھر ہوتی آنکھوں سے اس کے قدموں کے نشاں ڈھونڈنا چاہے تھے۔ لیکن آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شفق! تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو۔" عاشی جو کب سے خود ہی بولے جارہی تھی۔۔۔ اس کا دھیان کہیں اور دیکھ کر بے زاری سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ کیا؟" اس نے اپنا اجڑا چہرہ اس کے آگے کیا۔ عاشی نے ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا بات ہے آج؟ کیا نہیں ہوتا رونا... جو آج ہوگا۔" اس کے لہجے میں دنیا جہان کی تھکن در آئی تھی۔ عاشی نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ خلیل کی معیت میں کبھی بھی حنا کا رنگ اس کے خوب صورت ہاتھوں سے نہیں اترتا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا کہ وہ من چاہی بیاہتا ہو کر اجاڑ دی گئی تھی۔ اس کی کیفیت، اس کی حالت، سب ہی رحم اور ہمدردی کا تقاضا کرتے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ اس پورے علاقے میں خلیل کی فیملی کے بعد عاشی کے علاوہ اور کسی بھی آس پاس کے فرد کو اس قصے کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔ کچھ حماد صاحب کے اپنے رویے نے مدد کردی تھی کہ سرد رویے کی وجہ سے کوئی بھی ان سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا تھا۔ خلیل کے باپ نے اپنی فیملی سمیت قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ قیامت تک اس بات کا ذکر باہر نہیں نکلے گا اور رہ گئی عاشی تو... یہ اس کا شفق پہ احسان عظیم تھا کہ اس نے حقیقی معنوں میں دوستی نبھائی تھی۔

"امی نے پھوپھو کو سب بتا دیا ہے۔" وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"اوہ نو... آنٹی نے کیوں یہ سب؟" وہ حد درجہ حیران ہوئی۔

"کیا مطلب؟ ایک نہ ایک دن تو انہیں معلوم ہونا ہی تھا... تو پھر...! روز، روز کے مرنے سے بہتر ہے ایک دفعہ ہی عذاب سہہ لیا جائے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا میں امی کا شکریہ کیسے ادا کروں... یقین کرو عاشی! آج میں بہت شرمندہ ہوں خود سے، اپنے خدا سے، اپنی ماں سے بھی، میں نے بہت غلط کیا۔ جانے خدا مجھے معافی بھی دے گا یا نہیں۔"

فرط جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی۔ آنسو پینے کی کوشش میں وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ عاشی نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور پیار سے اسے ساتھ لگالیا۔

"بس کرو شفو... میں تو ہر پل تمہارے لیے سکون کی دعا مانگتی ہوں۔ صبر اور تمہاری دائمی خوشیوں کی دعا کرتی ہوں۔ مایوس مت ہوا کرو... اللہ سب ٹھیک کردے گا۔" وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن اب برسات کی وجہ سے حبس اور سیلن کی بہتات تھی۔ آسمان بھی جیسے خفا ہو گیا تھا۔ چپ چاپ ویران سا! امی باہر گیلری سے کپڑے اتار رہی تھیں۔

شفق گم صم... اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں کام کرتا دیکھ رہی تھی... باہر ہلکا سا شور اٹھا۔ اس نے امی کو ٹھٹکتے اور پھر سارے کپڑے چارپائی پہ ڈال کر باہر کی جانب لپکتے دیکھا۔ وہ اندازہ نہ کرپائی کہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی مہمان؟ یا کوئی واقف کار... یا پھر خدانخواستہ کوئی بری خبر... اس کا دل معمول سے تیز دھڑکنے لگا۔ وہ باہر جا کر دیکھ سکتی تھی لیکن جانا نہیں چاہتی تھی... وہ نہیں چاہتی تھی کہ باہر جو بھی ہے اس کے سامنے اس کی ماں اسے دیکھ کر دل گرفتہ ہو اور کسی کے معمولی سے استفسار پہ اس کی ذات کا پینڈورا بکس کھلے... وہ کھڑکی سے ہٹ کر یوں ہی الماری کے پاس آگئی۔ الماری کیا کھولی، پرانا جہاں لوٹ آیا تھا۔ وہ چھوٹی سی الماری اس کی زیست کے قیمتی سامان سے بھری پڑی تھی۔

"سرخ، گلابی، نارنجی، آسمانی، دھانی، گولڈن سوٹ، کتنے ہی رنگ پنہاں تھے یہاں جو کسی کی یاد شدت سے دلاتے تھے... اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر نئے سرے سے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ سب سے اوپر والی دراز میں بالکل کونے پر پولی تھن میں پیک وہ تین، چار ٹشو تھے۔ جن میں ان دونوں نے بیتے لمحوں، دنوں کے کچھ لمحے قید کیے تھے۔ ہر سال ویلنٹائن پہ خلیل ٹشو پہ اپنا اور اس کا نام اکٹھا لکھ کر اسے گفٹ کے ساتھ کارڈ کے طور پہ دیتا تھا۔

"ہیپی ویلنٹائن... یا... سوئٹ فرینڈ... مائی گریٹ لو۔" جیسے پیار بھرے الفاظ کے ساتھ اور کبھی اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑ لیتا۔ "شفق خلیل۔"

اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگیں... ہر چیز ہی جیسے قیمتی متاع تھی۔ ان میں کیسی چاہت بھری خوشبو آتی تھی۔ لیکن جس سے یہ سب کچھ عبارت تھا۔ جب وہ ہی بے گانہ ہوا تو... یہ سب بھی اب بے کار ہی تھا... یہ سب اب اس کے لیے اذیت کا باعث تھے۔ اس نے سرخ کانچ کی چوڑیاں نکالیں جو اس کا آخری تحفہ ثابت ہوئی تھیں۔

کچھ دیر نم پلکوں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے لب بھینچ کر پوری قوت سے دیوار پہ دے ماریں۔ پلاسٹک میں نفاست سے سجی چوڑیوں کا چورا ہو گیا تھا۔ اکثر ایک ایک چوڑی توڑ کے اس کے ریڈیم میں اپنی محبت کو تولا کرتی تھی وہ۔

"شفق... تم پر سرخ رنگ اور گلابی رنگ بہت جچتا ہے۔ تمہاری بری کے سارے جوڑے میں سرخ ہی بنواؤں گا اور پلیز یہ چوڑیاں مت اتارا کرو۔" اس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا چورا اپنی ہتھیلی پہ پھیلا لیا۔

"یہ تتلی کتنی پیاری ہے نا خلیل۔" اس کے ہاتھوں میں ایک رنگ برنگی تتلی آزاد ہونے کی کوشش میں اس کی انگلیوں میں مچل رہی تھی۔

"لیکن تم سے زیادہ نہیں ہے۔" خلیل نے اس کے ہاتھوں سے تتلی کو آزاد کروایا اور اسے اپنی طرف گھما لیا۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں کہ اب ان میں ہلکا ہلکا چبھن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسی کتنی یادیں تھیں جو عفریت بن کے روز اس کے دل و دماغ پہ حاوی ہو جاتی تھیں۔

اس نے ایک نظر اپنی ہتھیلی پہ پھیلے کانچ کے ذرات کو دیکھا، پھر ایک جھٹکے سے دونوں ہاتھ... سختی سے آپس میں مسل دیے۔

☼ ☼ ☼

اس کے کمرے میں دستک ہوئی... پھر کوئی اندر بھی آیا تھا... لیکن وہ بستر پہ یوں ہی پڑی رہی۔ آنے والے نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ کھلی ہوئی الماری جا بجا بکھرے ہوئے کپڑے، کچھ کاغذ جنہیں چھوٹے چھوٹے پرزوں میں پھاڑ دیا گیا تھا۔ پرفیوم کی ٹوٹی ہوئی شیشیاں، ہار جس کا ہک توڑ دیا گیا تھا۔ جھمکے، انگوٹھیاں، دیوار کے کناروں پہ مختلف رنگ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے انبار، کمرے کی سب بے ترتیبی اس میں رہنے والے کے ذہنی انتشار کی عکاسی کرتی تھی۔

انہوں نے بے ساختہ لمبا سانس کھینچا اور آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پلنگ کی پائنتی پہ بیٹھ گئے۔

"شفق...! وہ نیم غنودگی میں تھی۔ اسے کوئی اپنا نام پکارتا محسوس ہوا۔ لیکن وہ بدستور لیٹی رہی۔

"شفق..." اب کے آنکھ ذرا سی کھولی تو منظر کچھ واضح ہوا، ایک ہیولہ سا نظر آیا... اس نے پوری قوت سے آنکھیں کھولیں... اور پھر کھولے ہی رکھیں۔

"عمران ماموں۔" لبوں سے سرگوشی میں نکلا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری بیٹا۔" اب کی بار ان کے لہجے میں اتنی نرمی و حلاوت تھی کہ شفق نئے سرے سے کٹنے لگی۔ اس نے بے پناہ شرمندگی سے سر جھکالیا۔ وہ بار، بار ان محبتوں کا سامنا کیسے کرسکتی تھی۔

"یہ کیا ہوا دونوں ہاتھوں کو!" انہوں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ہاتھوں کی لکیریں چھپ گئی تھیں۔ اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو اور پھر ماموں کو دیکھا اور دوبارہ سر جھکالیا۔

"میں تم سے ملنے آیا ہوں شفق..." انہوں نے اس کے دائیں گال کے نیچے ہاتھ رکھ کے اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی مجھے برا بھلا کہنے آئے ہوں گے یہ احساس دلانے کہ میں کتنی بری ہوں۔ اس نے اپنے چہرے سے ان کا ہاتھ نرمی سے ہٹایا۔

"نہیں... بالکل بھی نہیں۔" انہوں نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں... میں بہت بری ہوں... پتا ہے مجھے، پھر کیوں سب میرا تماشا دیکھنے آجاتے ہیں۔" وہ جھٹکے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس پر پھر فرسٹریشن طاری ہو گئی تھی۔

عمران ماموں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ منہ موڑ کر کھڑکی کی جانب چلی گئی کچھ پل کمرے میں خاموشی در آئی۔

"کبھی کبھار ہماری زندگی میں وہ سب ہوتا ہے جو ہم نہیں چاہتے اور جو ہم چاہتے ہیں، وہ ہمیں ملتا نہیں ہے۔ شفق! میں مانتا ہوں بیٹا! کہ تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن تم نے کبھی غور کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا۔۔۔ سوچا ہے کبھی؟ نہیں نا۔" وہ چلتے ہوئے اس کے مقابل آ گئے۔

"اپنی خوشیوں کے لیے تم خود غرض ہو گئی تھیں، اس لیے۔۔۔ تم اپنے پیدا کرنے والے کو بھول گئی تھیں، اس لیے تم اس خدا کو بھول گئی تھیں۔ جس کے بغیر تم سانس بھی نہیں لے سکتیں۔ اب بولو قصور کس کا ہوا۔" وہ چپ رہی۔ وہ مزید بولے۔

"پتا ہے، جب تم چھوٹی سی تھیں تو میں نے برجیس سے کہا تھا۔ اسے مجھے دے دو 'معلوم نہیں کیوں؟'" وہ دھیمے سے مسکرا کے اسے دیکھنے لگے۔ شفق نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ محبت و شفقت کے تمام رنگ تھے۔ اس کے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔

"تم ہو بہو حماد کی تصویر ہو۔۔۔ اسی کی طرح ضدی، غلطی کر کے نہ ماننے والی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنی بیٹی سے بہت محبت کی ہے۔ حالانکہ میری عزیز از جان بہن ساری زندگی تڑپی ہے۔ سسک سسک کے گزری ہے اس کی زندگی اور تم حماد کی بیٹی ہو، لیکن پرورش تو تم نے برجیس کے ہاتھوں پائی ہے نا! میں چاہتا تھا کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی بنا لوں، لیکن کیا کروں، تمہاری ماں کی طرح میری بھی بہت سی خواہشیں تشنہ رہ جاتی ہیں۔"

وہ بولتے بولتے تھوڑے سے دھیمے پڑے۔ شفق بے تاثر چہرے کے ساتھ۔۔۔ فرش پہ جانے کون سے ان مٹ نقوش گھور رہی تھی۔ خاموشی ایک بار پھر۔ اس کمرے کے در و دیوار میں اتر آئی تھی۔

"لیکن ماموں میں۔۔۔" الفاظ حلق میں گویا اٹک کر رہ گئے تھے۔ اس سے آگے بولا ہی نہیں گیا۔

"فی الحال تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ لاہور چل رہی ہو۔ اپنا سامان پیک کر لو۔۔۔ ہم تھوڑی دیر میں نکل رہے ہیں۔"

وہ ارادہ کر کے آئے تھے اور اسے صرف اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ اس نے حیرت سے گنگ ہو کر اپنے کمرے سے جاتے عمران ماموں کی پشت کی جانب دیکھا۔

"میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں؟" وہ جھنجلا کر کھڑی ہو گئی۔ عجیب سی بے چینی تن من میں سما گئی تھی۔ "وہاں جہاں زیب بھی ہو گا اور میں مامی کا سامنا کیسے کروں گی۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ آہٹ پہ مڑ کے دیکھا۔ امی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھیں۔ بے تاثر، سپاٹ چہرے کے ساتھ۔

"تمہارے ماموں انتظار کر رہے ہیں۔ جلدی سے تیاری کرو۔" وہ کہہ کر واپس مڑ گئیں اور اس پر گویا کسی نے منتر پھونک دیا۔ ٹرانس کی سی کیفیت میں اٹھ کر الماری کے نچلے حصے میں ٹھونسے ہوئے شاپنگ بیگ نکال کر استعمال کے دو، تین جوڑے ڈالے، پیروں میں جلدی سے چپل ڈالی اور واش روم جا کر منہ اچھی طرح دھونے لگی۔ وہ باہر نکلی تو ماموں سراپا انتظار تھے۔

اس کے سارے بہن، بھائی ایک جگہ کھڑے اسے الوداع کرنے کو تیار تھے۔ امی کا چہرہ تمام جذبات سے عاری تھا اور وہ دھیمے سے انداز میں ماموں سے باتیں کر رہی تھیں۔

"اچھا خدا حافظ، اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا، پریشان بالکل مت ہونا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اب امی کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے تسلی دے رہے تھے۔

"چلو بیٹا۔" وہ اسے اشارہ کرتے ہوئے بڑھ گئے۔

اس نے ایک نظر امی کو دیکھا۔

"امی۔۔۔"

"جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔" وہ مڑ کر اندر چلی گئیں۔

"کاش۔۔۔" اس نے بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کی طرف مڑی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سب سے ہاتھ ملایا تھا۔ پیار کیا تھا سب کو۔ اسے رونا آ رہا تھا اور ضبط کی شدت سے آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ مہرانو دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔

"میرے ماں، باپ کو وہ خوشیاں لوٹا دینا مہرو! جو میری ذات نے کشید کر لی ہیں ان سے۔ تم انہیں وہ سب بھلا دینا۔ اپنی حفاظت کرنا اور خود کو کبھی زمانے کے ہاتھوں نیلام نہ ہونے دینا، سمجھ رہی ہو نا۔"

وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھرتے ہوئے بولی۔ مہرو نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ دھول اڑاتی گاڑی میں کہیں دور شفق کی زندگی کا باب یہاں کی فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوا تھا اور پیچھے دھول کے چھٹنے سے ہر منظر صاف و شفاف ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تخلیق کا مرحلہ کتنا دشوار ہوتا ہے۔"

وہ یہاں رہتے ہوئے اس تمام عرصے کے دوران جان پائی تھی۔ حمل سے لے کر پیدائش تک وہ کن آزمائشوں سے گزرتی آئی تھی۔ یہ بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اس سب کے بعد تو ماں اور شدت سے یاد آئی تھی۔ اسے اس گھر میں رہتے ہوئے مامی کی کٹیلی اور نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کبھی ان کو دھیمے لہجے میں بولتے سنا ہو یا کبھی کوئی بات پیار سے کی ہو۔ اپنے باپ کے گھر میں رہتے ہوئے وہ اس کے لیے پھوپھو ہی تھیں اور اب اس وقت جبکہ ماموں اس کے لیے مضبوط سہارا تھے تو وہ صرف مامی تھیں بس۔

"ہونہہ گندگی کی پوٹ۔ ہمارے گھر میں لے کر دھر لیا۔" وہ جہاں جہاں سے گزرتی۔ مامی اگر قریب میں ہوتیں تو اسے کچھ اسی قسم کی بڑبڑاہٹیں سننے کو ملتیں۔

زندگی اس کے لیے اجیرن ہو گئی تھی یا خود اس کی دلچسپی جینے میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو بس مشینی انداز میں اپنے وجود میں پنپنے والی جان کو سانس دے رہی تھی۔ ان نو مہینوں میں کون سا ایسا لمحہ تھا۔ جس میں اس نے اس دشمن جاں کو نہ سوچا ہو۔۔۔ حیرت سے، نفرت سے، بے بسی سے، اکثر راتوں کو وہ اس کے تصور سے شکوے کرتے تھک جاتی تو ہار کر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اس گھر میں صرف ماموں ہی ایسی شخصیت تھے جنہیں اس کی بے پناہ فکر تھی۔ وہ اس کا حال احوال باقاعدگی سے پوچھتے، اسے لے کر باہر واک پہ نکل جاتے اور اس کی خاطر مامی کی جلی کٹی بھی سن لیتے۔

"بیٹا بڑی ہیں۔ تم اگنور کر دیا کرو۔" وہ ماموں ہی تھے جو اس کی جمود زدہ زندگی میں کچھ ہلچل کا سبب بنے تھے۔ ورنہ جہاں زیب تو کب کا اس کی آمد کا سن کر کہیں نکل گیا تھا۔ اتنا عرصہ کسی بھی سزا کو کاٹنے کے لیے کم نہیں ہوتا۔ ہاں اس نے غلطی کی تھی۔ جس کا خمیازہ اب اپنوں کی بے رخی کی صورت میں بھگت رہی تھی۔

آج اسپتال میں اسے ایڈمٹ ہوئے تیسرا دن تھا۔ بیتے لمحوں کو، گزرتے دنوں کو وہ لمحوں میں سوچ سکتی تھی۔ سب ایک سے گزرے تھے اس کے لیے، پرخار، پرپیچ، مثل عذاب، آنسو ایک تواتر سے بہتے ہوئے اس کا تکیہ بھگو رہے تھے۔

بچے کی رونے کی آواز اسے واپس حال میں کھینچ لائی تھی۔ اس نے سرعت سے اپنے پہلو کی جانب دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اس نے بے چینی سے اوپر نگاہ اٹھائی تو دھک سے رہ گئی۔

جہاں زیب حسن کو بازوؤں میں لیے ہوئے تھا۔

"یہ کب آیا اور یہاں۔۔۔" وہ اضطراب سے نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"یہ کب سے رو رہا تھا، تم شاید ہوش میں نہیں تھیں۔" آہستگی سے کہتے ہوئے اس نے حسن کو اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے احتیاط سے تھام لیا۔ شفق نے غور کیا۔ اس کے لفظوں میں طنز کا کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن وہ اس سے بالکل نارمل رویہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ بات حیرت کی متقاضی تھی۔

"تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔" "پرائیویٹ اسپتالز میں اکثر بے بیز کڈ نیپ (اغوا) ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر "میل بے بی" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ اس نے حسن کے ننھے سے ہاتھ میں اپنی انگلی ڈالی۔۔۔ جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر رہ گئی۔ جہاں زیب نے مڑ کر اس بھرپور منظر کو دیکھا۔۔۔ اس کے چہرے پہ ایک ملال سا آ کے گزر گیا۔

"پیشنٹ نمبر 25۔۔۔!" "آپ اپنا سامان پیک کرلیں۔۔۔ آپ کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔ کون لینے آرہا ہے آپ کو؟" دروازے پہ ایک کرخت چہرے والی نرس بلا تکان اطلاعیہ بول رہی تھی۔ جب ہی اس کی نظر سائیڈ پہ کھڑے جہاں زیب پہ پڑی۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ ہزبینڈ ہیں ان کے؟" اچانک اس سوال پہ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ شفق نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر واپس نرس کی طرف مڑ چکا تھا۔

"جی میں ہی ہوں۔" شفق کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ نہ معلوم اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔

"آئیں آپ، ڈسچارجنگ شیٹ پر دستخط کردیں اپنے۔"

وہ واپس پلٹ گئی۔ جبکہ جہاں زیب ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شفق کو دیکھا۔۔۔ حسن کو سینے سے لگائے ہوئے بھینچے ہوئے ہونٹ، سخت شرمندگی سے سرخ ہوتا چہرہ، یہ زندگی اس کے لیے کیسی آزمائش بن گئی تھی۔

جہاں زیب کے جانے کے بعد اس نے حسن کو بیڈ پہ لٹا کے کچھ فاصلے پہ موجود کاٹ پر پڑی اپنی چادر کو اٹھایا اور آہستگی سے اسے اپنے گرد پھیلانے لگی۔ وہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لائی تھی۔ حسن جب پیدا ہوا تھا تو عمران ماموں کے علاوہ کوئی اپنا اس کے پاس موجود نہیں تھا۔

کتنی دیر گم صم سی ہو کر حسن کا معصوم سا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ ہو بہو خلیل کے جیسا تھا۔ آنکھ، کان، ہونٹ، ناک، غرض کیا چیز تھی جو خلیل سے مشابہ نہیں تھی؟ صرف اسے جنم اس نے دیا تھا اور وہ خلیل کا بیٹا تھا۔ بس اس کا نام ماموں نے اپنی پسند سے رکھا تھا حسن۔

"تم تیار ہو تو چلیں۔"

وہ سوئے ہوئے حسن کے چہرے کو دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے جہاں زیب کی آمد کی بھی خبر نہیں ہوئی۔

"جی۔۔۔؟" اس نے خفت سے سر جھکایا اور حسن کو گود میں بھر لیا۔۔۔ اس پر نقاہت سی طاری تھی اور اتنی جلدی وہ چل نہیں سکتی تھی۔ جہاں زیب نے اس کے چہرے پہ پھیلے تکلیف دہ تاثرات کو دیکھا اور حسن کو اس کی گود سے لے لیا۔

"میں اٹھا لیتی ہوں۔" وہ کمزور سی نحیف آواز میں بولی۔

"اٹس اوکے۔۔۔ تم ایزی ہو جاؤ۔" سیدھے ہاتھ کے حلقے میں حسن کو لیے اور دوسرے ہاتھ سے شفق کو پارکنگ ایریا تک لاتے اس منظر میں صرف دیکھنے کی حد تک رعنائی تھی۔ حقیقت میں دونوں کے درمیان کتنے فاصلے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ گھر آگئی تھی۔ لیکن مامی ابھی تک مروتاً بھی اسے پوچھنے نہیں آئی تھیں۔ دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کے اپنے بھی اسے پوچھنے نہیں آئے تھے۔ خیریت تو درکنار۔۔۔ امی کو تو کم از کم آنا چاہیے تھا۔ اس کے دل میں ملال آ کے ٹھہر گیا۔ وہ جوں جوں سوچتی، بوجھ بڑھتا جاتا۔ اسے شدت سے وہ سب پرانی باتیں یاد آتی تھیں جو اب قصہ پارینہ ہو چکی تھیں۔ واحد ماموں ہی اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود تھی تو ان کی شفقت اور مہربانی کی وجہ سے۔

جہاں زیب اس دن کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔ یا وہ ہی کمرے سے باہر نہیں جاتی تھی۔ اس دن ماموں کے ساتھ واک کرتے ہوئے اس نے واکر میں سوئے ہوئے حسن کو دیکھا۔ اس معصوم کا مستقبل کیا تھا؟ خود اپنے بارے میں بھی وہ لاعلم تھی۔ جانے قدرت اب اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنے والی تھی۔ ماموں نے اس کی عدم توجہی محسوس کرلی تھی۔ انہوں نے گہرا سانس فضا میں خارج کیا۔

"شفق۔۔۔" اپنے نام کی پکار پہ وہ چونکی۔

"جی ماموں۔"

"کہاں ہو بیٹا۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"یہیں ہوں۔"

"میں کہہ رہا تھا، جہاں زیب چھٹیوں پہ آیا ہوا ہے۔ کوئی دن مقرر کر کے سادگی سے تم دونوں کا نکاح ہو جائے تو مجھے بھی کچھ سکون میسر ہو۔"

شفق کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا۔

"ماموں! آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

"جلدی۔۔۔! میں نے کب جلدی کی ہے۔ اتنا عرصہ تمہارے سوچنے کو کافی نہیں تھا کیا۔" وہ پریشانی سے گویا ہوئے۔

"وہ سب ٹھیک ہے ماموں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔" وہ منمنائی۔

"بس شفق! یہ تمہاری بے وجہ کی ضدوں کا نتیجہ ہے کہ تم آج اس حال تک پہنچی ہو۔ بر جیس سے وعدہ کر کے آیا تھا۔ وہ تمہیں پھر سے آباد دیکھنا چاہتی ہے۔ تمہیں میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی ہی سمجھا ہے اور تم جہاں زیب کی بھی خوشی تھیں۔"

آخری جملہ سرگوشی میں ادا کیا گیا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔

"جہاں زیب کی تم فکر مت کرو، وہ تم سے شادی پر راضی ہے، تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے اسے مجبور کیا ہے۔ وہ اب بھی خوشی خوشی یہ رشتہ نبھانے کو تیار ہے۔ اب جتنا سوچنا ہے بس آج کل میں سوچ لو۔ میں جمعے کو شادی کر رہا ہوں تم دونوں کی۔"

وہ کہہ کر رکے نہیں اور وہ پھر سے جیسے اکیلی ہو گئی۔ شادی کر رہا ہوں۔ انہوں نے کتنے آرام سے کہہ دیا۔ یہ کوئی آسان ہے، کتنی مشکل سے وہ سنبھلی تھی۔ لیکن یہ ایک اور دھچکا لگنا ضروری تھا کیا اور وہ بھی جہاں زیب نہیں، نہیں۔۔۔ میں اتنے پیارے اور اچھے انسان کے قابل نہیں ہوں۔ اسے بھی خوشیوں کا حق ہے۔

"ماموں! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئی۔

"تم جہاں زیب کی خوشی تھیں۔" انہوں نے ماضی القریب کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ یعنی اب وہ! وہ اچھی طرح اپنی نئی آنے والی زندگی جان سکتی تھی۔ اس نے تھک کر واکر میں لیٹے ننھے حسن کو دیکھا۔ وہ بے فکری سے محو خواب تھا۔ اس کے مرمریں ہونٹوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آٹھہری۔

"تمہارا کیا قصور، جو سزا بھگتنے کو ماں کے سنگ آگئے ہو۔ تم کیا جانو، تمہاری زندگی کتنی بے کیف گزرنے والی ہے۔" وہ اس کے ننھے منے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

زندگی میں کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور حالات دوسروں کے رحم و کرم پہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس کیفیت سے بارہا گزری تھی اور گزر رہی تھی۔

پچھتاوے سے بڑھ کر کوئی آباد نہیں
جب دل لگاتے ہیں تو رویا نہیں کرتے

اس نے لرزتے ہاتھوں سے نکاح نامے پہ سائن کیے اور بے ترتیب ہوتی دل کی دھڑکنوں پہ قابو پانے لگی۔

وہ اس اجنبی کمرے میں اکیلی تھی۔ شادی پہ سوائے امی اور اس کے بہن، بھائیوں اور چند ایک مہمانوں کے کوئی نہیں تھا۔ کوئی بارات اس کے لیے نہیں اتری تھی۔ نہ مہندی، نہ مایوں، اسے بس ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔

اپنی پہلی شادی کی طرح اسے دوسری شادی پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ دونوں بار کتنی مماثلت تھی۔ اس وقت بھی اس نے ہاتھوں پہ مہندی نہیں لگائی تھی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب بھی وہ سلیٹ کی مانند کورے تھے۔ اس نے اپنی سفید ہتھیلیوں کو دیکھا۔

اب کی بار بھی وہ باپ کے دست شفقت سے محروم رہی تھی۔ حماد نہیں آئے تھے۔ انہوں نے تو اسی روز شفق سے ہر ناتا توڑ لیا تھا۔

"آخر میرے مقدر میں محرومیاں ہی کیوں درج ہیں؟" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھانے لگی۔

پہلی شادی پر وہ ان چھوئے جذبوں کی مانند کنواری تھی اور دوسری دفعہ وہ ایک بچے کی طلاق یافتہ ماں تھی۔

اس نے سوچا دونوں بار اتنی مشابہت بھی نہیں تھی۔ پہلی بار وہ بہت خوش تھی اور دوسری بار۔۔۔

"یا اللہ۔۔۔!" کھٹکے کی آواز پہ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ قدموں کی چاپ اس کے قریب آکر رک گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کے سامنے دیکھا۔ پھولوں کا ہار نیچے کارپٹ پہ ٹوٹا پڑا تھا اور وہ اب شیروانی اتار رہا تھا۔ ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی۔

بے پناہ خوب صورتی و حسن کا وہ مجسمہ اس کے لیے سجایا گیا تھا۔ معصومیت اس پہ ختم تھی۔۔۔ لیکن کیا فائدہ' وہ یہ معصومیت کسی اور کو دان کر آئی تھی۔۔۔ اب تو بس عکس ہی رہ گیا تھا۔ خود وہ کون سا دل سے راضی ہوا تھا۔

اگر وہ مکمل اس کی بن کے آتی تو وہ کتنا شان دار استقبال کرتا اس لڑکی کا جو نہ جانے کتنے برس سے اس کے دل میں بستی تھی۔ اس نے نامعلوم حسرت سے اس کی جانب دیکھا جو شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"اب کس کے انتظار میں بیٹھی ہو۔" بجھے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں لیٹا۔ یوں کہ اگر وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھوتا تو اسے کوئی دقت نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنا بایاں بازو آنکھوں پہ رکھ چکا تھا۔

شفق کے اندر امید کا آخری دیا بھی مدھم ہوا۔ وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاؤں نیچے ٹکاتے ہی پائل کے گھنگرو مدھر تان سے بج اٹھے۔ جہاں زیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خجالت سے جھک کر پائل اتارنے لگی۔

"آپ فارغ ہو جاؤ تو پلیز کمرے کی لائٹ بھی آف کر دینا۔ میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

اس کی سرد و سپاٹ آواز گونجی اور اس کی ذات کے گرد اداسی کا گھیرا ہو گیا۔ اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ سب تو ہونا تھا مسلسل' ہمیشہ' وہ ان سب رویوں کی عادی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بس کر دو جی۔۔۔ ہمارا ہی گھر رہ گیا تھا اس بوجھ کو ڈھونے کے لیے۔" وہ باہر آ رہی تھی کہ ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ فریدہ مامی' ماموں پہ برس رہی تھیں۔

"بس خاموش' اب وہ ہماری عزت ہے' میں کب سے تمہاری یہ بکواس سن رہا ہوں' اب مزید نہیں سنوں گا۔" ماموں دبی آواز میں غرائے۔

"ہونہہ! بدکردار لڑکی' ماں' باپ کی عزت لٹا کے اب ہمیں نوچنے کو تیار ہے ڈائن' میرے بیٹے کی خوشیاں کھا گئی۔ کم بخت۔" وہ بدستور شعلے اگل رہی تھیں۔

"وہ میری ہی بھانجی نہیں' تمہاری بھی بھتیجی ہے۔ تف ہے تم لوگوں پہ۔۔۔ آج تک رشتوں کی قدر نہیں کی تم دونوں بہن بھائیوں نے۔ دنیا جہان کے خودغرض انسان ہو تم لوگ۔"

ماموں کی سرد و سپاٹ آواز آئی اور وہ ساتھ ہی باہر نکلے۔ شفق کچن کے دروازے پہ کھڑی تھی۔ ناخنوں کو کھرچتی ہوئی۔ عرق ندامت سے سر جھکائے' غیر مرئی نقطوں کو گھورتے ہوئے۔ انہوں نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

جہاں زیب سے چھوٹا اریب ہاسٹل سے چھٹیوں پہ گھر آیا ہوا تھا اور وہ اس سارے قصے سے قطعی لاعلم تھا۔ شفق حسن کو لٹا رہی تھی جب وہ اس کے پاس

آیا۔

"ہیلو شفو آپی۔۔۔! آپ کب آئیں۔" وہ خوشگوار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کے خیال سے شفق کی موجودگی محض چند دنوں کے لیے رہنے کی غرض سے تھی جبکہ وہ جانتا تھا کہ شفق بچپن میں کبھی ایک دفعہ بھی ان کے دولت کدے پہ نہیں آئی تھی ہر موقع پر تہوار پہ انہیں ہی جانا پڑتا تھا۔

وہ کچھ الجھا ہوا سا لگ رہا تھا شاید اس قصے کی تھوڑی بہت بھنک اسے بھی پڑی تھی لیکن مفصل نہیں۔

"بیٹا اب یہ یہیں رہیں گی۔ تمہاری بھابھی جو بن گئی ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتی۔ ماموں نے بیچ میں آکر دخل دیا۔

"واٹ۔۔۔!" اریب ناسمجھی سے ان کی شکل دیکھنے لگا۔

"یو مین پاپا۔۔۔! بھیا کی شادی وادی۔" وہ اٹک اٹک کر بولا تو وہ مسکرانے لگے۔

"دس از ناٹ فیئر پاپا۔ بھیا کی شادی اور مجھے بلانا تو کیا بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا آپ نے۔"

وہ سمجھ آنے پہ کچھ حیرت اور پھر صدمے سے گنگ ہوتے ہوئے بولا۔

شفق باری باری دونوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ جب ہی اس کی نظر حسن پر پڑی ایک بار بے دھیانی سے دیکھنے پر دوسری بار وہ چونک کے مڑا۔

"واؤ۔۔۔ کول ہو از دس۔" وہ چلایا۔ اب وہ ننھے حسن کو کاٹ میں سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں زیب کی طرح وہ بھی بچوں کا دیوانہ تھا۔

"تمہارا بھتیجا۔۔۔" ماموں سکون سے بولے جبکہ اریب کا سکون اڑنچھو ہو گیا۔ وہ دوبارہ ہونق بن گیا۔

"پاپا! آپ کو میں ہی بے وقوف نظر آ رہا ہوں جو کسوٹی کسوٹی کھیل رہے ہیں۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

"بھتیجا۔۔۔ واٹ آ جوک۔۔۔؟" وہ ہنسنے لگا۔

"ہاں اریب۔۔۔! بھتیجا۔ بونس میں ملا ہے تمہارے بھائی کو بیوی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی جہیز میں مل گیا۔ ہمیں کاہے کو فکر۔ دونوں باپ بیٹا لاوارث اولاد کو گلے لگاتے پھریں یا یتیم خانہ کھولیں۔ چلو تم ادھر کیا کر رہے ہو بے کار میں۔" فریدہ مامی کچن سے بولتی ہوئی پاس آ رکیں۔ اسکواش کا گلاس اریب کو تھمایا وہ اب بھی اچنبھے سے شفق کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سراسیمہ سی نظریں چرا رہی تھی۔

اریب دوبارہ تو اسے پوچھنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً "یہ سب مامی ہی کی عنایات تھیں۔ شادی کے دو چار دن بعد ہی جہاں زیب واپس اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اریب بھی واپس ہاسٹل چلا گیا تھا۔ رہ گئے ماموں وہ صبح ہی اپنے دفتر نکل جاتے تھے۔ مامی سے اسے کسی مہربانی کی امید نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ انہوں نے کام والی ماسی' باورچن یہاں تک کہ دھوبی کی چھٹی کر دی تھی وہ آہستہ آہستہ گھر کے تمام امور انتظام اپنے ہاتھ میں لیتی گئی۔ تین بندوں کا کتنا کام ہو سکتا تھا پھر رات کو وہ ہوتی اور ننھا حسن یا پھر اس کی سکوت بھری تنہائی۔ حسن کو دیکھ کر اس کے زخم روز ہی ادھڑا کرتے تھے۔

اسے شفق جہاں زیب ہوئے بھی سال بیت گیا۔ اریب اس دوران دو دفعہ آیا تھا لیکن اس کی سرد مہری کسی بھی فاصلے کو پاٹنے میں رکاوٹ بن جاتی تھی سو ایک اور رشتے کی کمی بے مول زندگی میں۔ وہ دکھ سے سوچے جاتی۔

اس دن وہ حسب معمول آٹھ بجے ہی اٹھی تھی' صبح سویرے نماز قرآن پڑھ کر وہ ناشتا وغیرہ بنا کے سو جاتی تھی پھر آٹھ بجے ہی اٹھتی تھی۔ باہر غیر معمولی سا شور اٹھا تھا۔ مامی زور زور سے بولتی ہوئی کسی بات پہ استفسار کرتے ماموں۔۔۔

"یا اللہ خیر۔۔۔!" وہ دہل کر اٹھی۔ دوپٹا اپنے گرد لپیٹا اور باہر کی جانب لپکی دروازے تک پہنچتے' وہ کسی سے ٹکراتے بچی تھی۔ آنے والے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ سال ہو گیا تھا اسے دیکھے بھی وہ جہاں زیب ہی تھا چہرے پہ سفر کی تکان لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک کاندھے پہ سفری بیگ دروازے پہ کھڑی حیران شفق کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ نیند سے سرخ ہوتی آنکھیں بوجھل پن کے باعث سوج جانے والے پپوٹے اردگرد بکھری اس کی وہی ازلی شرارتی لٹیں جسے اس نے آنچل کی صورت ڈپٹ کر سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ پھر بھی چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔ چند لمحے تو وہ شفق کی اس من موہنی صورت میں کھویا رہا۔

"کیا سکتہ ہوگیا ہے مجھے دیکھ کر۔" اس نے ذہن جھٹک کر شفق کے آگے ہاتھ ہلایا۔

شفق ہوش میں آئی دونوں کا سحر ٹوٹ گیا۔ شفق جیسے ادھورے خواب سے پلٹ آئی تھی اس کے لب نیم وا ہوئے لیکن کچھ سوچ کر وہ چپ ہو رہی اور راستہ دے کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر پہلے کا طلسم جیسے ٹوٹ سا گیا تھا۔ جہانزیب نے نظر چراتے ہوئے اس کے ترشے ہوئے یاقوتی لبوں کو دیکھا جو کچھ کہنے کی حسرت میں نامعلوم تنبیہہ کے باعث باہم پیوست ہوگئے تھے۔

الماری سے کپڑے نکال کر وہ واش روم میں گھس گیا تھا وہ واپس آیا تو شفق تولیہ لیے اسی کی منتظر تھی۔

"کیسی ہو....؟" مختصر پوچھا۔

"ٹھیک....!" مختصر ہی جواب آیا۔

وہ باہر نکل آئی۔ سامی آج خود کچن میں گھسی ہوئی تھیں اور مسلسل اسے سنائے جا رہی تھیں۔ ایک سال میں کچن کو اس نے اپنے مطابق سنوارا تھا اور اب مامی کا اس پر غصہ بجا تھا انہیں کسی بھی چیز کو لینے کے لیے سارے کیبنٹس ٹھکا ٹھک کئی بار کھولنے اور بند کرنے پڑتے تھے۔ اس سے وہ سخت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔

ناشتے کے بعد جہانزیب کسی ضروری کام سے نکل گیا تھا اسے افسوس ہوا کہ وہ دوبارہ اسے پوچھنے تک نہیں آیا اور ماموں کہتے ہیں کہ وہ بخوشی یہ رشتہ نبھا رہا ہے۔ کچھ دیر وہ یونہی آلکسی سے پھرتی رہی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود جہانزیب سے توقع کیے ہوئے تھی جبکہ یہ سوچ تو اس کی اپنی ہی تھی کہ اس نہایت اچھے انسان کو بھی اپنے حصے کی خوشیاں پانے کا حق ہے۔ کیا معلوم اس نے کہیں شادی کر رکھی ہو؟ اس سوچ کے آتے ہی وہ کتنی دیر گم صم رہی۔ چلو اچھا ہی ہوگا۔ میری اذیت کچھ کم ہو، یہ اس کی شرافت ہی ہے کہ مجھے نام دے کر عزت کی چھت بھی دے دی۔

اس کا ضروری کام پھر سے طویل ہوگیا تھا اور لاشعوری طور پر شفق کی سماعتیں اس کی آہٹوں کی منتظر رہنے لگیں۔ حیرت انگیز طور پر وہ اب پرسکون رہنے لگی تھی۔ اب نہ تو اسے پچھتاوے ستاتے تھے اور نہ خلیل کی بےوفائی سلگاتی تھی وہ اسے بھول کر انجان بن جانا چاہتی تھی۔ شاید اس سب کی وجہ حسن تھا۔ وہ نیا نیا چلنا سیکھا تھا سارا دن اس کے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ کوئی چیز اس کے ہاتھ آجاتی تو اس کی درگت بننا لازمی تھی اسے مامی کی باتیں بھی ناگوار نہ گزرتیں اور بھی کتنی باتیں تھیں جنہوں نے اسے ایک الگ دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔

جہانزیب صبح کا گیا شام یا اکثر رات کو آتا تا۔ کھانا بھی جانے کہاں کھا کے آتا تھا۔ اسے تو وہ ہمیشہ نفی میں ہی جواب ملا کرتا۔ مامی کو بیٹھے بٹھائے اکثر اس پہ تاؤ آجاتا تو وہ ہسٹریا کے مریض کی طرح چلا چلا کر اس کے قصور گنوائے جاتیں اور پھر اسی کی بنائی ہوئی چائے گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنے ہی شروع کیے قصے کا سدباب کیا جاتا۔ شفق چابی لگی گڑیا کی طرح یہاں سے وہاں سب کام سمیٹتے ہوئے حسن کو بہلاتے ہوئے ماموں کا انتظار کرتی۔ جہانزیب کا انتظار تو بے سود تھا وہ اسے پوچھتا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو انجان اور غیر مرئی مخلوق محسوس کرتی۔ گھر میں سوائے ماموں کے کسی کو اس کی موجودگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن ماموں نے اسے جا لیا۔

"ایسا کب تک چلے گا بیٹا۔"

"کیا ماموں جان؟" وہ نا سمجھی سے بولی۔

"تم اس سے اجنبی وہ تم سے انجان۔ کہاں سے لگتا ہے کہ تم دونوں میں سرے سے کوئی رشتہ ہے۔ اگر وہ کترا رہا ہے بیٹا تو تم اپنے درمیان موجود اس رشتے کو بحال کرو۔" شفق خفت سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"دیکھو شفق! میاں بیوی کے رشتے میں تو ایسی ساجھے داری ہوتی ہے جو دنیا کے کسی رشتے میں نہیں ہوتی۔ ہمارا مذہب یونہی تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس نہیں کہتا۔ لیکن کبھی کبھار دو دماغ ایک جیسا سوچنے لگتے ہیں تو مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اب تم دونوں ہی ایک دوسرے کی پہل کے منتظر ہو اور میں کہتا ہوں کہ پہل کرنا تمہارا فرض ہے بیٹا۔ کیونکہ اس قصے کا مرکزی کردار تو تم ہی ہو۔ اب تم اپنے کردار سے کیسے انصاف کرتی ہو، یہ تم پر منحصر ہے۔" وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

ماموں اکثر و بیشتر ایسی نصیحتیں کرتے رہتے تھے لیکن اب اس کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ دوریوں کو سمیٹنے میں صرف ایک قدم درکار تھا چاہے وہ اس کا ہو یا جہانزیب کا۔

رات میں جب وہ واپس آیا تو اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ اسے اچنبھا تو ہوا لیکن خاموش رہا۔

"کھانا کھائیں گے؟" روزانہ کا سوال۔ جہانزیب نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میں نے کہا تھا شفق! تم تکلیف نہ کیا کرو۔ میں کھانا کھا کر آتا ہوں۔" وہ سادگی سے بولا۔ شفق اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"لیکن میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" کچھ توقف کر کے وہ آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں جھکا گئی۔ اب حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میرا....؟" انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "لیکن کیوں....؟"

"مجھے کچھ کہنا تھا۔" جہانزیب اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"جہانزیب! آپ کو معلوم ہے کہ میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی امی اور ماموں کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوگئی۔ لیکن میں قطعی نہیں چاہتی تھی کہ آپ کی دل آزاری ہو۔ آپ آزاد ہیں جہانزیب! آپ چاہیں تو اپنی پسند سے دوسری شادی کرلیں.... میں...."

"ایک منٹ....!" وہ بے ساختہ ٹوک بیٹھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنا الٹا سیدھا سوچ رہی تھی اس کے بارے میں۔ اب اسے بہت غصہ آرہا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ یہ شادی میں نے مجبوراً" یا کسی کے کہنے پہ کی ہے اور آزاد کرنے والی مجھے.... تم ہوتی کون ہو؟ شفق بی بی! یہ میری زندگی ہے۔ اسے اپنی مرضی سے گزارنے کا پورا حق ہے مجھے۔ مجھے کیا پسند کرنا چاہیے کیا نہیں اس کے لیے میں تمہارا پابند نہیں ہوں اور دوسری شادی کرنے کے لیے مجھے تم سے اجازت درکار نہیں ہوگی۔ میں اپنے ہر معاملے میں آزاد ہوں....! رہ گئیں تم.... ہاں۔ مجھے دکھ ضرور ہوا تھا جو کچھ تم نے کیا اس پر۔ میں اس وقت سے تمہارا نام اپنے نام کے ساتھ سن رہا ہوں جب میں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ لیکن تم میری قسمت نہیں تھیں شاید۔ اور اب کی تم بات کرتی ہو تو.... تم سے میں نے ہمدردی میں شادی نہیں کی ہے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"کیونکہ تم میری دعا رہی ہو۔ دعاؤں کو بے قدر نہیں کیا جاتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ میری ذات سے تمہیں کوئی سکھ نہیں پہنچا۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کوئی دکھ بھی نہیں دیا شفق....!" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے وہ نرمی سے بولا تھا۔

شفق کا سارا وجود جیسے بے جان ہوگیا۔ وہ بغیر پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی جسے اس کا نصیب بنا دیا گیا تھا اور جسے اس نے نصیب بنانا چاہا تھا وہ سراب نکلا۔ آنسو بے اختیار ہی امڈ آئے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ کس بات سے اسے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ کوئی پچھتاوا نکل آیا تھا یا کوئی دکھ ابھر آیا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ یہ وہ آج جان چکی تھی، اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے چاہتا بھی نہیں تھا شاید یہی کرب اسے توڑ دینے کو کافی تھا کہ وہ اب اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے رام کرنا چاہتی تھی۔ معافی مانگنا چاہتی تھی، خود پر سے یک دم اختیار کھو بیٹھی تو اس کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

"مجھے معاف کردیں جہانزیب! میں نے بہت برا کیا اپنے ساتھ اور آپ کے حق میں بھی۔ مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں ہیرے اور پتھر میں تمیز نہیں کرپائی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آج ایک بار پھر اس نے اپنی بربادی پر صف ماتم بچھائی تھی۔ ایک بار وہ خلیل سے بچھڑنے پہ یوں روئی تھی اور آج وہ اسے کھو دینے کے ڈر سے رو رہی تھی۔

"یہ... یہ کیا کررہی ہو تم...!" وہ کرنٹ کھا کے دور ہٹا۔ شفق نے اس کے پیروں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں ہٹا لینے سے وہ اس سہارے سے بھی محروم ہوگئی۔ "پاگل ہوگئی ہو شفق۔" وہ حواس باختہ سا اسے زاروقطار روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شفق نے بے ساختہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں بہت بے مایہ ہوں۔ اپنی ماں کا نصیب لے کر دنیا میں آئی ہوں۔ انہوں نے بھی کبھی خوشیاں نہیں دیکھیں تو میں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ لیکن جہانزیب میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ یوں نہ اذیت دو مجھے ایسے بے آسرا مت کرو۔ میں نے جو نادانی کی ہے تم اس کی سزا نہ دو مجھے۔ پلیز جہانزیب...!"

اب وہ دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھے ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے اس لمحے اس پھول سی لڑکی کو بے انتہا ندامت میں ڈوبا پایا۔ وہ اس کے پاؤں پکڑ کر، ہاتھ جوڑ کر اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے وہ بارہا تصور میں اپنے پاس دیکھ چکا تھا۔ آج وہ مجسم حقیقت بن گئی تھی۔ اس نے خود سے کتنا دور کردیا اسے۔ تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔

وہ جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکلتا چلا گیا۔ شفق نے بھیگی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

دوسری بار بھی مماثلت... وہ جا چکا تھا۔ اور وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا بات ہوئی بھلا...! تمہیں یہاں کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔"

شفق کو معلوم تھا کہ ماموں اس کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد جو فیصلہ کیا، وہ اس کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ سب سے پہلے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنا، پھر جاب کا حصول اور آئندہ آنے والے دنوں میں اپنا بار خود اٹھانے کا فیصلہ تھا۔ جہاں ماموں نے اتنے احسانات کیے وہاں یہ چند سال اور احسان کردینے سے ان پہ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آخر کار اس نے خود غرضی سے سوچا تھا۔

ماموں اب اس کے لیے اب واحد سائباں رہ گئے تھے۔ جہانزیب سے مزید کوئی توقع رکھنا بے وقوفی تھی۔ اس نے جتنا سوچنا تھا ان چند دنوں میں سوچ چکی تھی۔ بہرحال وہ جہانزیب کو مزید مشکلات میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ سے جہانزیب کی ذات پہ جو خاموشی کے دبیز سائے چھا گئے تھے وہ اسے ان سب سے دور کردینا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں آکے وہ مات کھا گئی کہ ماموں کو اس کا ایسا کوئی فیصلہ منظور نہیں تھا۔ وہ تو اس کی سوچ پہ ہی اچھا خاصا برہم ہوگئے۔

"تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ اگر تم سے مشقت ہی کروانی ہوتی تو یہاں کیوں لے کر آتا۔ وہیں ٹھیک تھیں۔"

وہ طنزیہ بولے۔ ان کی خفگی بجا تھی لیکن وہ بھی مجبور تھی۔ ایسے کسی رشتے کو نبھانا نہیں چاہتی تھی جس سے کسی پہ بوجھ پڑے۔

"ماموں جان! آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ میں فیصلہ کرچکی ہوں۔ آپ مجھ پر زبردستی کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔" وہ حتمی انداز میں کہتے ہوئے رخ موڑ گئی۔ عمران صاحب حیرت و بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے منہ کھولے اسے دیکھتے رہے۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ تمہارے خون میں ہی خود غرضی اور احسان فراموشی شامل ہے۔ جاؤ بیٹا! جو دل چاہتا ہے کرو۔ میرا تو کوئی اختیار نہیں۔ کہو اپنے شوہر سے وہ تمہیں پڑھائے تمہیں اپنے طور پر اسٹیبلش ہونے میں تمہاری بھرپور مدد کرے۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے تو ان کے لہجے میں اجنبیت بھری قطعیت تھی۔

شفق شرمندگی سے نظریں جھکا گئی۔ اس نے حساب لگایا سو آج سے اس کی نہ ختم ہونے والی سزا شروع ہوگئی تھی۔

جہانزیب ہمیشہ کی طرح جانے کہاں غائب ہوگیا تھا وہ کبھی کبھار اپنی بے وقوفی کے بارے میں سوچنے لگ جاتی تھی۔

"آخر کیا ضرورت تھی اس کے سامنے اتنا بے اختیار ہونے کی۔ اس کی مرضی وہ جو کرے، مجھے اس سے کیا۔" رات کافی دیر تک وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ جب وہ اس کا خیال اپنے دماغ سے نکالنے میں ناکام ہوگئی تو تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ "بھاڑ میں جائے جہانزیب اور میری ہمدردی...!" وہ جھنجلا کر کہتے ہوئے کروٹ بدل گئی۔

☼ ☼ ☼

بہت عرصہ گزرا اس نے شفق کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد پڑتا تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب اس کا کوئی دن شفق کو یاد کرتے اور کوئی رات اسے سوچے بغیر نہ گزرتی تھی۔ پاپا نے بچپن سے ہی ازبر کروادیا تھا۔

"بیٹا! یہ تمہاری کزن ہے اور فیانسی بھی۔"

وہ اس وقت پانچویں کلاس میں تھا۔ اور پاپا کے مراسم اپنی اولاد سے ہمیشہ دوستانہ رہے تھے۔ وہ اس عمر میں تو بالکل باربی ڈول ہی لگتی تھی۔ جہانزیب اکثر اسے دیکھنے لگتا تو اردگرد سے بھی بیگانہ ہوجاتا تھا۔ بعد میں اپنی اس کیفیت پہ خوب جھنجلاتا تب اس نے دانستہ وہاں جانا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی باربی ڈول اس سے دور ہوگئی۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اپارٹمنٹ کی ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آج کی شام بھی اس کے من کی طرح اداس تھی۔ آج ایک ہفتہ ہوگیا تھا اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے۔ لیکن شفق کا عکس اس کی جان چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"شفق! یہ تم نے کیا کیا...؟" وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر (نہیں تقریباً" نوچتے ہوئے) بڑبڑایا۔ شام کا سایہ پھیلا۔ شفق کی سرخی بھی معدوم ہوگئی اور رات اپنے پر پھیلائے چہار سو گشت کرنے لگی۔ تب وہ اپنے شل ہوتے بازوؤں اور ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔ یہاں تنہائی کا بہت شدت سے احساس ہوتا تھا اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

یہ بات تو طے تھی۔ شفق کے بغیر وہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ آج بھی اس کے دل و دماغ پہ روز اول کی طرح قابض تھی۔ اس کی پشیمانی نے مزید داغ دھو ڈالے تھے وہ اس سے اپنی تمام نادانیوں کی معافی بھی مانگ چکی تھی۔ پھر کیا بات تھی جو اسے پریشان کیے دے رہی تھی۔ شاید اسے یوں بغیر بتائے واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ ایک حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دفعہ وہ بہت جلدی آگیا تھا۔ اریب بھی اس کے ساتھ تھا وہ اپنی چند روزہ چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی...!" اس نے گرم جوشی سے سلام جھاڑا۔ شفق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن اگلے ہی پل اس کے سلام کا جواب بھرپور مسکراہٹ سے دیا۔ جہانزیب نے کچھ چونک کر اس کی جانب نگاہ کی۔ وہ اسے پہلے کی نسبت کمزور سی لگی تھی۔ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیسی ہو۔۔۔؟" ہمیشہ کا جملہ۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"باہر گرمی ہے۔ اندر آجاؤ۔" اس کے جواب نہ دینے کا جہانزیب نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ شاید وہ اس سے یہی توقع کر رہا تھا۔ اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔

ماں کمرے سے بولتے ہوئے باہر آرہی تھیں انہیں اریب نے اٹین شن کر دیا تھا۔ راہداری تک آتے ہی وہ ٹھٹک کر رکیں۔

جہانزیب مسکراتے ہوئے شفق سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ان سے آگے نہیں بڑھا گیا۔

"آنکھیں سرخ ہیں تمہاری۔ سوئی نہیں ہو یا روتی رہی ہو۔" کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کب آئے جہانزیب! مجھے بتایا تک نہیں۔" وہ ان کے قریب پہنچ گئیں۔

نہ سلام نہ دعا' بلا تمہید خفگی کا اظہار۔ وجہ وہ اچھی طرح جان رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے ساتھ کھڑی شفق پر ڈالی جو اب کچن میں واپس جا رہی تھی اس نے دوبارہ اپنی ماں کو دیکھا۔

"بس امی! وہ یاد ہی نہیں رہا۔ ایکچوئلی اریب کے ہاسٹل سے فون آگیا تھا یہ آنا چاہ رہا تھا پھر سفر لیے کٹا کہ یہاں آکر دم لیا۔" وہ فریش لہجے میں بول رہا تھا۔ ماں نے اس کے چہرے پر کچھ تلاشنا چاہا۔

"کیا بات ہے امی!" اسے ان کی ایکسرے کرتی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔۔۔! تم فریش ہو جاؤ' میں کھانا لگوا رہی ہوں۔" وہ سرہلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہارے لیے۔۔۔!"

جہانزیب نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرانی سے جہانزیب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے لینے میں تامل کر رہی تھی۔

"تمہارے لیے لایا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے وہ پیکٹ مزید کچھ اور کہے بغیر اس کے پاس رکھ دیا۔

سب کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ وہ تمام امور گھر داری سمیٹ کر آخر میں اپنے اور اس کے مشترکہ کمرے میں آئی تھی۔ اس کی رات دیر سے شروع ہوتی تھی۔ اس وقت حسن جاگا ہوا تھا۔ وہ اسے فیڈر سے دودھ پلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی جسے وہ پی کم اور گرا زیادہ رہا تھا۔ آج اپنے علاوہ جہانزیب کو بھی جاگتا دیکھ کر وہ الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

وہ ہمیشہ ہی تھکا ہارا ہوتا تھا اور آتے ہی سو جاتا تھا۔ لیکن آج شاید کوئی بات تھی جو اسے کھٹک رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر پیکٹ کھول لیا۔ اندر بہت خوبصورت سوٹ تھا۔ ٹی پنک کلر پہ فیروزی کلر میں کڑھائی سوٹ کی خوب صورتی کو اجاگر کر رہی تھی۔

"میرے لیے۔ لیکن کیوں؟" وہ بدستور الجھن کا شکار تھی۔ جہانزیب جھنجلا کے رہ گیا۔

"میرے خیال میں تم میری بیوی ہو۔ کیا میں تمہارے لیے کچھ لا نہیں سکتا؟" شفق لاجواب ہو گئی لیکن بے شمار سوالات تھے جو اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا رہے تھے۔ جہانزیب نے ایک نظر اس کے الجھے ہوئے حلیے پر ڈالی۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس کی ساری توجہ حسن پر مرکوز تھی۔ جانے کیوں وہ خواہ مخواہ ہی رونے لگا تھا۔ شفق مزید جھنجلا گئی۔ جہانزیب بھی راستے میں رکاوٹ کی طرح کھڑا تھا۔ وہ زور زور سے اسے تھپکنے لگی۔

"لاؤ' مجھے دو۔ میں چپ کرواتا ہوں۔" جہانزیب نے کہتے ساتھ ہی حسن کو اس کی بانہوں سے نکال لیا۔

وہ حیرت سے منہ کھولے رہ گئی۔ واقعی ایک دوبار تھپکنے پر حسن' جہانزیب کی گود میں آرام سے سو گیا تھا۔ شفق ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جو بیڈ کے وسط میں حسن کو سلا کر اس پہ کمبل اوڑھا رہا تھا۔ گویا اس کی جگہ متعین کی گئی تھی وہ ہمیشہ اس سے پہلے کاٹ میں سوتا تھا۔

جہانزیب کا رویہ اس کی سمجھ سے توبالاتر تھا۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں سا۔ آخری دفعہ جب وہ گیا تھا تو اس نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنی ذات سے اسے شاید کوئی سکھ نہ دے سکے۔ تو پھر یہ نام نہاد ہمدردی؟

"خدا کے لیے میں سمجھا چکی ہوں اپنے ناتواں دل کو۔ میں کر چکی ہوں سمجھوتہ۔ پھر کیوں تم یہ سب کر رہے ہو کہ میں پلٹ کر سوچنے پر مجبور ہو جاؤں۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے شکستہ دل سے یہ سب سوچ گئی۔

جب وہ اس کے پاس آیا تو وہ بالکل بھی اپنے دھیان میں نہیں تھی۔ جہانزیب نے کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ شفق چونک کر اس کی طرف مڑی۔ کب سے ایک جگہ ٹھہری آنکھوں میں حرکت کے باعث چبھن در آئی اور ڈھیر سارا پانی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

"شفق۔" وہ اسے پکار رہا تھا لیکن اسے اپنی بے وقعتی و بدنصیبی پہ شدت سے رونا آرہا تھا۔

"آنسو بہانے کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ کیوں۔۔۔ کیا وجہ ہے جو یوں رو رہی ہو۔" وہ بہت آہستگی سے کہتا ہوا اب اس کے آنسو بہت نرمی سے صاف کر رہا تھا۔

"جی۔۔۔!" فقط اتنا کہہ کر اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے رخسار صاف کیے اور نظریں جھکا لیں۔

"میں جب بھی تمہاری طرف پلٹا۔ تم مجھ سے دور ہو جاتی ہو۔" وہ عجیب سی حسرت لہجے میں سموئے کہہ رہا تھا۔

"پتا ہے۔ جب تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ تمہیں اپنی زندگی کی نادانی کا بہت پچھتاوا ہے اور یہ کہ تم سب بھول چکی ہو۔ شفق! کیا بھولنا تمہارے۔ تمہارے اختیار میں ہے؟" وہ اسے یک دم کاندھوں سے تھام کر بولا تھا۔

"ہاں۔۔۔! ہے۔ میرے اختیار میں ہے' اسے بھول جانا۔ بے شک وہ تلخ ایام یاد کرنا اذیت ہیں میرے لیے۔ لیکن میں اس سب کو پہلے جیسا کیسے سمجھ سکتی ہوں۔ اب گزری باتوں سے میرا کیا ناتا ہے جہانزیب۔۔۔! جبکہ میری کشتیاں جل چکی ہیں۔"

وہ نم لہجے میں کہتے ہوئے چہرہ جھکائے ہی بولی تھی۔ وہ چہرہ نہ بھی اٹھاتی تو جہانزیب جانتا تھا کہ کہ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو رہا ہوگا۔

"شفو۔۔۔" وہ نرمی سے پہلی بار اسے اس نام سے پکار رہا تھا۔

"میری طرف پلٹی ہو تو خود کو کیوں بے مایہ سمجھتی ہو میرے حوالے سے بدنصیب کہتی ہو خود کو۔ کیوں میں تمہاری بدنصیبی ہوں کیا؟"

جہانزیب نے دھیرے سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے اس کا چہرہ اٹھایا۔ رونے سے اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"آئم سوری۔۔۔!" وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔

جہانزیب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"نہیں شفق! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے جو اس مقدس رشتے سے مکمل ہی لاتعلق ہو گیا۔ میں انا پرست انسان ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیا ہوا تھا مجھے۔ میری بے رخی ہی تمہیں بدگمانی کی نہج پر لے گئی تھی۔ میں نے تمہیں اپنے نام پہ روتے دیکھا ہے۔ تمہیں اپنی نادانیوں پہ پچھتاتے دیکھا ہے۔ شفق! میں نے تمہیں بے مایہ کرنے کے لیے تو نہیں اپنایا تھا۔ انسیت ہے تم سے مجھے۔ محبت کرتا ہوں میں تم سے۔۔۔"

وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا تھا۔ شفق نے بے یقینی سے جہانزیب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ضبط الفت کے وہ تمام رنگ تھے۔ اس نے کب ایسا سوچا تھا کہ کبھی جہانزیب بھی لوٹ کر آسکے گا۔

"ایسا ممکن ہے؟" کا سوال اس کی زیست کے عنوان میں سے کب کا مٹ چکا تھا۔

"جہانزیب۔۔۔!" اس نے یک دم ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے دل سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سرکا تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے شفق کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرہ میں محفوظ کر لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جہانزیب۔۔۔!" وہ فرطِ مسرت سے ہنسی۔ آنکھوں کی رم جھم کے ساتھ خوبصورت ہنسی و مسکراہٹ کی جھنکار۔ جہانزیب نے بے خودی کے عالم میں اس منظر کو دیکھا۔ بہر حال وہ اپنا اجڑا گلشن پھر سے آباد کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"میں تم سے ناراض ہوں۔ تم نے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔ شفق مسکرا کر سر جھکا گئی۔ "شکر الٰہی۔۔۔!"

اپنائیت کے مرحلے طے ہو رہے تھے۔ شکوہ شکایات کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سراپا تشکر بن گئی۔

"میرا انتظار کرتی تھیں تم؟" وہ مسکراتے ہوئے اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ شفق نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

"شفق۔۔۔! آج ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے لگے ہیں تو میں کچھ ادھار چکانا فرض سمجھتا ہوں۔" جہانزیب نے تمہید باندھی۔

"میں بات نہیں کروں گا تمہاری گزری زندگی کے بارے میں۔۔۔ میں زندگی بھر تمہیں کسی بھی حوالے سے شرمندہ نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ اور میں تم سے بھی وفا کی توقع کروں گا۔ ہم بھول جائیں گے کہ ہماری زندگی میں ایسا کوئی تلخ موڑ بھی آیا تھا اور حسن کو۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

شفق نے سرعت سے سر اٹھایا تھا۔ جہانزیب کو اس کی آنکھوں میں التجا نظر آئی۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

"آج سے میں اسے اپنا نام دیتا ہوں۔" شفق کے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ آج اس پہ سجدے کرنا واجب ہوگیا تھا۔ اس کی سزا آسان ہو گئی تھی۔ بے ساختہ ہی دل بھر آیا تھا۔

"یہ میرے نام سے بڑا ہوگا۔ اور سدا میرا ہی بیٹا کہلائے گا۔"

"جہانزیب۔" شفق نے روتے ہوئے اس کے ہاتھوں پہ سر ٹکا دیا۔

"اتنا کرم مت کرو میری ذات پہ میں اس کی اہل نہیں ہوں۔"

"تم کس کرم کی مستحق ہو یہ تم میرے دل سے پوچھو۔ جو اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی تم سے بدظن نہ ہوسکا۔ آج بھی اس دل میں تمہیں اسی استحقاق سے براجمان پاتا ہوں۔ جیسے اول روز سے۔ میرا ساتھ دو گی شفق۔۔۔!" وہ اس سے وفا مانگ رہا تھا۔ شفق نے بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"محبت کرو گی مجھ سے۔۔۔؟" وہ اب محبت کی ہمراہی بخش رہا تھا۔

"میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں جہانزیب۔۔۔!" اس کے رونے میں یک دم ہی شدت آگئی تھی۔ جہانزیب کے ہاتھ آپوں آپ ہی ڈھیلے پڑے۔ وہ ششدر رہ گیا' واقعی اس کے جذبوں میں کتنی صداقت تھی۔ شفق کے ہاتھ رہائی پاتے ہی چہرے کے گرد حصار بن گئے تھے۔ اس کے آنسو گواہی دے رہے تھے۔ اس کی ہچکیاں اس کی بے چین و بے خواب راتیں گواہ تھیں اس کی اذیت کی۔ اب شاید مشکلیں آسان ہوجائیں۔ اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماضی گزر جاتا ہے۔ لیکن یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن شفق تو جیسے اپنی زندگی کے اس بھیانک باب کو دفن کرچکی تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی پرانی باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہا تھا۔ جہانزیب نے پرانی جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا اور کچھ تلاش بسیار کے بعد زبردست مراعات کے ساتھ وہ نئی جاب حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ اسے کمپنی کی طرف سے گھر بھی مل گیا تھا اور اس خوش قسمتی کو وہ شفق کی ذات سے عبارت کرتا تھا۔

حسن اب ڈھائی سال کا ہوچکا تھا اور جہانزیب کی اس سے دن بدن بڑھتی ہوئی محبت اسے ہمیشہ کی طرح اس کا ممنون کردیتی تھی۔ وہ کبھی کبھار سوچتی وہ اس

قابل کہاں تھی کہ اسے اتنی محبت ملتی۔ جب وہ یہاں آرہی تھی تو ماں نے کتنا واویلا کیا تھا۔ اب یہ تو جہانزیب ہی جانتا تھا کہ اس نے ماں کو کس انداز میں سمجھایا تھا۔ بہر حال اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ بس ایک پھانس آج نامعلوم جگہ چبھی تھی۔ حسن کو دیکھ کر وہ کبھی کبھار الجھن کا شکار ہوجاتی تھی۔ وہ اس بے وفا انسان کا خون تھا جو بیس گھنٹے اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ بیٹے سے ماں والی فطری محبت ہونے کے باوجود یہ کڑی کہیں اور جا ملتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ہر خیال رد کردیتی۔ جہانزیب کو آج جلدی آنا تھا کچھ دنوں سے وہ اکتاہٹ و طبیعت میں کسل مندی سی محسوس کررہی تھی۔ دو دن سے ٹمپریچر بھی تھا۔

جہانزیب کی پسندیدہ بریانی دم کرتے ہوئے وہ حسن کی آواز پہ پیچھے مڑی۔

"ماما۔۔۔ جے دیکھو۔" (یہ دیکھو) اس کے ہاتھ میں کرسٹل کا وہ گلدان تھا جو سینٹرل ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

"اوئے میرا بیٹا یہ کیسے اٹھالیا تم نے۔" اس نے ٹیبل کی طرف دیکھا اس میں لگے کاغذی پھول وہیں بکھرے پڑے تھے اور یقیناً" وہ کرسی پہ چڑھ کے یہ معرکہ سرانجام دے کے آیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اب الٹی پڑی تھی۔

"شریر۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے ہنس پڑی۔ شام میں جہانزیب اسے لینے آیا اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اگنیشن میں چابی گھما ڈالی۔ ساتھ ساتھ وہ زیر لب مسکرا بھی رہا تھا۔

"ایسے کیوں مسکرا رہے ہیں؟" شفق نے سادگی سے پوچھا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر دوبارہ ڈرائیونگ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

"سوچ رہا ہوں تمہاری نظر اترو الوں' آخر تمہیں میری نظر بھی تو لگ سکتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ شفق جھینپ گئی۔ اس نے چہرہ باہر کی طرف موڑ لیا ایک دم ہی وہ ٹھٹکی۔ یہ راستے انجانے نہ تھے ایک عجیب سے احساس سے اس کا بدن جلنے لگا۔ وہ کچھ

گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی جانب مڑی۔

"آپ کہاں جارہے۔"

"ہسپتال۔۔۔!" مختصر جواب آیا' اس کی رنگت کچھ بحال ہوئی۔ جہانزیب نے بغور اس کا متغیر ہوتا چہرہ دیکھا۔ ریسیپشن پہ کھڑا شخص کوئی اور نہیں تھا نہ وہ کوئی الوژن تھا۔ نہ ہی اس کی آنکھوں کو کوئی دھوکا ہوا تھا۔ صحیح معنوں میں وہ پتھرا کے رہ گئی تھی۔

اس کی حالت دیکھنے میں کافی ناگفتہ بہ تھی۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ بھی قدرے سانولا ہوچلا تھا کاش یہ سب اس کی نظروں کا دھوکا ہی ہوتا۔ یا ضروری تھا کہ زندگی میں دوبارہ اس کا سامنا اس سنگدل شخص سے ہوتا۔ اپنی غیر ہوتی حالت کو مجتمع کرتے ہوئے اسے بہت ہمت لانی پڑی تھی۔ جہانزیب نے یک دم ہی اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ کو واضح محسوس کیا۔

"تم ٹھیک ہو شفق؟" بے اختیار شانوں سے تھام کر ساتھ لگاتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ شفق نے ایک نظر جہانزیب کے پریشان چہرے پہ ڈالی' ریسیپشن پہ موجود شخص جاچکا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔

"مم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا حالانکہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔

اس نے خلیل رضا کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھیک کیسے رہ سکتی تھی۔ کتنا عرصہ گزرا تھا اسے خود کو یہ باور کرواتے کہ وہ سب کچھ بھول چکی ہے۔ لیکن آج۔ کیسے جھپاک سے سب کچھ دل و دماغ کی کھڑکیوں پہ آن وارد ہوا تھا۔ نرس سے کہلوا کر جہانزیب نے اسے ایمرجنسی ہی ڈاکٹر روم میں بھجوا دیا وہاں پہلے ہی سے ایک پیشنٹ بہت مغموم انداز میں بیٹھی اپنی تکلیف بیان کررہی تھی۔ اس کی سائیڈ شفق کی طرف تھی گو سے لگا وہ رو بھی رہی تھی۔

"معجزے تو اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا سی بھی امید ہوتی تو میں کیوں مایوس کرتی آپ کو۔ میری بیٹی جیسی ہیں آپ" ڈاکٹر اسے تسلی دینے کے انداز میں تھپک رہی تھی۔ مریضہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بہت شکریہ۔ آپ کا۔" وہ بدقت بول کر کھڑی ہو گئی۔ اب اس کا رخ شفق کی جانب تھا۔ جانے کیوں وہ اسے کچھ شناسا سی لگی تھی لیکن زیادہ دھیان نہیں دے سکی۔ نرس ڈاکٹر صاحبہ کے لیے کافی لے کر اندر آئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحبہ۔ یہ جو آپ کی پیشنٹ باہر گئی ہیں بہت رو رہی تھیں۔" نرس نے پیشہ ورانہ بے تکلفی سے تبصرہ کرتے ہوئے اطلاع مہیا کی۔ ڈاکٹر کا سر افسوس سے ہلا۔

"اللہ صبر دے اس بچی کو۔ بے چاری ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔"

کمپیوٹر پہ اس کی میڈیکل رپورٹ چیک کرتے ہوئے وہ خود ہی سے مخاطب تھیں۔ شفق نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی طبیعت پوچھتے ہوئے انہوں نے نرس کو بلڈ پریشر چیک کرنے کو کہا۔

"سسٹر نسرین۔۔۔! تم یہ اقرا خلیل کی میڈیکل رپورٹ لے جاؤ اور ڈاکٹر ثناء سے سگنیچر۔۔۔ کروا کے ریسیپشن پہ سبمٹ کروا دینا ان کا بلڈ پریشر میں چیک کر لیتی ہوں۔"

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ شفق ایک نام پہ ہی اٹک کر رہ گئی۔

"اقرا خلیل۔" اتفاق اتنا گہرا نہیں ہو سکتا اسے یکدم ہی اس مریضہ کو دیکھ کر اپنا کھٹکنا یاد آیا تھا تو گویا اس کی دھڑکن رک سی گئی۔

"او مائی گاڈ! اتنا لو ہو رہا ہے بی پی تمہارا۔ خیال نہیں رکھتیں تم اپنا۔" ڈاکٹر عنبرین کے لہجے میں اپنائیت بھری ڈانٹ تھی۔

"میں ڈائٹ چارٹ تیار کر رہی ہوں آپ کا اب دوہری ذمہ داری ہے لاپروائی نہیں برتنا۔ اللہ کی نعمتوں کی قدر کرنا چاہیے۔"

اس کا مکمل چیک اپ کرتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ شفق نے الجھن آمیز نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"مطلب۔۔۔؟"

"ماں بننے والی ہیں آپ۔ اللہ خوشی دے رہا ہے شکر ادا کریں۔ صدقہ و خیرات کریں۔ بہت سے لوگ تو اس انمول نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔" آخر میں وہ بہت اداسی سے بولی تھیں۔ شفق دل سے ڈاکٹر صاحبہ کی ہمدرد فطرت کی قائل ہو گئی۔ وہ باہر آئی تو دل عجیب اتھل پتھل کا شکار ہو رہا تھا۔ ساری سستی یک دم ہوا ہو گئی۔ اسے حیرانی ہوئی کہ وہ کیوں نہ جان سکی تھی کہ اسے کیا مسئلہ در پیش تھا۔ جہانزیب اسے گاڑی میں بٹھا گیا تھا اس کی کچھ میڈیسن تھیں جو وہ اسٹور تک لینے گیا تھا۔ شفق نے اطمینان سے سر سیٹ کی پشت سے ٹکایا۔ حسن اچھل اچھل کر اسٹیئرنگ گھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

احاطے کی سیڑھیوں سے اس نے پھر اس شخص کو دیکھا تھا اتنا اداس، مغموم، بلاشبہ اس کے ساتھ وہ اقرا ہی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی اس شخص کو دیکھا۔ جس نے ماضی میں کبھی اس کے جذبوں کو بے دردی سے پامال کیا تھا۔ آج کتنا تہی دامان تھا وہ کیا سزا دیتی۔ قدرت نے دنیا میں اسے سب دکھا دیا تھا۔ روتی ہوئی اقرا تقریباً اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

"خلیل۔۔۔" اس کے لبوں نے بے نام سی جنبش کی۔ کاش وہ اسے بھول سکتی۔ اس چہرے کو اس نے ہمیشہ خوشیوں سے لبریز دیکھا تھا۔ آج گہرے دکھ و ملال سے دوچار تھا۔ احساس محرومی اس کی پرچھائیوں تک سے جھلک رہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے حسن کو دیکھا وہ کھلکھلا رہا تھا۔

روشنی اس کے بے پناہ معصوم چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے حسن کو کھینچ کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔

"میرا بیٹا۔" حسن اس کی شدتوں سے گھبرا کر رونے لگا۔ وہ سنبھل کر اسے تھپتھپانے لگی۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"شفق اگر خدانخواستہ کبھی تم مجھ سے جدا بھی ہوئیں نا تو دیکھنا تمہارا خلیل کھو کھلا ہو جائے گا۔"

اس سے وثوق سے کہنے والا شخص آج اپنے کہے۔

صادق نظر آتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے آنسو پونچھے۔ حسن اب اوں اوں کی تان لگاتے ہوئے سونے کی پوزیشن میں لگ رہا تھا اس نے ممتا سے بھرپور بوسہ اس کی ننھی سی پیشانی پہ ثبت کیا اور نرمی سے اسے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ نجانے کب تک سود و زیاں کے حساب شمار کرتی رہتی۔ جہانزیب کے جھنجھوڑنے پہ ہڑبڑا کے اسے دیکھا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو یار! کب سے پکار رہا ہوں تمہیں۔" وہی نرم لو دیتا لہجہ آج مزید ٹون لیے ہوئے تھا اتنا رش تھا وہاں وہ اسے نجانے کیا کہہ رہا تھا۔

شفق نے تھوک نگل کر بے توجہی سے اس کی باتیں سنتے ہوئے اب تک کی سوچی ہوئی باتوں کو دہرا لیا جو اسے جہانزیب سے کہنا تھیں۔

"تم ٹھیک تو ہو۔" اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے وہ اس کے چہرے پہ پھیلے تذبذب کے آثار دیکھ چکا تھا۔ اب فکرمندی سے استفسار بھی کر رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ غائب دماغی سے بولی۔

"یہ کیا جواب ہوا۔" جہانزیب نے ہنستے ہوئے اس کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیا۔

"وہ۔۔۔ آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ اتنی آہستگی سے بولی کہ اگر وہ ہمہ تن گوش نہ ہوتا تو کبھی نہ سن پاتا۔

"حسن۔۔۔!" اٹک کر حسن کا نام لیتے ہوئے اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کے نرم و ملائم بالوں میں انگلیاں پھنسالی تھیں۔

"کیا ہوا حسن کو۔۔۔؟" جہانزیب نے اس کی گود میں سکون سے سوئے ہوئے حسن کو دیکھا۔

"حسن اس شہر میں کسی کی امانت ہے جہانزیب۔۔۔!" آنکھوں میں آئی نمی کو روکنے کے لیے اس نے تیزی سے رخ بدلا تھا۔ وہ ناسمجھی سے اسے تکنے لگا۔

"مجھے لے چلو گے وہاں۔۔۔" وہ آنسو پونچھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔ جہانزیب نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی اس سے اس بات کی۔ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ وہاں تک آیا تھا اسے لے کر۔ یہ جگہ یہ دنیا کتنے عرصے بعد دیکھی تھی اس نے جہاں اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت اور سب سے تلخ دور گزرا تھا۔ جہانزیب کے چہرے پہ اب بھی بے یقینی کی سی کیفیت رقم تھی۔

"شفق! تم کیا کرو گی۔" مطلوبہ جگہ آ چکی تھی اور جہانزیب اس کا ارادہ بھی بھانپ چکا تھا۔

"امانت لوٹا دوں گی۔" شفق نے سابقہ سکون سے جواب دیا۔

"حسن ہمارا بیٹا ہے شفق۔۔۔!" اس نے کمزور سے لہجے میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہا۔

"اب نہیں ہو گا۔" وہ دکھ بھری سرگوشی میں بولی تھی۔

وہ کیسے بھول سکتا تھا یہ چند ماہ و سال وہ ننھا فرشتہ جیسے اس کی زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے اس کی گود میں ہی تو آنکھیں کھولی تھیں۔ اور شفق وہ اتنی کٹھور کیسے ہو سکتی ہے ماں ہو کر۔ وہ بے بسی سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مار کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کے انجام کی چبھن ساری زندگی امتحان کی صورت سامنے کھڑی رہتی ہے۔۔۔۔ وہ آخری دن تھا اس کے سکون کا جب اس نے شفق کو ہر دکھ سہنے کو آزاد کر دیا تھا۔۔۔۔ اس بے گناہ کی آہ آج تک اس کا دامن چھلنی کر رہی تھی۔ ہر دن اس کی یاد سے شروع ہو کر رات اس کی سوچ پہ ختم ہو جاتی تھی۔۔۔ وہ آج تک اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی تھی۔۔۔ ایک دفعہ اس نے محبت کی تھی اور آج تک اس کی اقساط نہیں بھر پایا تھا۔

"کاش وہ وقت واپس آ جاتا۔ میں نے اپنے دل کو کیوں اجاڑ دیا۔" خلیل نے آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا کھوجتے ہوئے سوچا۔۔۔ عقیل کے سمجھانے پہ واقعی ایک چابی لگے روبوٹ کی مانند سمجھ چکا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔" ان کے درمیان کچھ پل کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

خاموشی در آئی تھی۔۔۔ پھر کچھ توقف کے بعد خلیل نے سناٹے کو توڑا تھا۔

"کیا۔۔۔؟"

"یہی کہ میں۔۔۔ شفق کو طلاق دے دوں گا!" اس کا دل کرلایا تھا اس معصوم کی بربادی پر لیکن اس نے ڈپٹ کر چپ کروادیا اور پین لے کر اس کی موت کے پروانے پر دستخط کرڈالے۔

"مجھے معاف کردینا شفق۔" اس نے تصور جان سے دل ہی دل میں معافی مانگی اور سرعت سے کمرے سے نکل گیا۔

اسے بے وفا ہونا منظور تھا۔ بھوکا رہنا نہیں۔۔۔ کتنے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔۔۔ وہ جان کر بھی انجان ہوگیا تھا کہ کسی کے لیے عذاب کا سامان کرکے کیسی خود غرضی سے وہ آرام دہ زندگی کا انتخاب کر بیٹھا تھا۔

"ٹھک ٹھک" اس کی سوچوں کی رو دستک کی آواز پہ ٹوٹی تھی۔۔۔ یہ وہی پرانا بوسیدہ سا دروازہ تھا جس کی سائیڈ دیوار پہ ہر سال نئی گھنٹی لگتی تھی لیکن وہ ایک مہینے کے اندر بدتمیز بچوں کے مارے گئے کینچوں کے نشانوں سے ٹوٹ کر بے کار ہو جاتی تھی۔ لہٰذا اب وہ گھنٹی سے بے نیاز گھر تھا۔۔۔ خلیل نے گہری سانس کھینچی اور نیچے اتر آیا۔۔۔ اقرا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔ غم تو اسے بھی اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔۔۔ دستک کی آواز پہ وہ دوبارہ دروازے کی سمت مڑا۔

سامنے موجود ہستی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ یوں ایک دم مجسم آکھڑی ہوگی۔ اس کی یادوں میں طاقت تھی یا محبت میں۔ اسے دیکھ کر کیا کچھ نہیں یاد آگیا تھا۔ اپنا گناہ' زیادتی' حالیہ آزمائش اور بس عرق ندامت۔۔۔ نہایت پشیمانی سے سر جھکا لیا۔۔۔ وہ بھول گیا تھا شاید کہ کسی کی زندگی برباد کرنے جیسے گناہ کا مرتکب ٹھہرا تھا۔

"اندر نہیں بلاؤ گے۔۔۔ یا بالکل ہی بھول گئے؟"

طنز میں ڈوبا نشتر سیدھا اس کے دل میں پیوست ہوگیا۔۔۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر اپنی ماضی کی محبت کو دیکھا۔

وہ آج پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی آنکھوں میں اجنبیت کا ایسا پردہ حائل تھا کہ وہ سانس بھر کے رہ گیا اس نے گود میں ڈھائی سال کا بچہ لیا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا' اسے راستہ دے کر پھر دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔

"اور یہ بچہ۔" ایک سوچ آتے ہی وہ تڑپ کر اس کی طرف مڑا لیکن وہ اب اندرونی طرف مڑ گئی تھی۔ لاؤنج میں آکر وہ رک گئی خلیل نے نظریں چرا کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اس نے راحیلہ بیگم کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ شفق کو بیٹھنے کی دعوت دیتا' وہ تیزی سے اس کی طرف آئی تھیں۔

"تم۔۔۔؟" ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ بے ساختہ وہ ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

"جی میں۔ شفق جہانزیب۔۔۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔۔۔ "ویسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی بھول جائیں گے آپ لوگ مجھے۔۔۔ خیر مجھے بھی آپ لوگوں کو یاد رکھنے کا کوئی شوق نہیں! بس کچھ ادھار رہتے تھے آپ کے میری طرف' وہی چکانے ہیں۔۔۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی تھی "اور تم۔"

وہ خلیل کی طرف مڑی۔۔۔

"تمہیں میں کیا کہوں۔۔۔ اللہ نے تمہیں دنیا میں ہی دکھا دیا ہے کہ کرنی کیا ہوتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ تم کبھی پچھتائے ہوگے اپنے کیے پہ۔۔۔ لیکن دیکھو سخت سے سخت اذیت میں بھی میں نے تمہیں کبھی بددعا نہیں دی خلیل۔"

اتنے عرصے میں اس نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ خلیل نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ اس کی آنکھیں یکدم ہی جلنے لگی تھیں۔

"تم نے تو کبھی یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا کیا قصور تھا؟ لیکن اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ معاف تو میں تمہیں مرتے دم تک نہیں کروں گی لیکن جانے کیوں میں تمہیں اذیت میں بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

اس کا لہجہ دھیما پڑا۔۔۔ خلیل نے اس کے لہجے کی نمی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا اپنا دل کتنا رو رہا تھا' وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ راحیلہ بیگم نے خاموشی سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔

"تو اب کیا لینے آئی ہو یہاں۔۔۔؟"

"امی پلیز۔۔۔! جائیں آپ یہاں سے۔۔۔" اس کا ضبط یکدم ہی چھلکا تھا وہ غصے سے واک آؤٹ کر گئیں۔

"شفق!" وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

"تمہاری امانت لوٹانے آئی ہوں خلیل۔۔۔!" اس نے ممتا بھری نگاہوں سے حسن کو دیکھا۔۔۔ وہ ننھی جان بے خبر سو رہی تھی۔ اقرا معلوم نہیں کب دروازے پہ آکھڑی ہوئی تھی۔ شفق آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آئی اور حسن کو اس کی گود میں دے دیا۔۔۔ وہ حیران اور پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی شفق اور کبھی حسن کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ خلیل اور میرا بیٹا ہے۔۔۔ لیکن آج سے تمہارا اور خلیل کا۔۔۔" وہ بھیگی آواز میں بولی "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔ خدا کرے تم خوش رہو۔ حالانکہ تمہارا حوالہ میرے لیے کبھی خوشی کا باعث نہیں رہا۔۔۔ تمہاری یاد اذیت ہے میرے لیے۔۔۔"

"شفق! مجھے معاف کردو۔۔۔" اس کے قدموں میں گرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔۔۔ "میں نے' میں نے بہت برا کیا تمہارے ساتھ۔۔۔ دیکھو خدا نے مجھے بھی خوش نہیں ہونے دیا۔۔۔ میں نے تمہیں برباد کیا تھا' دکھ دیا تھا تمہیں۔ پلیز شفق پلیز مجھے معاف کردو' خدا کے لیے" وہ اس کے قدموں میں جھکا معافی طلب کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے قدموں کو چھو رہے تھے وہ اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اپنے کہے پہ قائم رہتی۔ جب وہ پتھر دل ہو کر حسن کو اس کے حوالے کر سکتی تھی تو موم کی مانند پگھل کر اسے معاف بھی کر سکتی تھی۔

"میں نے تمہاری محبت سود سمیت لوٹا دی ہے

خلیل۔۔۔!" اس نے بدقت تمام خود کو کمزور ہونے سے باز رکھا۔۔۔

"لیکن میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔۔۔" وہ مسلسل رو رہا تھا شفق آہستگی سے اپنے پیر چھڑا کر پیچھے ہوئی۔

"اقرا۔۔۔!" اس نے اقرا کو دیکھا۔۔۔ جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔۔۔ "حسن کا بہت خیال رکھنا۔۔۔ میں نے اپنا جگر کا ٹکڑا تمہارے حوالے کیا ہے۔۔۔ پلیز اسے ماں بن کر پالنا۔۔۔" وہ چپ ہو گئی اقرا جانتی تھی کہ اب وہ رو رہی تھی۔۔۔ لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔۔۔ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔۔۔ شفق! مجھے تو اپنی ذات کے ادھورے پن کا ماتم کرنے سے فرصت ہی نہیں ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
مریم عزیز
قیمت 250 روپے

ننگے پاؤں
نگہت سیما
قیمت 250 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہارے حوالے سے کیا غم مناؤں بتم تو فرشتہ ہو میرے لیے..... خدا تمہیں اس کا اجر دے..... اتنا آسان تو نہیں ہے اپنا بچہ کسی کے حوالے کرنا.....“ شفق نے لب بھینچ کر اسے دیکھا..... خدا حافظ کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

باہر نکلتے ہوئے اس نے مڑ کے نہیں دیکھا تھا..... مبادا وہ پتھر کی نہ ہو جائے۔ اس کے دل میں کسی کے لیے بھی کوئی شکوہ نہ تھا..... لیکن خلیل کی ندامت، پشیمانی، اس کا شفق سے گڑگڑا کے معافی مانگنا اس کے قدموں کو زنجیر کرلے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے کوئی خوش فہمی ہو۔ اس نے خلیل کو معافی نہیں دی تھی لیکن وہ اسے دل سے معاف کر چکی تھی..... نہ وہ اس کی طرح بزدل تھی اور نہ ہی اسے دوبارہ یاد کرنا چاہتی تھی۔

شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے گاڑی کی طرف آتے ..... اس نے اپنی پچھلی تمام زندگی کو ان ہی جگہوں پہ دفن کر دیا تھا..... جہانزیب سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا شفق.....!“ وہ چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

”ہم حسن کو پال سکتے تھے..... وہ ہم پہ بوجھ تو نہیں تھا۔“ وہ بوجھل لہجے میں بولا۔

”بات پالنے کی نہیں ہے۔ اس کی شناخت کی ہے ..... آپ کتنا ہی اس کے سگے بن جائیں لیکن وہ بیٹا اسی شخص کا رہے گا۔“ وہ دانستہ اس کے نام سے کترائی۔

”اور کسی کی محرومی کو ختم کر کے میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا؟“ جہانزیب چونک کر سیدھا ہوا..... ان چند جملوں میں اس نے کیا باور کروانا چاہا تھا وہ جان گیا تھا۔

”اور ویسے بھی جہانزیب! اب میں آپ کو مزید امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اس لیے پوری ایمان داری سے باقی کی زندگی آپ کے ساتھ بتانا چاہوں گی۔“

جہانزیب نے ایک پل اسے دیکھا اور بھرپور انداز میں مسکرا دیا..... اسے شفق کے خلوص پہ ذرا بھی شک نہیں تھا بس وہ تھوڑی سی بیوقوف تھی۔ اس نے گہری نظروں سے اس کو دیکھا اور اپنا گرم بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شفق کی پلکیں بار حیا سے جھک گئیں اس نے جھینپ کر رخ موڑ لیا..... جہانزیب نے مطمئن ہو کر گاڑی اسٹارٹ کر دی اور شفق نے گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا، گاڑی میں ریڈیو آن ہو گیا تھا اور ان دونوں کی تنہائی تقریباً ”سمٹ گئی تھی۔

”اب میں اپنے اللہ سے سکون ہی مانگوں گی، بے شک اللہ کہتا ہے کہ میں تمہارے بیچ کے دنوں کو ایسے نکال دوں گا کہ جیسے وہ کبھی آئے ہی نہ ہوں۔“

”کبھی سونی صبح میں گھومنا، کبھی اجڑی شام کو دیکھنا
کبھی بھیگی آنکھوں سے جاگنا
کبھی بیتے لمحوں کو سوچنا
مگر ایک پل ہے امید کا
ہے مجھے خدا کا جو آسرا
نہیں میں نے دی ہیں دہائیاں“

راحت کی آواز چار سو جادو جگا رہی تھی ..... جہانزیب نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ آنکھیں بند کیں۔ دھیمی سی مسکان اس کے ہونٹوں پہ موجود تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آمنہ ریاض

ستارۂ صبح دم

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خونِ جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہردم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی مادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بنائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی' جولید اور الینا ان کے بچے ہیں۔ مادی کی پہلی ملاقات میں ایلینا سے دوستی

ہو جاتی ہے۔
شبیہہ العباس طبعتاً"سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے'جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرو تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔
دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے'لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔
دین محمد'جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔
ثروت'دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن'ثروت کو فون کرکے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔
ثمینہ'ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس'ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ'رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ'ماویٰ پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔
شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔
ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں'لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً"ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہو تی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ'ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' بس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔
انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی'ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ'ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر'نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے'وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔
زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد'بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت تند آور ہو رہی ہے۔
ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔
بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی

معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔
ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔
ثمینہ نے ماوی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔
ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔
ماویٰ بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیہہ العباس کو ڈانٹا۔
فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انبیا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔
ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر اسراریت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کر لی۔
وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی'جب ہی ایک صبح اسے شبیہہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔
جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماویٰ کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماویٰ کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماویٰ سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔
جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔
فیضان'ماویٰ کی پر اسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماویٰ پاکستان میں ہی ہے لیکن انیبا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔
رات کے وقت جلال'ماویٰ سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہہ نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔
شبیہہ نے جلال سے باز پرس کی تو جلال نے اسے بتا دیا کہ وہ ماویٰ سے نکاح کر چکا ہے۔ جب وہ شبیہہ کو یہ بات بتا رہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان'ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔
ماویٰ نے حویلی کی خاص ملازمہ تسنیم کو آمادہ کر لیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تسنیم نے ماویٰ کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تسنیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔
وہ تسنیم کا باپ ہوتا ہے۔ تسنیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔
برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کر دیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے لیے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا جھپٹی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رب نواز

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ الزام رجب علی لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے جرم کرلیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو بچالیتی ہے' تاہم رجب کے سر پر احسان ڈال دیتی ہے۔
ایبا دانیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کردیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت سے کام لیتی ہے۔
تسنیم کے باپ نے ماوی کو رجب علی کا خط دیا۔ ماوی نے اپنے کمرے میں جاکر ابھی خط کھولا ہی تھا کہ جنت بیگم اور دیگر لوگ ادھر آگئے۔ ماوی نے سب کے سامنے جنت بیگم کو اپنے باپ کا قاتل کہا اور ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کیا۔ تاہم اس خط میں رجب علی نے لکھا تھا کہ میں خودکشی کررہا ہوں۔ جنت بیگم نے کہا کہ میں اسے یہ الزام لگانے پر سزا دوں گی۔ دانیال حسن نے ولید اور انیبا کی گفتگو سنی تو انہیں پتا چل گیا کہ ولید نے فیضان اور انیبا کے تعلق کے بارے میں دانیال حسن سے جھوٹ بولا تھا' کیونکہ انیبا نے بھی ان سے ولید کی شکایت لگائی تھی۔
دانیال حسن نے اشتعال میں ولید کو مارا تو وہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔
شبیہہ ایک کام کے سلسلے میں شہر آیا ہوا تھا۔ اس نے ولید کو تین مشکوک لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ اس نے ان کا پیچھا کیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے ولید کو زخمی حالت میں ایک سنسان جگہ پر ڈال گئے تھے۔ وہ اسے اسپتال لے گیا۔
فیضان نے دانیال حسن سے ملے بغیر انیکسی چھوڑ دی اور ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئے۔ وہاں جانے کے بعد انہیں پتا چلا کہ ولید اسپتال میں ہے۔
ماوی حویلی چھوڑنے سے پہلے تسنیم اور اس کے باپ سے ملنے گئی تو باہر سے کسی نے دروازہ بند کردیا۔

۲۹
اُنتیسویں قسط

"فیضان کا پروپوزل میرے لیے....." انیبا دم بخود ثروت کو دیکھ رہی تھی۔ ولید گھر آچکا تھا۔ حالات بظاہر ٹھیک معلوم ہوتے تھے' لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ماں باپ کس نہج پر سوچ رہے ہیں۔ ایسے میں اچانک فیضان کا پروپوزل آجانا بہرحال ایک تعجب آمیز بات تھی۔ وہ بھی اس صورت میں' جبکہ وہ جانتی تھی فیضان کے اس کے متعلق کیا خیالات ہیں۔
"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔" ثروت نے مسکرا کر پیار سے اسے دیکھا تھا۔ "میں تو بلکہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ فیضان اچھا لڑکا ہے۔"
انیبا خاموش رہی اسے ان گنت خیالوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان خیالات میں ایک انجانی سی خوشی بھی تھی' جو ہر دوسرے خیال پر بھاری تھی۔ اس خوشی کو ثروت کے اگلے چند جملوں نے غارت کیا تھا۔
"میں تو فیضان کے پروپوزل پر بہت خوش ہوں۔ ایک تو یہ کہ ولید نے اپنی ناسمجھی میں جو حماقت کی بات کی تھی اس پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملنے سے پہلے ہی ان کی زبان بند کرنے کا طریقہ مل گیا۔ دوسرے جتنی جلدی تمہارے فرض سے فارغ ہوجاؤں' اتنا اچھا..... ولید اور ولی کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔ لڑکے ماؤں کے بغیر سنبھل جاتے ہیں۔ مسائل لڑکیوں کے لیے ہوتے ہیں....." وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھیں۔
انیبا کے دل پر بوجھ سا آن رکا۔ ثروت کا مافی الضمیر سمجھنا اس کے لیے مشکل ہرگز نہ تھا۔
"میں سمجھ رہی ہوں، ممی!..... سب سمجھ رہی ہوں..... میرا خیال تھا آپ کے خیالات بدل گئے ہوں گے.....

لیکن ڈیڈی نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔" اس کا لہجہ تاسف سے بھرپور تھا۔
"مرد گنجائش چھوڑتے بھی نہیں ہیں انیبا!" ثروت نے سامنے دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔
"کیا ڈیڈی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"
"نہیں..... (وہ کچھ کہتے کب ہیں صرف نشتر چبھوتے ہیں)
"پھر آپ ان سے....."
"نہیں انیبا!..... میں اب دانیال کے سامنے خود کو مزید ڈی گریڈ نہیں کروں گی۔" ثروت نے سرعت سے کہا تھا۔ "اس رشتے کو نبھانے کی جتنی کوشش کرسکتی تھی میں نے کی۔ اب ہمت نہیں ہے مجھ میں بیٹے!"
ان کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی اور چہرہ برداشت سے سرخ ہورہا تھا۔ انیبا نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسے اپنی ماں پر ترس آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم پاگل تو نہیں ہو ماوی! تم کس طرح اس حویلی سے نکل آئیں؟" ثمینہ کو تو سنتے ہی پتنگے لگ گئے۔
"اس بات کا کیا مطلب ہے ممی؟" ماوی نے الجھے سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتی ہیں' جنت بیگم دھکے مار کر مجھے حویلی سے نکالتی' تب مجھے آنا چاہیے تھا؟"
"تم کو وہیں رہنا تھا ماوی! ہر حال میں..... کم سے کم تب تک..... جب تک تم ثبوت حاصل نہ کرلیتیں۔" ماوی نے اپنا سر پیٹ لیا۔
"ثبوت' ثبوت' ثبوت..... آخر آپ کب سمجھیں گی کہ ثبوت نام کی کوئی چیز سرے سے وہاں ہے ہی نہیں۔ بابا نے خودکشی کی تھی۔ آپ اس حقیقت کو مان کیوں نہیں لیتیں؟" وہ جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔
جلال جو نیم وا دروازے پر دستک دینے کے ہاتھ اٹھا رہا تھا' رک گیا۔ اس کی جیب میں رکھا موبائل ارتعاش کرنے لگا تھا۔ شبیہہ نے اسے رکتے دیکھ کر اشارے سے وجہ پوچھی تھی۔ جلال اسے رکنے کا اشارہ کرکے موبائل دیکھنے لگا۔ اس دوران کمرے سے ماوی کی جھنجلائی ہوئی آواز مسلسل آرہی تھی۔
"یہ جھوٹ ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔"
"آپ کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔ اپنی بے جا ضد کے ہاتھوں آپ نے مجھے کہاں کہاں خوار کروایا ہے ممی! جنت بیگم نے صرف مجھے دھکے دے کر نکال دیا ہوتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا کہ کسی پر بھی انگلی اٹھائی جائے تو اس سے یہی توقع کی جاسکتی ہے..... افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ جلال اور شبیہہ کو بھی حویلی سے نکلنا پڑا۔"
"کیا جلال بھی؟" ثمینہ کے لیے یہ بات مزید صدمے کا باعث بنی۔
"تو آپ کا کیا خیال ہے' یہ پتا چلنے کے بعد کہ جلال مجھ سے نکاح کرچکا ہے' وہ بھی جنت بیگم کی مرضی کے بغیر..... تو جنت بیگم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ میں تو اب تک یہ ہی نہیں سمجھ پارہی کہ آپ نے جھوٹ بول کر میرا نکاح جلال سے کروایا ہی کیوں تھا..... آخر ایسی کون سی منطق تھی' جواب تک میں سمجھ نہیں پارہی۔"
"حویلی میں جنت بیگم تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی تو جلال تمہیں بچاسکتا تھا۔ میرا خیال تھا' ایک نہ ایک وقت ضرور آئے گا' جب وہ عورت تمہیں حویلی سے نکالنے کی کوشش کرے گی' ایسے میں صرف جلال ہوگا' جو تمہیں بچاسکے گا۔"
"واہ..... کیا کمال کی پلاننگ تھی آپ کی۔" ماوی نے زہرخند لہجے میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں! میں نہیں جانتی تھی کہ وہ بے وقوف لڑکا اتنا ناکارہ ثابت ہو گا۔"

"آئی ایم سوری ٹو سے ممی! لیکن آپ کو جلال کے لیے اتنے فضول الفاظ استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جسے آپ ناکارہ کہہ رہی ہیں بے وقوف کہہ رہی ہیں اسی سے جھوٹ بول کر آپ نے مجھے بھی اسے دھوکا دینے پر مجبور کیا۔ آپ جانتی تھیں میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ لیکن آپ نے اس سے جھوٹ بولا کہ میں اس کے عشق میں پاگل ہوں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جلال جیسا شخص کبھی میرے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ آپ نے اسے مجھے حویلی تک پہنچنے کا مہرہ بنایا جبکہ..."

معاً اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر پلٹی اور ٹھٹک گئی۔ دروازے کے قریب جلال کھڑا تھا اور دکھ اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں شبیہہ تھا اور وہ خوں خوار نظروں سے ماوی کو گھور رہا تھا۔

"جلال!..." ماوی کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ جلال تیزی سے پلٹ گیا۔

"تم عورتیں..." شبیہہ نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔ ماوی کو اس کی پروا نہیں تھی جس کی پروا تھی وہ جا چکا تھا اور ماوی کے پاس صرف پچھتاوے رہ گئے تھے فون پر ثمینہ کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انیبا! تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا؟" ثروت نے اس سے اگلے ہی دن پوچھا تھا۔

"کس بارے میں ممی؟" انیبا سمجھ تو گئی تھی، لیکن اس نے بن کر پوچھا۔

"فیضان کے پروپوزل کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"اوہ اچھا... آپ انہیں انکار کر دیں ممی! میں فیضان سے شادی نہیں کروں گی۔" اس نے جتنے آرام سے جواب دیا تھا، ثروت کے لیے اس کا جواب اتنا ہی غیر متوقع تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو انیبا! تم نے اچھی طرح سے سوچا بھی ہے؟"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا ہے ممی! آپ ڈیڈی کو بھی بتا دیں، میرا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں اور اگلے پانچ چھ سال تک آپ لوگ میری شادی کے متعلق سوچیے گا بھی نہیں۔ ہاں! آپ ڈیڈی سے علیحدگی چاہتی ہیں تو اس فیصلے میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ صرف میں ہی نہیں ولید اور رولی بھی آپ کا ساتھ دیں گے۔ ویسے بھی اس روز اسپتال میں ڈیڈی آپ کو چھوڑنے کا فیصلہ آدھا ادھورا ہی سہی، لیکن سنا چکے ہیں۔ آپ نے ہماری خاطر بہت ٹف ٹائم گزارا ہے۔ اب آپ کا وقت ہے۔ اپنی زندگی گزار لیں۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ آپ کو خود کو مزید ڈی گریڈ نہیں کروانا چاہیے۔"

اس نے اطمینان سے کہا اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔ رک کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی کہ ثروت کے تاثرات کیا ہیں۔

☼ ☼ ☼

رات کی تاریکی میں وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ مایوس، ناامید۔ اس جواری کی طرح جو نہ صرف زندگی کی بازی ہار گیا ہو، بلکہ اس کی زندگی کا کل اثاثہ بھی چھین لیا گیا ہو۔

اس نے وہاں سے دھوکا کھایا تھا، جہاں سے ہرگز امید نہ تھی۔ اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا لیکن اب کیا کرتا۔

تھک ہار کر فٹ پاتھ پر گر گیا۔ اس کے دماغ میں جیسے طوفان سا مچا ہوا تھا۔ دکھ یہ نہیں تھا کہ محبت نہیں ملی دکھ یہ تھا کہ اسے اتنا ارزاں سمجھا گیا کہ اس کے جذبات سے کھیلتے ہوئے بھی ایک لمحہ نہ سوچا۔ کیا وہ اتنا بے کار تھا کہ اس سے محبت نہ کی جائے؟ اسے صرف استعمال کیا جائے؟

وہ فاتر العقل نہیں تھا، بے وقوف بھی نہیں تھا۔ صرف سادہ دل تھا سادہ مزاج تھا اور یہی سادگی اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ ایک وحشی جانور بن کر اس کی ہر خوشی کو نگل گئی تھی۔

سڑک پر ایک گاڑی زن سے گزری۔ اس کا ملبوس پھڑپھڑانے لگا۔

ماوی کی محبت نے اس کی پرسکون زندگی میں بھی ایسے ہی ہلچل مچا دی تھی۔ اسے وہ نئی نئی خوشی اچھی لگتی تھی۔ اپنا آپ معتبر لگنے لگا تھا، لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی ہی ختم ہو گئی ہو۔

ذلت کے احساس سے آنکھوں میں مرچیں سی چبھنے لگی تھیں۔ معاً اس کا سارا وجود کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں نہا گیا۔ آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ اس نے سرعت سے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ رگ جاں کو کاٹتی اور آنکھوں میں تیرتی نمی آستین میں جذب ہو گئی۔

گاڑی کے ٹائر اس سے کچھ فاصلے پر چرچرائے تھے۔

"جلال..." اس نے شبیہہ کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنی تھی۔ پھر بوکھلائے ہوئے قدم اس کی طرف بڑھتے چلے آئے۔

"میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں... کچھ احساس بھی ہے میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔"

وہ اس کا بھائی تھا۔ اس کے لیے فکر مند تھا۔ جلال خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، لیکن ایسی ویرانی تھی، جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔

"جلال! کچھ بولو پلیز۔" شبیہہ نے اس کی حالت کے پیش نظر گھبرا کر کہا۔

"کیا بولوں... ؟ کچھ نہیں ہے بولنے کو۔" جلال نے آہستگی سے کہا۔

"تو کیا اس گھٹیا لڑکی کے لیے..." شبیہہ نے غصے سے کہنا چاہا لیکن جلال نے تیزی سے اسے ٹوک دیا۔

"ماوی کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال مت کرو۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے میں اس سے بھی زیادہ برے لفظ استعمال کروں۔"

"نہیں! ہرگز نہیں..." جلال کے لہجے میں تڑپ تھی۔ شبیہہ کا دل چاہا اکیسویں صدی کے اس مجنوں کو ایک زوردار تھپڑ رسید کرے۔

"اچھا! اٹھو گھر چلتے ہیں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر جلال کو اٹھانا چاہا، لیکن جلال ٹس سے مس نہ ہوا۔

"تم جاؤ شبیہہ! میں ابھی یہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"پاگل مت بنو جلال! آخر کب تک اس لڑکی کے لیے اس طرح سڑکوں پر پھرو گے؟ محبت تو وہ تم سے پھر بھی نہیں کرے گی۔" شبیہہ نے ڈپٹ کر کہا تھا۔

"نہ کرے... محبت چاہیے بھی نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس نے میری ذات سے اعتماد بھی چھین لیا۔" اس کا لہجہ اس کے غم کا غماز تھا۔

"پھر بھی تم اس کے لیے یہاں بیٹھے ٹسوے بہا رہے ہو؟ تف ہے تم پر۔" شبیہہ کو زیادہ دیر کسی کا دکھ بانٹنا نہیں آتا تھا۔

"ہاں! تف ہے مجھ پر۔" جلال نے سادگی سے کہا اور حتمی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو! گھر چلتے ہیں۔" وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شبیہہ نے دیکھا، دھوکا کھانے کے بعد وہ غم سے نڈھال تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے طیش میں اضافہ ہوا تھا۔

"عورت ہوتی ہی ناقابل بھروسا ہے۔ چاہے وہ بی جان ہو، میری ماں ہو، ماوی ہو یا.... یا تنوی ہو۔" وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا؟"

فیضان نے اسے راستے میں جالیا تھا۔ انیبا جتنا بھی حیران ہوتی، کم تھا۔ یہ فیضان کی شخصیت کا کون سا رنگ تھا، وہ قطعی ناواقف تھی۔

"تھی کوئی وجہ.. اور وہ وجہ میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔"

فیضان اس جواب کی توقع نہیں کررہے تھے۔ ذرا سا حیران ہوئے۔

"تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری فیلنگز کے ساتھ کھیلو۔"

"فیلنگز.... کون سی فیلنگز؟" وہ چڑ کر بولی۔ "وہ فیلنگز جن کا اظہار کرکے میں نے آپ سے تھپڑ کھایا تھا.... ؟ یا وہ فیلنگز جن کا احساس دلانے پر آپ نے ماوی سے جھگڑا کیا تھا.... جب تک میں آپ کے پیچھے بھاگتی رہی۔ آپ کو میری ذرا پروا نہیں تھی اور اب آپ کو اچانک میرا خیال آگیا۔" وہ آج بغیر کسی لحاظ کے اگلے پچھلے حساب برابر کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔

"غلط بات.... مجھے پہلے بھی تمہارا خیال تھا۔ اسی لیے کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کرسکا۔ مرد کے لیے کبھی مشکل نہیں ہوتا کہ وہ عورت کے جذبات سے کھیلے۔"

"بہت شکریہ آپ کا" آپ نے نہیں کھیلا، لیکن جو کیا، وہ بھی بہت برا تھا۔"

"تو اب تم اس بات کا بدلہ لوگی؟" فیضان نے ہنس کر پوچھا۔ انہیں اس کا رویہ بچپنا لگ رہا تھا۔

انیبا نے کسی قدر خفگی سے انہیں دیکھا اور ناراضی سے بولی۔

"آپ جو بھی سمجھیں۔"

"سمجھنا مجھے نہیں، آپ کو ہے۔" فیضان کے لہجے میں ایسا کچھ خاص تھا کہ انیبا کا دل تیزی سے دھڑکا۔

"میں اپنے ہر رویے کے لیے شرمندہ ہوں انیبا! تم سے نہیں، میں دراصل اپنے دل سے بھاگ رہا تھا۔ اس دل کی خوشی سے بھاگ رہا تھا۔ تم مجھے کب اچھی لگیں۔ یہ تو پتا نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک بار اچھی لگنے کے بعد تم مجھے بری نہیں لگیں۔ مجھے ڈر تھا، ایک بار تمہاری حوصلہ افزائی کردی تو کہیں تم راستے سے بھٹک نہ جاؤ۔ زریں میری پہلی پسند ضرور تھی، محبت نہیں، لیکن اسے پسند کرکے بھی میں نے الزام سہا تھا۔ ڈرتا تھا، تم سے محبت کا اعتراف تم کو کسی مشکل میں نہ ڈال دے۔ جنہوں نے ساری زندگی کسی الزام کے بوجھ تلے گھٹ گھٹ کر سانس لیتے گزاری ہو، وہ غیر ضروری حد تک پھونک کر قدم رکھنا سیکھ لیتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں جیسے میں اٹھانے والا تھا۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں.... کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں ایک اچھی زندگی گزاریں؟"

انہوں نے لاشعوری طور پر انیبا کی طرف دیکھا۔ وہ بنا آواز رو رہی تھی۔

وہ حق دق رہ گئے۔

"کیا ہوگیا بھئی.... میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کردی.... میں تو تمہیں...."

"آپ نے غلط بات نہیں کی.... لیکن اتنا وقت کیوں لگایا؟" اس نے روتے ہوئے چڑ کر کہا۔ فیضان ایک لمحے کو ٹھٹکے، پھر ہنس دیے۔

"اچھا! غلطی ہوگئی۔ اس بار معاف کردو۔ اگلی بار کے لیے وعدہ ہے، صحیح بات، ہمیشہ صحیح وقت پر کروں گا اور میرا خیال ہے تم سے یہ کہنے کا اس سے مناسب وقت اور کوئی نہ ہوگا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

انیبا کے چہرے پر دھنک پھیل گئی۔ محبوب کا اظہار اسے ہوا میں اڑانے کے لیے کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

جنت بیگم نے تنوی کو اپنی خاص ملازمہ سلیمہ کے ساتھ قریبی شہر جانے کی اجازت دی تھی، تاکہ وہ اپنی پسند کی خریداری کرسکے۔ ایسا موقع حویلی کی لڑکیوں کو کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا تھا، کیونکہ جنت بیگم کو لڑکیوں کا بازاروں میں گھومنا پھرنا کچھ خاص پسند نہ تھا۔ تنوی کو کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی، لیکن جنت بیگم کے اصرار پر جانے کے لیے راضی ہوگئی۔

"نمل کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں بی جان! مجھے اکیلے اتنا مزہ نہیں آئے گا۔" اس نے کہا تو جنت بیگم نے کچھ دیر سوچا، پھر نمل کو بھی اجازت دے دی۔

"سلیمہ! دھیان رکھنا۔ میں تنوی کو صرف اس لیے گھومنے پھرنے کی اجازت دے رہی ہوں، تاکہ اس کا ذہن بٹا رہے اور وہ شبیہہ کے بارے میں زیادہ نہ سوچ سکے۔ اور ہاں! نمل اور تنوی کو تنہا نہیں چھوڑنا۔"

جنت بیگم نے بطور خاص سلیمہ کو تاکید کی تھی۔

خدا معلوم اس کے کون سے خدشات تھے، جو اسے اس طرح کی احتیاط برتنے کے لیے مجبور کررہے تھے۔

تنوی اور نمل کو لطف آرہا تھا۔ یوں ہی ادھر ادھر گھومتے ہوئے انہوں نے ڈھیروں باتیں کرڈالی تھیں۔ تب ہی تنوی کو عبیرہ نظر آگئی۔

اتنے دن بعد یوں اتفاقاً" ملاقات ہورہی تھی۔ تنوی کو بڑا اچھا لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے اسی مقصد کے لیے بی جان نے بھیجا ہو۔

عبیرہ نے اسے خوب دیر تک گلے لگائے رکھا۔

"تمہارے بغیر تو کالج میں مزہ ہی نہیں آتا۔ میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔"

"نمرہ کیا کررہی ہے آج کل؟" تنوی نے کچھ خیال آنے پر پوچھا تھا۔

"وہی جو پڑھائی سے دل چرانے والی لڑکیاں عموماً" کیا کرتی ہیں.... یعنی گھرداری۔" عبیرہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"توبہ ہے بھئی.... تم تو اب تک ویسے کی ویسی ہو.... یعنی نالائق۔" عبیرہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"بھئی! اس کی شادی ہوچکی ہے، سو آج کل وہ اپنی کپتی ساس کو چاروں شانے چت کرنے کے لیے نت نئے طریقے سوچتی ہے اور شوہر کے گندے پاؤں دھو دھو کر پیتی ہے۔ بتاؤ! یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟"

"ارے! واقعی نمرہ کی شادی ہوگئی کیا؟ وہ خوش تو ہے؟" تنوی نے خوشگواریت سے پوچھا۔

"خوش کیوں نہیں ہوگی.... ماشاءاللہ اتنی اچھی سسرال ملی ہے کہ بس.... اور شوہر تو اتنا گڈ لکنگ ہے کہ نمرہ کو ہر وقت نظر کی دعائیں پڑھ کر پھونکنے کی فکر رہتی ہے۔"

"چلو! اچھی بات ہے.... لیکن عبیرہ! وہ عروش...."

"بھئی! وہ تو پاگل پن تھا۔ اسے بھول ہی جاؤ...."

"لیکن نمرہ تو کہتی تھی...."

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نمرہ جو بھی کہتی تھی، وہ اس کا پاگل پن تھا اور تمہارا پاگل پن یہ ہے کہ ہر ایک کی باتوں پر فوراً" یقین کر لیتی ہو بھئی! دماغ کے اندر بھی ایک چیز ہوتی ہے، جسے عقل کہتے ہیں، اسے بھی استعمال کرنا سیکھو۔ یہ نہیں کہ جس نے جو کہا، اس پر بھروسا کر کے اسی کی مرضی کرنے لگے..... میں تمہیں اس کا ایک قصہ بتاؤں؟" عبیرہ نے تمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کالج میں اس کا ہاتھ دیکھ کر ہماری ایک سینئر نے کہہ دیا کہ عنقریب تم کسی مشکل کا شکار ہونے والی ہو..... اور تمہیں پتا ہے اس عقلمند نے فوراً" اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔" تنوی نے چونک کر عبیرہ کو دیکھا۔

"تو کیا ثمامہ نے غلط کہا تھا؟"

"یار! اس کی اکثر باتیں تو درست ہی ہوتی تھیں۔ یہ تو میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

"لیکن عبیرہ! تم نے اور نمرہ نے تو مجھے کہا تھا کہ تم دونوں نے ثمامہ سے مجھے تنگ کرنے کے لیے جھوٹ بلوایا تھا۔"

"اوہ! ہم نے ایسا کہا تھا؟" عبیرہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا واقعی انہوں نے ایسا کچھ کہا تھا یا نہیں۔

"یار تنوی! تم اس وقت اتنی پریشان ہو گئی تھیں کہ ہمیں اور کچھ سوجھا ہی نہیں۔" عبیرہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ثمامہ کی باتیں درست تھیں؟" تنوی کو فکر لاحق ہوئی۔

"یار! اب تو اس بات کو اتنا وقت گزر چکا ہے کہ تمہیں ویسے ہی بھول جانا چاہیے تھا..... خیر! چھوڑو اس بات کو..... یہ بتاؤ! تمہارا اسٹرا کڑو کیسا ہے؟"

"ایں.....؟" اس نے ناسمجھی سے عبیرہ کو دیکھا۔

"شبیہہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"وہ ٹھیک ہیں۔" اس کے بجائے کب سے خاموش کھڑی تمل نے جواب دیا تھا۔

"کچھ پروگریس بھی ہوئی یا ابھی تک وہی اٹھارہویں صدی کا ڈھکا چھپا رومانس چل رہا ہے؟"

عبیرہ اور اس کے سوال پہ..... تنوی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ساتھ ہی بے اختیار ماوی یاد آئی تھی..... ماوی سے مل کر اسے عبیرہ یاد آئی تھی اور آج ماوی یاد آ رہی تھی۔

"اچھا عبیرہ! اب ہم چلتے ہیں۔" اچانک تمل نے تنوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تھا۔ تنوی کو عبیرہ کو صحیح طریقے سے خدا حافظ کہنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ الثانیہ بڑی بد تہذیبی کا مظاہرہ ہو گیا تھا۔

"کیا کر رہی ہو تمل! مجھے عبیرہ سے بات تو کر لینے دو۔"

"سہیلیوں سے باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔ یہ موقع نکل گیا تو دوبارہ نہیں ملے گا۔" تمل نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے دبی آواز میں کہا تھا۔

ایک دکان کے سامنے اس نے تنوی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تنوی! تم اسٹولر لینا چاہ رہی تھی ناں۔ اس شاپ سے دیکھو۔ میں ذرا وہ سامنے والی شاپ سے کچھ گرم کپڑے دیکھ لوں۔ میرے ساتھ آؤ سلیمہ! اس دکان پر بڑا رش ہے۔" سلیمہ کے ٹال مٹول کرنے کے باوجود تمل اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔ تنوی حیران کہ یہ کیا ہوا، پھر کندھے اچکا کر وہ اسٹولرز کی طرف متوجہ ہو گئی۔

چند منٹ بعد اس نے اپنے ساتھ کسی کو آ کر کھڑے ہوئے محسوس کیا تھا۔ سرسری سی گردن موڑ کر اس نے دیکھا اور دھک سی رہ گئی۔

"کیسی ہو؟" وہ شبیہہ تھا۔

تنوی نے جلدی سے تمل اور سلیمہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں ڈرائیور تو خیر ان کے ساتھ تھا ہی نہیں۔

"ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" شبیہہ نے حسب عادت ڈپٹ کر کہا۔

"مم..... میں جا رہی ہوں..... بی جان نے منع کیا ہے، آپ سے بات کرنے سے....."

"کسی دن بی جان کہیں گی کنوئیں میں چھلانگ لگا دو تو بھی ایک لمحے کی تاخیر نہ کرنا۔ تم جیسے بزدلوں کو یہ ہی کرنا چاہیے۔"

"اور آپ جیسے احسان فراموشوں کو کیا کرنا چاہیے؟"

"اوہو....." تنوی کا اس طرح بولنا بہرحال تعجب خیز بات تھی، لیکن شبیہہ کو خوشی ہوئی۔

"اچھی بات ہے کہ تم بولنا سیکھ رہی ہو..... اب تمہیں بی جان کے سامنے بھی اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی ہے۔"

"آپ مجھے بھڑکانے کی کوشش نہ کریں۔ میں بی جان کے خلاف جانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم انتہائی احمق ہو۔ اپنے فائدے نقصان کا تو تمہیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ بی جان انتہائی خود غرض ہیں۔"

"آپ کو ان کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیوں نہ کروں، ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے میرا۔"

"کہہ دینے سے رشتے ٹوٹ تو نہیں جاتے۔" تنوی نے تیزی سے کہا۔

شبیہہ کے لبوں پر دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اگر ایسی بات ہے تو بی جان کے کہنے سے ہمارا رشتہ بھی نہیں ٹوٹا۔ یہ سن کر اچھا لگا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ جھینپ گئی۔

"تمہارا مطلب جو بھی تھا، میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تمہاری شادی صرف مجھ ہی سے ہو گی۔ بی جان کچھ بھی کہیں، لیکن اگر تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا تو یاد رکھنا! میں تمہیں اور اسے..... دونوں کو قتل کر دوں گا۔ اپنی چیزوں سے دستبردار ہونا میں نے کبھی نہیں سیکھا اور تم تو پیدا ہوتے ہی میری ہو گئی تھیں۔ کل یا پرسوں میں حویلی آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تیاری کر لینا۔" وہ جاتے جاتے رکا۔

"تمل کا شکریہ ادا کر دینا۔ وہ بروقت اطلاع نہ دیتی تو تم سے ملاقات نہ ہو سکتی تھی۔"

تنوی حیران پریشان اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، تم نے شبیہہ بھائی کو انکار کیوں کیا؟" تمل نے کہا تھا۔

"تو تمہارے خیال میں مجھے اور کیا کہنا چاہیے تھا؟" تنوی نے چڑ کر پوچھا تھا۔ وہ یوں بھی اس سے خفا تھی۔

"ان کو انکار نہ کرتی تو بی جان خفا ہو جاتیں..... اور میں بی جان کو خفا نہیں کر سکتی۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔"

"پاگل مت بنو تنوی! بی جان کو خوش رکھنا، دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں، جو کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اپنی خوشی سے کیوں دستبردار ہوتی ہو؟"

"خوشی کیسی؟ بی جان نے رشتہ طے کیا۔ انہوں نے ہی ختم بھی کر دیا۔ نہ میں نے پہلے کوئی اعتراض کیا تھا۔ نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب کروں گی۔"

"ہاں! کاٹھ کے الو کی طرح زندگی گزارتی رہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔" نمل نے چڑ کر کہا تھا۔ تنوی خاموش رہی اسے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کے خیال تھا کہ بی جان بڑی ہیں وہ زیادہ سمجھتی ہیں اور اسے خود تو کوئی عقل نہیں ہے۔ آج تک انہوں نے اس کے لیے درست فیصلے کیے ہیں سو یہ فیصلہ بھی درست ہوگا۔ تب ہی اس نے واپس آتے ہی انہیں اپنی اور شبیہہ کی ملاقات کا بتا دیا تھا۔

جنت بیگم نے بے دریغ نمل کو ڈانٹا۔ اس ڈانٹ کی نمل کو تو ہرگز پروا نہیں تھی البتہ تنوی کھڑی کانپتی رہی۔

"تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے تنوی! وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" جنت بیگم نے کہا۔ "شبیہہ نے دوبارہ ایسی کوئی حرکت کی تو میں اسے خود سمجھ لوں گی۔"

ان کا لہجہ کسی سوچ کا غماز تھا۔ تنوی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں تنوی کو ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" شبیہہ اگلے ہی روز جنت بیگم کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ ذرا سی بات پر اس کا اور میرا رشتہ ختم کردیں۔"

"میں اس کی ولی ہوں۔ میں جو مناسب سمجھوں اس کے حق میں فیصلہ کرسکتی ہوں۔" جنت بیگم کا لہجہ تیز تھا۔

"ولی تو پتا نہیں آپ بس اس کی گارجین ہیں۔ میرا اور اس کا رشتہ زریں پھپھو کے ایما پر طے ہوا تھا۔ اگر رشتہ ختم ہونا ہے تو بھی ان ہی کو فیصلہ کرنا چاہیے۔" اس نے بڑی عیاری سے کہا تھا۔ جنت بیگم استہزائیہ ہنس دیں۔

"پاگل پن کی باتیں مت کرو شبیہہ! زریں کے بعد میں ہی تنوی کی ماں ہوں۔ اس کے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار مجھے ہی ہے۔"

"تو پھر آپ کے کہہ دینے سے رشتہ بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ تنوی میری عزت ہے اور میں اس سے کسی بھی قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گا۔" شبیہہ نے اٹل لہجے میں کہا۔

"تم تو اس طرح اکڑ رہے جیسے وہ تمہاری منگیتر نہیں منکوحہ ہو۔"

"آپ بھول رہی ہیں بی جان! ہم غیرت اور عزت پر جان دینے اور لینے والے لوگ ہیں۔" اس نے کہا۔ "بات صرف یہ ہے کہ تنوی میری عزت ہے۔ لیکن اگر پھر بھی آپ بضد ہیں تو میں بتا دوں میں ہوا میں تیر نہیں چلا رہا۔ میرے پاس نکاح نامہ ہے۔"

"کیا....." وہاں موجود سب لوگوں کو گویا جھٹکا لگا تھا۔

"اور نقلی ہے۔" شبیہہ نے پھر اطمینان سے کہا تھا۔ "لیکن اس نکاح نامے کی رُو سے جنت بی بی عرف تنوی میری منکوحہ ہے۔ میں اسے آپ کی اجازت کے بغیر بھی یہاں سے لے جانے کا مجاز ہوں اور آپ کو کوئی اختیار نہیں کہ مجھے ایسا کرنے سے روکیں۔"

"تم نے نقلی نکاح نامہ تیار کروایا؟" جنت بیگم کی حیرانی کی حد نہ تھی۔ "مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی شبیہہ!"

امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ آپ نے مجھے میری ماں کے خلاف بھڑکایا ہوگا۔"

"تو اب تم اس بات کا بدلہ لینے کے لیے تنوی کو لے جانا چاہتے ہو آؤ تنوی! اس کے عزائم کی داستان اس کی زبان سے ہی سن لو۔" جنت بیگم نے شبیہہ کے عقب میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شبیہہ قدرے سٹپٹا کر پلٹا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تنوی وہاں موجود ہوگی۔ وہ پریشان سی کھڑی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا تنوی نے تیزی سے کہا تھا۔

"پاگل مت بنو تنوی! صرف میں ہوں جو تمہیں ایک سیکیور لائف دے سکتا ہوں۔" شبیہہ نے کہا۔

"مجھے بی جان کے پاس رہنا ہے۔ میں..... میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" وہ ہراساں تھی اور بضد بھی۔

"ان کے ساتھ رہو گی تو یہ تمہیں بھی اپنے جیسا بنا دیں گی..... ضدی اور خود غرض۔"

"اور تمہارے ساتھ رہی تو تم اسے اپنے جیسا بنا دو گے..... ظالم اور بے حس..... پوچھو تنوی سے وہ تمہیں کتنا ناپسند کرتی ہے۔" جنت بیگم نے استہزائیہ کہا تھا۔

شبیہہ نے ناپسندیدگی سے انہیں دیکھا۔

"فیصلہ تمہیں کرنا ہے تنوی! اپنے ساتھ دشمنی مت کرو۔" شبیہہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"دشمنی تب ہوگی جب وہ تمہارے ساتھ جائے گی۔" جنت بیگم نے کہا۔

"مجھے تنوی سے بات کرنے دیں۔"

"تم نے سنا تنوی! اس کا لہجہ کتنا گستاخ ہوچکا ہے۔ یہ وہی شبیہہ ہے جو کسی کو مجھ سے اونچی آواز میں بات بھی کرنے نہیں دیتا تھا اور اب کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہا ہے۔ اس سے بھلا اب کسی اچھائی کی توقع کی جاسکتی ہے؟"

جنت بیگم نے ایک اور پتا پھینکا۔ شبیہہ کے غصے میں اضافہ ہوگیا۔

"نہ کریں اچھائی کی توقع..... لیکن یہ طے ہے کہ تنوی کو میں آپ کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ زبردستی بھی لے جانا پڑا تو لے جاؤں گا۔" اس نے حتمی انداز میں کہا تھا۔ "چلو! تم میرے ساتھ۔"

"م..... میں نہیں جاؤں گی۔" وہ کانپنے لگی۔

"تمہاری اجازت نہیں مانگ رہا۔ تم سے چلنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" شبیہہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ اسی وقت تنوی کے ہاتھ میں کہیں سے ایک چھوٹا سا ریوالور آگیا تھا۔

"م..... میں..... میں نہیں جاؤں گی اور آپ زبردستی بھی نہیں کرسکتے۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور اس پر تان رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں کی لرزش شبیہہ سے مخفی بھی نہیں رہی تھی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے تم مجھ پر گولی چلاؤ گی؟" وہ طیش سے بولا۔

"میں چلا سکتی ہوں لیکن آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" وہ ابھی تک کپکپا رہی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں تم کیسے چلاتی ہو۔" وہ طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔ خوف کے عالم میں تنوی نے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ معاً فضا میں ایک زوردار آواز گونجی اور سارے میں سکوت پھیل گیا تھا۔

شبیہہ کے قدم تھم گئے۔ اس نے اپنے سینے میں کوئی گرم سلاخ گڑتی محسوس کی تھی۔ اس کے کانوں میں ایسی آوازوں کا شور تھا جیسے ویرانوں میں ہوتا ہے۔ عجیب سا شور..... موت کا شور۔

اس کے سامنے کھڑی تنوی کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ جنت بیگم کا چہرہ بھی..... پھر اسے اپنی ماں کی شکل دکھائی دی تینوں چہرے مدھم ہو کر اس کی بصارت میں گم ہو رہے تھے۔ شبیہہ نے زبردستی بند ہوتی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ہر منظر اس کی بصارت سے یکدم ڈوب گیا۔

☼ ☼ ☼

اس رات ماوی جلال کی واپسی کا انتظار کرتی رہی اور انتظار کرتے ہوئے لاؤنج میں ہی سو گئی۔ اگلی صبح اس کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر سرعت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچن کی طرف لپکی۔
جلال چولہے کے قریب کھڑا تھا اور اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔
"جلال۔۔۔!" ماوی کے قدم جیسے دہلیز نے جکڑ لیے تھے۔
جلال نے مڑ کر دیکھا پھر رخ چولہے کی طرف موڑ لیا۔ ہلکی آنچ پر چائے کا پانی ابل رہا تھا۔
"میں جانتی ہوں تم مجھ سے خفا ہو لیکن پلیز! مجھے ایک بار اپنی پوزیشن کلیئر کر لینے دو۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔
"میں خفا نہیں ہوں ماوی! تم جاؤ یہاں سے۔۔۔" اس نے سادگی سے کہا۔
"وہ ساری ممی کی پلاننگ تھی۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔۔۔"
"میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔۔۔"
"تمہیں کرنا چاہیے۔۔۔ تمہیں مجھ سے لڑنا چاہیے۔"
"چائے پیو گی؟"
"مجھے یا ممی کو کوئی حق نہیں تھا کہ تمہاری فیلنگز سے کھیلتے۔"
"میں فروٹ کیک بھی لایا ہوں۔ چائے کے ساتھ کھانا چاہو تو فریج سے نکال لو۔۔۔"
"ممی نے تمہیں مہو بنایا تاکہ حویلی میں تم مجھے کسی بھی قسم کے نقصان سے بچا سکو۔"
"پہلے میں کلمہ چوک سے حلوہ پوری کا ناشتا لانے لگا تھا۔ بہت لذیذ حلوہ پوری ملتی ہے۔"
"آئی ایم سوری جلال۔۔۔!"
"پھر میں نے سوچا شاید تم نہ کھاؤ۔۔۔"
"مجھے معاف کر دو۔ میں ممی کی باتوں سے مجبور ہو گئی تھی۔"
"لڑکیاں ڈائٹ کانشس بہت ہوتی ہیں نا۔"
"اس طرح بی ہیو مت کرو پلیز!"
"چائے میں کتنی چینی لو گی؟" وہ چائے کپ میں نکالنے لگا تھا۔
ماوی نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اس طرح تم مجھے ہرٹ کر رہے ہو جلال۔۔۔!"
"میں ہرٹ کر رہا ہوں۔۔۔ میں۔۔۔؟" جلال نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ اس کا خول جیسے چٹخ گیا تھا اور چہرہ ضبط سے لال ہو رہا تھا ماوی چپ کی چپ رہ گئی۔
"تمہاری ماں نے تمہیں مجبور کیا تھا لیکن تم دودھ پیتی بچی تو نہیں تھیں۔ میری زندگی سے تم نے کھیلا۔ تم نے مجھے بے وقوف بنایا۔ مجھے تم نے استعمال کیا اپنے مقصد کے لیے۔ میں ٹشو پیپر نہیں تھا ماوی! کہ استعمال کر کے پھینک دیا جاتا لیکن تم نے میری ذات کو ٹشو پیپر بنا دیا۔ مجھے اس وقت کا افسوس ہوتا ہے جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا۔ کاش! وہ لمحہ میری زندگی میں آیا ہی نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے اب میں کسی عورت پر اعتبار نہیں کر سکوں گا۔"
اس نے یکدم اتنی بری طرح رد عمل ظاہر کیا تھا کہ ماوی "صم" "بکم" رہ گئی۔ یہ کوئی اور جلال تھا۔ وہ نہیں تھا جسے اب تک ماوی جانتی تھی۔ جلال کو چند منٹ لگے تھے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں۔ اس نے گہرے سانس لیے اور چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔
"آج ہم واپڈا ٹاؤن چلے جائیں گے۔" اس نے بس اتنا کہا اور اپنا کپ لے کر کچن سے نکل گیا۔ اس کے موبائل کی بیل بج رہی تھی۔
ماوی وہیں کھڑی رہی اور شیلف پر رکھے کپ سے نکلتی بھاپ کو دیکھتی رہی۔
باہر جلال کے لیے ایک پریشان کن خبر اس کی منتظر تھی۔
"شبیہہ کو گولی لگی ہے۔ ہم اسے لے کر لاہور آ رہے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟"
ثروت اپنے لیے چائے بنا رہی تھیں، جب انہوں نے اپنے عقب میں دانیال حسن کی آواز سنی۔ ذرا سا چونک کر پلٹیں، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ دودھ گرم کرنے کے لیے ہلکی آنچ پر رکھا اور خود کافی پھینٹنے لگیں۔ کچن کی خاموش فضا میں کافی پھینٹنے کی آواز بہت گونج رہی تھی۔
دانیال حسن کچھ دیر خاموشی سے ثروت کی پشت کو گھورتے رہے۔ وہ تمہید کا کوئی پہلو تلاش کر رہے تھے۔
"میں نے انیبا سے بات کی تھی۔" معاً ثروت نے ہی خاموشی کو توڑا۔
"کس بارے میں؟" دانیال حسن چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔
"فیضان کے پرپوزل کے بارے میں۔" ثروت نے کہا۔
"انیبا ابھی شادی نہیں کرنا چاہ رہی۔ وہ ابھی مزید پڑھنا چاہتی ہے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹی پڑھائی میں دلچسپی لے رہی ہے۔ تمہیں یاد ہے تم بھی چاہتی تھیں کہ ولید اور ولی کے ساتھ ساتھ انیبا بھی اعلا تعلیم حاصل کرے۔" دانیال حسن نے یاد دلایا۔
"میں تو بہت کچھ چاہتی تھی۔" ثروت نے سادگی سے کہتے ہوئے کافی کا مگ دانیال کے سامنے شیلف پر رکھ دیا۔
"اچھا! مثلاً۔۔۔؟" دانیال حسن کے لہجے میں دلچسپی تھی۔ ثروت ذرا سا حیران ہوئیں، پھر معتدل لہجے میں بولیں۔
"اس بات کو رہنے دیں۔ اچھا ہوا، آپ کو فرصت مل گئی۔ میں آپ سے بات کرنے آپ کی اسٹڈی میں آنے کا سوچ رہی تھی۔"
"تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ آ جاتیں۔۔۔ مجھے فرصت نہ بھی ہوتی تو تمہارے لیے ٹائم نکالنا کیا مشکل تھا۔" ایسا خوش گوار لہجہ۔۔۔ ثروت حیران رہ گئیں۔
"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" دانیال حسن ان کی حیرانی بھانپ کر ہنس دیے۔ پھر انہوں نے مگ شیلف پہ رکھا اور چند قدموں کا مختصر سا فاصلہ عبور کر کے ثروت کا ہاتھ آہستگی سے تھام لیا۔
"آؤ! ایک نئی شروعات کرتے ہیں۔۔۔ سب کچھ بھول کر۔۔۔ ہر تلخی کو ذہن سے نکال کر۔ مجھے معاف کر دو ثروت! میری ہر چھوٹی بڑی غلطی کے لیے۔۔۔ جنت بیگم نے وقتاً "فوقتاً" میرے ذہن میں تمہارے لیے اتنا زہر بھر دیا تھا کہ میں کسی بھی طرح تمہاری طرف سے اپنا دل صاف ہی نہیں کر سکا۔ تمہاری خدمت گزاری تمہاری محبت۔۔۔ مجھے سب بناوٹی لگتا تھا۔ غلطی میری ہے۔ مجھے پہلے ہی تم سے کلیئر کٹ بات کر لینا چاہیے تھی۔۔۔ تاکہ اتنے سال بدگمانی کی نذر نہ ہوتے۔ کچھ روز پہلے میری مستقیم بھٹی سے بات ہوئی تو اس نے میری غلط فہمی دور کی۔"
"پہلے جنت بیگم نے کچھ کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ اب مستقیم بھٹی نے کہا تو آپ کو اس کی بات کا بھی اعتبار آ گیا۔ کل کو کوئی اور اگر میرے بارے میں کچھ کہہ دے گا تو آپ اس پر بھی یقین کر لیں گے۔ ان سب باتوں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

درمیان میری ذات کہاں ہے؟ کیا میں اتنی ناقابل بھروسا ہوں کہ کوئی بھی کچھ کہتا رہے اور آپ مجھے دو کوڑی کا کرتے رہیں گے؟"

ثروت نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی باقاعدہ ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ دانیال حسن نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے گزرے ہوئے قیمتی سال تمہاری تمام تر خوشیوں کے ساتھ میں تمہیں واپس نہیں کر سکتا۔ لیکن میں آنے والے سالوں کے قیمتی پلوں کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اس عمر میں گو کہ ایسی باتیں کرنا کچھ نامعقول سی بات لگتی ہے' لیکن سچ یہی ہے کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ مستقیم سے جب تم نے شادی کی تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا گزری تھی۔ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ تمہاری اور اس کی طلاق میری بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ہمارے گھر میں قربانی کا جانور کاٹنے والی ایک بڑی چھری ہوا کرتی تھی۔ تمہاری شادی کے بعد میں نے ایک مرتبہ وہ چھری نکالی کہ مستقیم کو ذبح کردوں' لیکن پھر دماغ نے سمجھایا کہ یہ تو نری بے وقوفی ہوگی۔ مستقیم کو قتل کر کے مجھے جیل جانا پڑے گا اور اس دوران تمہاری شادی کسی اور سے ہوگئی تو میں کیا کروں گا۔ بس اسی خیال نے مجھے مستقیم کو قتل کرنے نہیں دیا۔"

اب کی بار ثروت کو بے یقینی کے باوجود ہنسی آگئی۔ دانیال پختہ عمر کے آدمی کم اور نوجوان لڑکے زیادہ لگ رہے تھے۔

"میری محبت کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہوگی کہ میری بدگمانی اسی لیے شدید تھی کہ میری محبت بھی شدید تھی۔ مجھے معاف کردو ثروت! میری ہر غلطی معاف کردو۔ میں نے تمہیں بہت مایوس کیا۔ مجھے اپنی ہر غلطی کا احساس ہے۔ میں شبیہہ سے بھی معافی مانگ لوں گا' لیکن پہلے تمہیں مجھے معاف کرنا ہوگا۔ یہ دیکھو! میں تمہارے سامنے ہاتھ بھی جوڑ رہا ہوں۔"

دانیال حسن نے سچ مچ ان کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ثروت نے جھنجلا کر ان کے ہاتھ کھول دیے پھر انہی ہاتھوں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دانیال حسن نے ان کے کندھوں پر بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کرلیا۔ وہ جانتے تھے اس جل تھل کے بعد جب خوشیوں کا سورج نکلے گا تو ہر منظر نکھر چکا ہوگا اور ان کی عائلی زندگی خوش گوار سی روشنی میں نہا چکی ہوگی۔ بہت سال برباد ہوئے۔ اب انہیں خوشیاں چاہیے تھیں۔ اب انہیں زندگی سے ان خوشیوں کو کشید کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

قیامت سی قیامت تھی' جو حویلی کے مکینوں پر ٹوٹی تھی۔

سب حواس باختہ تھے۔ شبیہہ کی حالت خراب تھی۔ ڈاکٹرز کچھ بھی واضح الفاظ میں نہیں بتا رہے تھے۔ گولی دل کے قریب لگی تھی۔ فوری طور پر آپریشن کیا گیا۔ شکر ہے کہ دل کو نقصان نہیں پہنچا تھا' لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اگلے چھتیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

سب کا متفقہ فیصلہ تھا' وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ کسی کو بھی اب جنت بیگم کی حکمرانی منظور نہ تھی' لیکن تنوی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اسے جنت بیگم نے پالا تھا۔ جنت بیگم اس کے متعلق فیصلہ کر سکتی تھی یا تنوی خود... اور سب جانتے تھے' وہ جنت بیگم کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ ابھی تو خیر معاملہ بھی اور تھا۔ سب کو فکر تھی' اس سارے معاملے میں تنوی کو پولیس سے کس طرح بچایا جائے۔ تعلقات اور پہنچ کا وسیع سلسلہ تھا' جو انہوں نے استعمال کرلیا لیکن بڑی کوشش کے باوجود وہ معاملہ پولیس تک پہنچنے سے نہیں بچا سکے

تھے۔ اسپتال کی انتظامیہ نے طبی امداد دینے سے پہلے ہر حال میں پولیس کو خبر کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"میں تنوی کو لینے جا رہا ہوں۔" جلال نے کہا۔

"تمہارے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اماں اسے تمہارے ساتھ نہیں آنے دیں گی۔" مستقیم بھٹی نے کہا۔

"لیکن میں اسے ہر قیمت پر لے کر آؤں گا۔ بی جان واقعی اسے پاگل کردیں گی۔ ابا بتا رہے تھے' جس وقت آپ لوگ شبیہہ کو اسپتال لے کر آرہے تھے' انہوں نے تنوی کو مارنا شروع کردیا تھا کہ اس نے شبیہہ پر گولی چلائی۔"

سب کے ذہنوں میں بہت سے خدشات و اعتراضات تھے' لیکن کسی نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔ جلال حویلی آیا تو نمل نے فوراً" بتا دیا۔

"بی جان نے تنوی کو پہلے مارا پیٹا اور پھر کمرے میں بند کردیا ہے۔ جلال بھائی! اس کی حالت بہت خراب تھی' مگر بی جان کو اس پر ذرا رحم نہیں آیا۔"

جلال کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ جنت بیگم سے کوئی اچھی امید تو خیر تھی نہیں' اس پر حویلی کے در و دیوار سے لپٹی ویرانی اس کی پریشانی اور خدشات میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

دوسری طرف جنت بیگم غم سے نڈھال تھی۔ اس نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ عزیز پوتے کو خون میں لت پت دیکھا تھا۔ اب خراب حالت کے خیال ہی سے بے دم ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا سارا طنطنہ نکل گیا ہو۔

"میرا شبیہہ کیسا ہے... ؟ وہ ٹھیک تو ہوجائے گا ناں؟"

"پہلے آپ مجھے بتائیں! تنوی کو کمرے میں کیوں بند کیا ہے۔ مجھے لاک کی چابی دیں۔"

"ہرگز نہیں..." جنت بیگم بری طرح بدکی۔ "میں مرجاؤں گی' لیکن کمرے کی چابی ہرگز نہیں دوں گی۔ اس نے میرے شبیہہ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ میں اسے قتل کردوں گی۔" اس کا انداز عجیب جنونی سا تھا۔

"بی جان! اس طرح نہ کریں۔ پولیس کسی بھی وقت تنوی کو گرفتار کرنے پہنچ سکتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔" اس نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

"اچھا ہے' آنے دو پولیس کو۔ میں خود اسے پولیس کے حوالے کردوں گی۔"

جلال نے عاجز ہو کر اس سے سر کھپانے کا ارادہ ترک کردیا اور تنوی کے کمرے تک پہنچا۔ اس نے ملازم کو ساتھ لگا کر لاک با آسانی توڑ لیا تھا۔

"تنوی!" وہ کہیں دکھائی نہ دی تو اس نے زور سے پکارا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں ہراساں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر لپک کر آئی اور اس کے گلے لگ کر بری طرح رو دی۔

"میں نے جان بوجھ کر گولی نہیں چلائی جلال بھائی! مجھے بی جان نے کہا تھا۔" وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"کیا...؟"

"مم... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بی... بی جان نے دیا تھا ریوالور..."

"ڈرو مت تنوی! میں آگیا ہوں نا... میں اپنی بہن کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" اس نے پیار سے تنوی کے سر کو سہلایا تھا۔

"یہاں بیٹھو اور مجھے بتاؤ! کیا ہوا تھا۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہیں گولی چلانا پڑی؟"

"مجھے بی جان نے کہا تھا' شبیہہ تمہیں ضد میں ساتھ لے کر جائے گا اور چونکہ شبیہہ کا ان سے جھگڑا ہوا ہے' اس لیے وہ مجھے ماریں پیٹیں گے اور قید کر کے رکھیں گے۔ انہوں نے ہی ریوالور دیا تھا کہ اگر شبیہہ زبردستی ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

لے جانے کا کہیں تو میں ریوالور نکال لوں۔ میں ڈر گئی تھی جلال بھائی! لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں، مجھے نہیں پتا ریوالور کیسے چل گیا مجھے چلانا نہیں آتا۔ میں تو صرف ان کو ڈرانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کس نے ریوالور کا کلچ ہٹا دیا تھا۔" وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

جلال نے دیکھا اس کے چہرے پر مار پیٹ کے نشان تھے۔ بلاشبہ جنت بیگم نے اسے بری طرح زدو کوب کیا تھا۔

"لیکن تم نے ریوالور نکالا ہی کیوں؟ کیا تم جانتی نہیں تھیں شبیہہ کو۔ وہ لاکھ غصہ میں سہی، لیکن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔"

تنوی اور شدت سے رونے لگی۔

"میرے ساتھ تو بی جان نے بھی کبھی برا نہیں کیا تھا۔ تو پھر اب۔۔۔ میں کس پہ بھروسا کرتی۔ مجھے تو دونوں عزیز ہیں۔ لیکن میں نے بی جان کی باتوں میں آکر شبیہہ کو مار دیا۔ میں نے مار دیا انہیں۔" وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جلال اس کا دکھ سمجھتا تھا۔ اس کے تاسف میں اضافہ ہوا۔

"شبیہہ ٹھیک ہے تنوی! اور تم گھبراؤ نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو۔ اپنا حلیہ درست کرو اور جو سامان سمیٹنا ہے سمیٹ لو۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔" جلال نے پیار سے کہا۔

"جلال بھائی۔۔۔ میں۔۔۔"

"میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی جلال!" جنت بیگم چیل بن کر تنوی پر جھپٹی تھی۔ "قتل کر دیا اس نے میرے شبیہہ کو۔۔۔ میں مار ڈالوں گی اسے۔"

جلال نے بمشکل جنت بیگم کو تنوی سے الگ کیا۔ تنوی بے دم ہو کر زمین پر گر گئی تھی۔

"آخر آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟" جلال نے انہیں جھٹک دیا۔ "اپنی ضد کے ہاتھوں آپ نے سب برباد کر دیا۔ کتنی زندگیاں ہیں جو آپ نے تباہ کیں۔ ہم سب کو ایک ابنارمل زندگی گزارنے پر مجبور کرتی رہیں۔ انسان تھیں، لیکن خدا بن کر اپنے اردگرد رہنے والوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتی رہیں۔ آپ کیوں بھول گئیں بی جان! کہ آسمان پر ایک معبود بھی رہتا ہے۔ آپ کو ڈر نہیں لگا کبھی اس سے۔۔۔؟ ہمیں، ہمارے ماں باپ کو ایک ڈری سہمی زندگی دی آپ نے۔ اور سب کو چھوڑ دیں۔ شبیہہ اور تنوی کے ساتھ کیا کیا آپ نے؟ شبیہہ کو اس کی ماں کے اتنا خلاف کر دیا کہ وہ ان کی عزت نہیں کر پاتا۔ اپنی ماں کو بدکردار سمجھتا رہا کہ انہوں نے نہ صرف بھاگ کر شادی کی، بلکہ نکاح پر نکاح کرنے کا گناہ بھی سرزد کیا۔ ثروت آنٹی کے شوہر کو غلط سلط باتیں بتا کر ان کی شادی شدہ زندگی برباد کی۔ ان کے شوہر سمجھتے رہے کہ وہ اب بھی مستقیم بھٹی سے ملتی ہیں۔ تنوی کا کیا حشر کیا آپ نے؟ ڈری سہمی بے کار شخصیت بنا دیا اسے۔۔۔ ماوی نے بے شک آپ پر غلط الزام لگایا، لیکن اس الزام کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ آپ نے اس کے باپ کو اپنے طعنوں سے اتنا چھلنی کر دیا تھا کہ وہ خودکشی پر مجبور ہو گئے۔ پھر آپ نے سچ کو بھی چھپایا۔ آپ نے کبھی کیوں نہیں سوچا کہ آپ کو ذہنی معذور اولاد دے کر اللہ سدھرنے کا موقع دے رہا ہے۔ آپ غلطیوں پر غلطیاں کرتی رہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی۔ اپنی محبت میں مبتلا ہو کر آپ کیوں بھول گئیں کہ آپ کو جو اختیارات ملے ہیں، وہ اللہ کے اختیارات سے زیادہ ہرگز نہیں ہیں۔"

جنت بیگم کو کسی نے پہلی بار آئینہ دکھایا تھا۔ وہ خاموشی سن رہی تھی۔

جلال نے خود بھی بے دم ہو کر سر پکڑ لیا تھا۔ معاً اس کی نگاہ تنوی پر پڑی۔ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ جلال تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

دولت کسی کے ساتھ ہے، طاقت کسی کے ساتھ
تیرے ہیں جو، انہیں نہیں نسبت کسی کے ساتھ

کہنے کو سب کے ایک سے نقش و نگار ہیں
ملتی نہیں کسی کی بھی صورت کسی کے ساتھ

سورج کا راستہ نہیں رُکتا کسی سے بھی
کب تک چلے گی رات کی ظلمت کسی کے ساتھ

ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ

اہلِ نظر کے بخت میں کس نے یہ لکھ دیا
رہنا کسی کے ساتھ، محبت کسی کے ساتھ

شاہد ہے روز و شب کے صحیفے کا ہر ورق
رہتی نہیں ہے مانگے کی عزت کسی کے ساتھ

ہر شے ہے ایک دوجے سے امجد جُڑی ہوئی
پھر بھی نہیں، کسی کو بھی نسبت کسی کے ساتھ

امجد اسلام امجد

سالِ نو

نئی صبحیں، نئی شامیں، نئے لمحے، نئے ساتھی
مگر اک میں
کہ جو ویسے کا ویسا ہوں
فراتِ وقت پہ بکھرے
گزشتہ سال کی ساری
ادھوری خواہشوں کے
اَن گنت ٹکڑوں کو چُنتا ہوں
انہیں اک ایک کرکے جوڑتا ہوں
شکل دیتا ہوں
میں پھر اک خواب بُنتا ہوں ۔۔۔!!!

امجد بخاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواب تھا دیدۂ بیدار تلک آگیا تھا
دشت بڑھتا ہوا دیوار تلک آگیا تھا

میں نے مجبوری میں تلوار اٹھائی تھی میاں
ہاتھ بڑھتا ہوا دستار تلک آگیا تھا

اب میں خاموش اگر رہتا تو عزت جاتی
میرا دشمن میرے کردار تلک آگیا تھا

عشق کچھ سوچ کے خاموش رہا تھا ورنہ
حسن بکتا ہوا بازار تلک آگیا تھا

عین اس وقت مقدر نے بغاوت کردی
جب میں اس شخص کے معیار تلک آگیا تھا

میرے اندر کے کسی ہجر نے روکا ہے مجھے
ورنہ میں عشق کے انکار تلک آگیا تھا

رات آنکھوں سے کوئی اشک بغاوت کرکے
مسکراتا ہوا رخسار تلک آگیا تھا

میثم علی آغا

کوئی پوچھ لے تو بتاؤں کیا، مرے دل سے کیوں وہ اتر گیا
مرے سامنے کوئی بات کی، مرے سامنے ہی مکر گیا

یوں نہ کارِ عشق تمام کر، یوں نہ صبح شوق کی شام کر
وہ جو واقعہ تھا وہ ہوگیا، وہ جو سانحہ تھا گزر گیا

کوئی آنکھ میری طرف نہ ہو، کسی کو ذرا بھی خبر نہ ہو
مجھے جب بکھرنا پڑا کبھی، کہیں دور دل میں بکھر گیا

مرے روز و شب تھے بندھے ہوئے مرے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

مجھے یاد پھر سے دلا گیا مری بھولی بسری محبتیں
یونہی دفعتاً کسی موڑ پر مجھے دیکھ کر وہ گزر گیا

بڑی دیر تک جو برس گیا کوئی ابر تھا وہ بہار کا
مرے گھر کے پاس نشیب ہے نئے پانیوں سے وہ بھر گیا

مرے ساتھ بڑی دور تک چلا جا رہا تھا جو سیدھ میں
وہی راستہ ذرا گھوم کر کہیں وادیوں میں اتر گیا

جاوید شاہین

صبا سحر

محکمہ تعطیلات

"بیٹے! آپ بڑے ہو کے کیا بننا چاہتے ہیں۔ ذرا اپنے ڈیڈی کو بھی بتائیں۔"

"پرائمری اسکول کا ٹیچر بنوں گا یا ٹریننگ کالج کا لیکچرار۔"

ڈیڈی کے ہاتھوں میں پیالی تھرتھرانے لگی۔ "کیا کہہ رہے ہو منے۔"

"کیوں؟ کیا ٹیچر بننا برا ہے؟" نہایت معصومیت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں! مگر تم ٹیچر ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟"

"کیونکہ اس ملازمت میں کام دوسرے پیشوں کی نسبت کم ہوتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔"

"وہ کیسے؟" ڈیڈی حیران ہو کر بولے۔

"دیکھیے ڈیڈی! سال کے بارہ مہینوں میں سے گرما میں دو ماہ۔۔۔ سرما میں ایک ماہ۔۔۔ اور کرسمس میں ایک ہفتہ کی تعطیلات ہوتی ہیں۔ اس کے بعد باقی بچے دنوں میں سے سال کے پچاس اتوار نفی کر دیں۔ پھر مختلف قومی اور مذہبی تہواروں کی چھٹیوں کو نکال دیں تو کتنے دن بچے؟ میڈیکل اور دوسری چھٹیاں الگ۔"

(ارم آفتاب۔۔۔ حسن اسکوائر)

تنبیہہ

"انصاری صاحب! آپ کا بیٹا آج کل پڑھنے لکھنے پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔ کل میں نے اس سے پوچھا۔ بتاؤ پانی پت کی لڑائی کس کس نے لڑی تھی تو آپ کے بیٹے نے جواب دیا" مجھے نہیں معلوم۔"

عاصم کے کلاس ٹیچر نے اس کے والد سے شکایت کی۔

"جناب! اگر میرے بیٹے نے کہا ہے تو یقیناً" وہ بالکل معصوم اور سچا ہے۔ کسی لڑائی جھگڑے سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت سیدھا سادہ بچہ ہے۔"

انصاری صاحب نے متانت سے کلاس ٹیچر کو جواب دیا۔ کلاس ٹیچر حیرت سے دونوں باپ بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ انصاری صاحب، عاصم کو لے کر گھر روانہ ہوئے۔ سرخ بتی پر گاڑی رکی تو انہوں نے عاصم سے کہا۔

"تمہارے ٹیچر کے سامنے تو میں نے تمہیں بچا لیا مگر ایک بات کان کھول کر سن لو۔ آئندہ کبھی مجھے پتا چلا کہ پانی پت کی لڑائی سے تمہارا کوئی تعلق تھا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔"

(نسیم سحر۔۔۔ گلشن اقبال)

خواتین

چودہ سال کی عمر تک خواہش رکھتی ہیں اچھی صحت اور اچھے والدین کی۔

چودہ سے چالیس سال تک خواہش رکھتی ہیں اچھی شکل و صورت کی۔

چالیس سے ساٹھ سال تک خواہش رکھتی ہیں اچھی شخصیت کی۔

ساٹھ سال کے بعد۔۔۔ صرف اور صرف دولت۔

(نگہت ذوالفقار۔۔۔ بلدیہ)

طالب علم

کتب فروش "یہ حیرت انگیز کتاب تمہارا آدھا ہوم

WWW.PAKSOCIETY.COM

ورک کردے گی۔"
طالب علم: "ایسی دو کتابیں دے دو۔"
(حنا شاہد۔ کورنگی)

ٹکٹ

"مجھے واپسی کا ٹکٹ چاہیے۔"
"کہاں کے لیے؟"
"یہیں واپس آنے کے لیے۔"
(نسرین اختر۔۔۔ میٹروول)

تین بہترین نصیحتیں

میں نے ساری زندگی تین نصیحتوں پر عمل کیا ہے اور مرنے سے پہلے اپنی اولاد کو بھی یہی نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی نصیحت یہ ہے کہ سگریٹ نوشی مت کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے زیادہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میری عمر تہتر سال چھ مہینے ہے اور میں پچھلے تہتر سال سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں مگر میں نے کبھی زیادہ سگریٹ نہیں پیے۔ ہمیشہ اعتدال سے کام لیا اور ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی سگریٹ پیا۔

دوسری نصیحت یہ ہے کہ عشق مت کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے زیادہ عشق مت کرو۔ میں نے اپنی تہتر سالہ زندگی میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک عشق کیا ہے۔

تیسری نصیحت یہ ہے کہ شادی مت کرو۔۔۔ میرا مطلب ہے زیادہ شادی مت کرو۔ میں نے اپنی تہتر سالہ زندگی میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی شادی رکھی ہے۔

(یاسمین ظفر۔۔۔ لاہور)

ڈھائی سو الفاظ

کلاس ٹیچر نے بچوں کو کسی سواری پر تقریباً "ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل مضمون لکھنے کو کہا۔ ایک بچی نے لکھا۔

"میرے ابو نے ایک پرانی کار خریدی۔ پہلی رات وہ ہمیں اس میں بٹھا کر سپر ہائی وے پر بہت دور ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ ہمیں کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملی اور کسی نے ہمیں لفٹ بھی نہیں دی۔ ہمیں کئی میل تک پیدل چلنا پڑا۔۔۔

مس! یہ تقریباً "پچاس الفاظ ہو گئے ہیں۔ تقریباً" دو سو الفاظ وہ ہیں جو ابو نے راستے میں بولے۔۔۔ مگر وہ لکھنے کے قابل نہیں ہیں۔۔۔"

(ترنم اعجاز۔۔۔ گلستان جوہر)

پہچان

"آج میں نے تمہاری بیوی کو پارک میں دیکھا۔ بہت اداس اور خاموش تھی۔" ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔

"اچھا۔۔۔ پھر وہ میری بیوی نہیں ہوگی۔" دوسرے دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

(نرمین لودھی۔۔۔ سرگودھا)

سبب

ایک شخص سوٹ سلوانے کی غرض سے درزی کے پاس گیا۔ درزی نے کپڑا لے کر ناپا اور کہا۔ "کپڑا کم ہے۔ ایک سوٹ نہیں بن سکتا۔"

وہ شخص دوسرے درزی کے پاس گیا۔ اس نے ناپنے کے بعد کہا۔

"دس دن بعد سوٹ لے جایئے گا۔"

وقت مقررہ پر وہ درزی کے پاس پہنچا۔ سوٹ اٹھا کر پیسوں کی ادائیگی کر رہا تھا کہ دکان میں درزی کا بچہ داخل ہوا۔ اس شخص کو لگا اس بچے نے اسی کے کپڑے کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ تھوڑی سی بحث و مباحثے کے بعد درزی نے تسلیم کر لیا کہ اس نے کپڑا بچایا ہے۔ وہ شخص غصے میں پہلے والے درزی کے پاس گیا اور پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تم تو کہتے تھے 'کپڑا کم ہے' جبکہ تمہارے مقابل نے اسی کپڑے سے نہ صرف میرا سوٹ بنایا ہے بلکہ اپنے لڑکے کا بھی بنا دیا۔"

درزی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔ "اس لڑکے کی عمر کیا ہے۔"

"پانچ سال۔" آدمی نے اچنبھے سے جواب دیا۔

"جناب! تو میرے بیٹے کی عمر اٹھارہ سال ہے۔ میں کیسے سی سکتا تھا۔" درزی نے متانت سے جواب دیا۔

(شگفتہ فیاض۔۔۔ مشی گن امریکا)

ذمہ دار

ایک نوجوان لڑکی نے اچانک سیر و تفریح سے توبہ کر کے مذہب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ پادری صاحب نے اس کے ذوق و شوق سے متاثر ہو کر لڑکی سے پوچھا۔

"بیٹی! کیا تم پہلے انسان کا نام بتا سکتی ہو؟"

"نہیں۔" لڑکی نے بگڑ کر جواب دیا۔ "میں اس ذلیل انسان کا نام بھی اپنے منہ سے لینا گناہ سمجھتی ہوں، جس نے مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔"

(لبنیٰ اسلم۔۔۔ ہجرت کالونی)

عام سے لوگ

ساحلی مقام پر بہت سے لوگ پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ فاصلے پر دو نکمے، نکھٹو اور کاہل آدمی بھی درخت کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ ایک نکما پکنک منانے والوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"مجھے یہ لوگ بہت زہر لگتے ہیں، جو یہاں پکنک منانے آتے ہیں۔"

"مجھے بھی۔" دوسرے نکمے نے فوراً" تائید کی۔ "ان کے سامنے تو ہم بھی بالکل ان ہی جیسے عام سے لوگ لگتے ہیں۔"

(جویریہ وہاب۔۔۔ ملتان)

انکار

دو شرابی گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

"یار! افغانستان دنیا کی سب سے خشک جگہ ہے۔ وہاں شراب پر سخت پابندی ہے۔ ہزار کوششوں کے باوجود کہیں سے ایک قطرہ شراب بھی نہیں ملتی۔۔۔ ہاں اگر سانپ کاٹ لے تو علاج کے لیے جتنی چاہو شراب لے لو مگر مشکل یہ ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک سانپ ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے بارہ گھنٹے تک قطار میں کھڑے رہ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا۔ بارہ گھنٹے بعد جب میری باری آئی تو وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس نے مجھے کاٹنے سے انکار کر دیا۔۔۔"

(الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ)

پریشانی

دو روحیں آسمان پر پرواز کر رہی تھیں۔ ایک روح بار بار ٹھنڈی آہ بھر رہی تھی۔ دوسری روح نے اس کی بے چینی کی وجہ پوچھی۔

"میرے دوست! نیچے زمین پر میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔"

"ارے! تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ وہ جلد تمہارے پاس آجائے گی۔" دوسری روح نے اسے جوش دلایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو پریشان ہوں۔" پہلی روح افسردگی سے بولی۔

(مسرت جبیں۔۔۔ ڈیفنس)

ڈائریکٹری

ایک نوجوان عورت، بہت دیر سے ایک چھوٹی سی دکان میں ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھ رہی تھی۔ ایک صاحب اس کے پیچھے ڈائریکٹری خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ خاتون بے نیازی سے ڈائریکٹری کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب ان صاحب سے صبر نہ ہو سکا تو خاتون کو مخاطب کر کے بولے۔

"بی بی! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو، ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیں۔ میں اپنا مطلوبہ نمبر دیکھ کر فوراً" آپ کو واپس کر دوں گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"برائے مہربانی ذرا جلدی واپس کیجیے گا۔" خاتون نے ڈائریکٹری ان صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے گھر آنے والے ایک نئے مہمان کے لیے کوئی خوب صورت سانام تلاش کررہی تھی۔"

(رشیدہ بتول۔۔۔۔ اورنگی ٹاؤن)

ماممتا

ایک ماں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل کرواتے ہوئے کہا۔

"میرا بچہ بہت حساس ہے۔ اسے سزا ہر گز نہ دیجیے گا۔ اگر یہ اتفاق سے شرارت کر بیٹھے تو اس کے برابر والے بچے کو زور سے تھپڑ مار دیجیے گا۔ یہ خود بہ خود سمجھ جائے گا۔۔۔"

(بینا صدیقی۔۔۔۔ کورنگی)

فیملی ممبر

فیصل اپنی محبوبہ کے والد سے مل کر آیا تو اس کے دوست نے پوچھا۔

"کہو یار! کیسی رہی تمہاری ملاقات۔ انہوں نے تمہیں پسند کرلیا؟"

"یہ تو مجھے اندازہ نہیں ہوا ابھی۔" فیصل تذبذب سے بولا۔ "مگر انہوں نے باتوں کے دوران میرے دو سگریٹ پی لیے اور مجھ سے دو ہزار روپے ادھار بھی لے لیے۔"

"ارے سمجھو! بات پکی ہو گئی۔" فیصل کے دوست نے جوش سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "انہوں نے تو پہلی ملاقات میں ہی تم سے فیملی ممبرز جیسا سلوک شروع کردیا۔"

(افشاں فرقان۔۔۔۔ نخی حسن)

اندازہ

"پرسوں والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ محفل کتنی کامیاب ہوئی تھی۔"

ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے ہوئے ذوالفقار صاحب نے اپنی بیگم سے کہا۔

"جی! مجھے بھی اخبار دیکھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔" بیگم نے تائید کی۔

(نیر انیس۔۔۔۔ ناظم آباد)

اطمینان

کورٹ میں فیصلہ ہوا کہ 90 فیصد سردار بے وقوف ہوتے ہیں۔" اس پر سرداروں نے کافی شور مچایا۔ پھر فیصلہ ہوا کہ "10 فیصد سردار بے وقوف نہیں ہوتے۔" تب جاکر سردار ٹھنڈے ہوئے۔

(عدیلہ شہزاد۔۔۔ لیہ)

تاکید

ایک خاتون نرسنگ کے پیشے میں پچیس سال مکمل کرکے ریٹائر ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی نرسنگ کا کورس کروایا تھا۔ اسے ان کی جگہ پر "فوراً" نوکری مل گئی۔ ڈیوٹی پر جانے سے قبل انہوں نے اپنے بیٹی کو تاکید کی۔

"نرسنگ میں کامیابی کے دو گر ہیں۔ پہلا یہ کہ مریض سے جو بھی وعدہ کرو اسے ضرور پورا کرو۔ چاہے آندھی آئے یا طوفان۔"

"اور دوسرا امی جان!" بیٹی نے پوچھا۔

"کبھی وعدہ نہ کرو۔" ریٹائر نرس نے "فوراً" جواب

(صائمہ مصطفیٰ۔۔۔ کورنگی)

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علیؓ کو بوسہ دیا۔ اس وقت آپ کے پاس اقرع بن حابس تمیمیؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے تو دس لڑکے ہیں۔ میں نے تو کبھی ایک کو بھی نہیں چوما" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

"جو شخص رحم نہ کرے اس پر (اللہ کی طرف سے بھی) رحم نہیں کیا جائے گا۔"

محنت کی عظمت،

، حضرت عطار رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آٹا گوندھتیں تو نقاہت اور بھوک کی وجہ سے ان کے سر کے بال لگن سے ٹکراتے۔

، حضرت مطلب بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شام کو تمام مسلمانوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں دلہن بن کر آئیں اور رات کے آخری حصے میں آٹا پیسنے لگیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ مہربان تھے۔ اللہ کی قسم سخت سردی کی صبح کو جو بھی غلام یا باندی یا بچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پانی لاتا (تاکہ آپ اسے استعمال کرلیں اور پھر وہ اسے برکت کے لیے واپس لے جائے) تو آپؐ انکار نہ فرماتے بلکہ (سخت سردی کے باوجود) اس پانی سے چہرہ اور ہاتھ دھو لیتے۔

اخلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی آدمی جو کی روٹی اور بدذائقہ چربی کی دعوت دیتا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول فرمالیا کرتے (اور اپنا سب کچھ دوسروں پر خرچ کرنے کا عالم یہ تھا کہ آپؐ کی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی اور انتقال تک آپ کے پاس اتنا مال جمع نہ ہو سکا کہ جسے دے کر آپ اس زرہ کو یہودی سے چھڑا لیتے۔)

قلم کے موجد،

امام ابن اسحاقؒ نے کہا ہے کہ حضرت ادریسؑ ہی نے سب سے پہلے قلم سے لکھا، ان کی پیدائش کے وقت حضرت آدم علیہ السلام زندہ تھے اور آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کی عمر تین سو آٹھ سال تھی۔

وقت مختلف لوگوں کی نظر میں،

وقت کو پیچھے سے مت پکڑو اسے آگے سے روک کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔

(نیوٹن)

وقت خام مسالے کی مانند ہے جس سے آپ جو کچھ چاہیں بنا سکتے ہیں۔ (امام غزالیؒ)

وقت ایک ایسی زمین ہے جس میں محنت کیے بغیر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر محنت کی جائے تو یہ زمین پھل دیتی ہے اور بیکار چھوڑ دی جائے تو اس میں خاردار جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔

(افلاطون)

وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقت بھی آپ کو ضائع کر رہا ہے۔
(ارسطو)

وقت روئی کے گالوں کی مانند ہے جس کا اسراف واجب نہیں۔ یاد رکھو تم دولت کما سکتے ہو، وقت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔
(فرینکلن)

آپ مسرور ہوں یا مغموم، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔
(نپولین بونا پارٹ)

ارم کمال۔ فیصل آباد

غور طلب،

کوئی لمحہ دوبارہ نہیں آتا۔ کوئی دن دوبارہ نہیں آسکتا۔ نہ یوم پیدائش دوبارہ آتا ہے نہ یوم وصال۔ کسی یوم کو منانے کا تصور غور طلب ہے۔

دین و دنیا،

جس شخص کے بیوی بچے اس سے راضی ہیں، اس کی دنیا کامیاب ہے اور جس کے ماں باپ اس سے خوش ہیں، اس کا دین کامیاب۔
(واصف علی واصف)

خوشامد،

دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ، جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے اور کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے۔ خوشامد کہلاتے ہیں۔
(واصف علی واصف)

عمل،

شکر کرو، نعمت محفوظ ہو جائے گی۔ دستر خوان کشادہ کرو، رزق بڑھ جائے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا، عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلا ٹل جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائے گا۔
(واصف علی واصف)

تین آفتوں کا خوف،

ایک بزرگ نے بعض لوگوں کو ایک جنازہ کے پیچھے جاتے دیکھا کہ وہ میت پر بڑا ترس کھا رہے تھے اور مہربانی کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ فرمانے لگے "تم لوگ اپنے اوپر ترس کھاؤ تو بہتر ہوگا اور یہ شخص تو فوت ہو گیا اور تین آفتوں سے نجات پا چکا۔
1۔ ملک الموت کا منظر۔
2۔ موت کا تلخ ذائقہ۔
3۔ خاتمہ کا خوف۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

ماں کی دعا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ جنت میں میرے ساتھ کون ہوگا؟
ارشاد ہوا۔ "فلاں قصاب ہوگا۔"
آپؑ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاش میں چل پڑے۔ وہاں دیکھا تو ایک قصاب اپنی دکان پر گوشت بیچنے، فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ اپنا کاروبار ختم کر کے اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا کپڑے میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قصائی کے گھر کے بارے میں مزید معلومات جاننے کے لیے بطور مہمان گھر چلنے کی اجازت چاہی۔
گھر پہنچ کر قصائی نے گوشت کو پکایا پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم کیے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں نہایت کمزور بڑھیا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے بمشکل اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک ایک لقمہ اس کے منہ میں دیتا رہا۔ جب اس نے کھانا تمام کیا تو بڑھیا کا منہ صاف کیا۔ بڑھیا نے قصاب کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر قصائی مسکرایا اور بڑھیا کو لٹا کر واپس باہر آگیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا "بڑھیا نے کیا کہا؟" تو قصاب نے کہا۔
"یہ میری ماں ہے اور روز یہ دعا دیتی ہے کہ جنت میں تمہیں یعنی مجھے حضرت موسیٰؑ کا ساتھ نصیب ہو۔"

نوال افضل گھمن۔ گجرات

خلیل جبران نے کہا،

ہم اپنی زندگی کے دکھ اپنے خود ساختہ خیالات اور رجحانات سے خریدتے ہیں اور باقی کے دکھ ان سب کا ردِ عمل ہوتے ہیں۔
حنا سلیم اعوان۔ آخون بانڈی ہری پور

حروفِ زر،

☾ مومن کی جان اور اس کا مال، اس کے ایمان کی وجہ سے قیمتی ہو گیا اور ایمان سے محروم، کافر کی جان اور اس کا مال مٹی کا ڈھیر۔
☾ لوگوں کی عدم توجہ، تنہائی، بے کسی، ردی کی ٹوکری، کباڑ خانہ، پھر چولہے کی آگ، راکھ کا ڈھیر، یہ سارے عذاب محبوب سے تعلق منقطع ہونے کی سزائیں ہیں۔
☾ بدگمان انسان اپنے اعمال نامے کو دوسروں کے اعمال نامے سمجھ کر پڑھتا ہے۔
☾ سانپ کا زہر سانپ کے لیے زندگی ہے۔ غیروں کے لیے موت ہے۔ پانی، پانی کے جانوروں کے لیے زندگی اور خاکیوں کے لیے موت۔
☾ عبرت اور آگاہی نہ تو صرف کتاب سے حاصل ہوتی ہے اور نہ گفتگو سے، بلکہ یہ تو شاہ کا عطیہ ہے جسے چاہے عطا کرے۔
☾ گناہوں کی بدبو کی وجہ سے ہماری دعائیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

انیقہ انا۔ چکوال

حجاب،

حجاب محض عورت کا پردے میں چھپ جانا اور سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک اپنے آپ کو ڈھانپ لینا ہی نہیں۔ نا یہ کہ عورت کو گھر کے کسی کونے میں بند کر دیا جائے۔ جہاں سے اسے نکلنے کی اجازت نہ ہو بلکہ حجاب یہ ہے کہ عورت باعزت طریقے سے اپنا ستر ڈھانپے اور اپنی زینت کو دوسرے سے چھپائے۔ اور معاشرے کی فلاح میں اپنا کردار باوقار طریقے سے ادا کرے۔
عطیہ افضل۔ جہلم

قرآن کریم کی پیش گوئی،

ایک سمندر جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے قریب ہے۔ اس کا ذکر چودہ سو سال پہلے قرآن میں ہو چکا ہے۔ جبکہ اس کی دریافت بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ ایک طرف میٹھا پانی اور دوسری طرف کڑوا پانی ہے اور یہ آپس میں مکس نہیں ہوتا۔
قرآن کے اس سائنسی بیان کی تصدیق امریکی یونیورسٹی آف کولوراڈو کے بحری سائنس دان ڈاکٹر ولیم جے نے بھی کی ہے۔
"اس نے دو سمندر ملا دیے جو باہم ملتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے۔ رکاوٹ ہے۔ اور وہ اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔"

نوال افضل گھمن۔ گجرات

انمول موتی،

✲ نیت کتنی بھی اچھی ہو، دنیا تمہیں تمہارے دکھاوے سے جانتی ہے، اور دکھاوا کتنا بھی اچھا ہو، اللہ تمہیں تمہاری نیت سے جانتا ہے۔
✲ دو چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں۔
1۔ آپ کا صبر، جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
2۔ آپ کا رویہ، جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔
✲ جب دعا اور کوشش سے بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ اپنے بندوں کے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

حضرت علیؓ نے فرمایا،

● جو شخص لالچ کرتا ہے، اس کی روزی میں تو اضافہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ہوتا، البتہ اس کی عزت اور قدر کم ہو جاتی ہے۔

- جو کسی کی غیبت سنتا ہے گویا وہ خود غیبت کرتا ہے۔
- اپنے بیٹے کو اپنی تعلیم نہ دلاؤ کہ وہ تمہارے دور کے لیے پیدا نہیں ہوا۔
- اے ابن آدم! جب تو دیکھے کہ تیرا پاک پروردگار تجھے پے در پے نعمتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا۔
- درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو سزا دینے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔
- تمہارے دوست تین ہیں۔

1- تمہارا دوست۔
2- تمہارے دوست کا دوست۔
3- تمہارے دشمن کا دشمن۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

حروفِ دانش،

- جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوتی۔
- یہ ہماری آنکھیں نہیں بلکہ دوسروں کی آنکھیں ہیں جو ہمیں برباد کرتی ہیں۔ اگر سوائے آپ کے دنیا کے تمام لوگ اندھے ہوتے تو آپ کبھی بھی عمدہ لباس اور خوش نما سامان کی پروا نہ کرتے۔
- جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے، وہ سب کسی نہ کسی دن بخش دیا جائے گا اس لیے ابھی بخشش کرو تاکہ بخشش کا موسم تمہارا ہو، نہ کہ تمہارے وارثوں کا۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

غرور و تکبر،

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد تھا۔ جو خوش ایمانی اور توریت کو شیریں لہجے میں پڑھنے کی وجہ سے لوگوں میں منوّر کے نام سے مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال و دولت عطا کی تھی۔ اس کے خزانوں کی چابیاں اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں اٹھانے کے لیے مضبوط نوجوانوں پر مشتمل ایک جماعت تھی۔ ہر چابی ایک انگلی کے برابر تھی۔ ہر ہر خزانے کی الگ الگ چابیاں تھیں۔ جب سو رہے ہوتے تو یہ چابیاں ساٹھ خچروں پر لاد دیتے۔ وہ اس پر اتراتا اور تکبر کرتا تھا۔

اس کی قوم کے نیک طبع اور صالح لوگوں نے اس سے کہا "اپنی اس مالی وسعت سے زیادہ خوش نہ ہو۔ یعنی اس پر اترانے اور اکڑنے کا انداز چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

قارون نے کہا "اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی نہ ہوتا اور مجھ پر اس کا فضل نہ ہوتا تو مجھے اس قدر مال و دولت عطا نہ فرماتا۔"

ایک روز جب قارون خوب آرائش و زیبائش کے ساتھ زرق برق لباس اور غلاموں کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو جو لوگ دنیا کے طالب اور اس کی زینت و آرائش کے خواہاں تھے۔ وہ کہنے لگے "کیا خوب ہوتا کہ ہمیں بھی یہ سب ملتا جو قارون کو ملا ہے۔"

اس بات کو سن کر اہل علم لوگوں نے کہا۔

"تمہارا ناس ہو۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجے بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔"

مالی کثرت پر اترانے اور تکبر کرنے کی بنا پر اللہ نے اس کو اس کے مال سمیت زمین میں دھنسا دیا۔

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

رضوانہ شکیل راؤ ______ لودھراں

ریل گاڑی میں مسافر کی نظر سے جیسے
رات کے وقت کوئی شہر گزر جاتا ہے
اس طرح وقت کے دریائے رواں میں ایک سال
جیسے گزری ہے کوئی لہر، گزر جاتا ہے

ماریہ الماس ______ ہارون آباد

یہ لفظوں کی شرارت ہے، سمجھ کر کچھ بھی لکھنا ہم
محبت لفظ ہے لیکن یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے

شفق راجپوت ______ گوجرہ

وہی گلیاں، وہی کوچے، وہی سردی کا موسم ہے
اسی انداز سے اپنا نظام زیست برہم ہے
وہ جس کے ہونے سے زندگی نغمہ سرا ہوتی ہے
اسے کہنا کہ بھیگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے

سحر خان ______ کوئٹہ

اب ہم کو ڈھونڈنے کا تکلف نہ کیجیے
ہم کھو گئے کہ آپ کا ملنا محال تھا

سورٹھ سانڈ ______ روحل والی گاؤں

کہاں کہاں پر کٹے ہو شمار مت کرنا
مگر کسی پر بھی اعتبار مت کرنا
میں لوٹنے کے ارادے سے جا رہا ہوں مگر
سفر سفر ہے میرا انتظار مت کرنا

حنا سلیم اعوان ______ آخون باندی ہری پور

شہرت، عروج، حسن کی دولت کسی سے بھی
کرتا کہیں یہ وقت رعایت کسی سے بھی
امجد تماش بین ہیں سارے یہ غمگسار
کیجیے نہ اپنے غم کی وضاحت کسی سے بھی

سحرش اسلم ______ اسلام آباد

اس قدر قرض ہے محبت کا
سوچتا ہوں تو ہول اٹھتا ہے
عشق کے واجبات کیسے دول
تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے

نرمین لودھی ______ سرگودھا

اور کتنی دور ہیں ساغر عدم کی منزلیں
زندگی سے پوچھ لوں گا راستے میں گر ملی

مناہل تبسم ______ سرگودھا

اپنے دل کے داغ بھی لو دے اٹھیں تو کم نہیں
اپنی منزل کے لیے خود راہبر ہو جائیے

صبا طارق ______ گوجرانوالہ

یہ سال بھی گزر گیا تیرے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا، جاتے ہوئے کچھ اور

شائستہ اکبر ______ ڈگری کالج گدو

پھول کھلنے کا جو موسم مرے دل میں اترا
تیرے بخشے ہوئے کچھ زخم عجب یاد آئے
یہ خنک رات، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل کی خواہش ہے کہ محسن کوئی اب یاد آئے

راحیلہ شکیل خان ______ کراچی

سال کی پہلی کرن کے ساتھ پھر جاگا ہے دل
پھر وہی مری طلب، اب کے برس مل جائے تو

بشریٰ نوید باجوہ ______ اوکاڑہ

تیری محبت کا بھرم رکھتے رکھتے
ٹوٹ گئے ضبط کے بندھن سارے
آنکھوں سے برسا ساون اس قدر
اجڑ گئے ہیں نوید سب خواب ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

نائلہ، شمائلہ ــــــــ الٰہ آباد تحصیل چونیاں
جب اُس کو جیتنا ہی ہار ٹھہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جوا کون
گزرتی رات نے چُپ سادھ لی ہے
نہ جانے آتے جاتے رُک گیا کون

رقیہ اسماعیل ــــــــ یزمان
ملے تو خیر، نہ ملنے پہ رنجشیں کیسی
کہ اس سے اپنے مراسم تھے پر نہ تھے ایسے
رفاقتوں سے مرا ہوں، مسافتوں سے نہیں
سفر وہی تھے مگر ہم سفر نہ تھے ایسے

زوباریہ خالد ــــــــ لاہور
کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی
بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے
اب اک ہجوم شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے
جنہیں کوئی نہ ملا ہم سفر ہمارے ہوئے

نزہت ریاض ــــــــ اوکاڑہ
یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

ثمرہ، اقرا ــــــــ کراچی
ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دُنیا تھی مگر اس کی دوانی لوگو
حیلہ جو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اس پہ آئی نہ ہمیں بات چھپانی لوگو

آسیہ جاوید ــــــــ علی پور چھٹہ
اہل دل کی انجمن میں آ کبھی
ان کی دُنیا یار جانی اور ہے
نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستاں اس نے سنانی اور ہے

ماریہ چودھری ــــــــ ڈنگہ
بہت سے لوگ تھے گھل مل کے سب سے باتیں کیں
وہ جس کو میں نے نہ دیکھا مری نظر میں رہا
کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

انیس فاطمہ ــــــــ پسرور
گئے دِنوں میں محبت مزاج اس کا تھا
مگر کچھ اور ہی انداز آج اس کا تھا
میں کیا بتاؤں کہ کیوں اس نے بے وفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اس کا تھا

تسلیم اختر ــــــــ کچا کھوہ
گیسوئے شام میں ایک ستارہ، ایک خیال
دل میں لیے پھرتے ہیں تمہارا ایک خیال
یوں بھی ہوا ہے دل کے مقابل دُنیا تھی
پھر بھی نہ ہارا پھر بھی نہ ہارا ایک خیال

نوال افضل گھمن ــــــــ گجرات
کیسی محبت، کیسی چاہت ہم پہ سب کچھ روشن تھا
یونہی ذرا سا شوق ہوا تھا، اُڑ دل برباد کریں

طاہرہ ملک ــــــــ پسرور
اس زمانے میں دوستوں کا خلوص
جس نے دیکھا نصیب سے دیکھا
وہ تو بالکل وفا سے عاری تھے
ہم نے جن کو قریب سے دیکھا

آمنہ اجالا ــــــــ ڈہرکی
شام سے آنکھ میں نمی سی ہے
آج پھر آپ کی کمی سی ہے
دفن کر دو ہمیں کہ سانس آئے
نبض کچھ دیر سے تھمی سی ہے

ثمرین اکرام ــــــــ میر پور خاص
میں زندگی کی جنگ میں ہار ضرور ہوں
لیکن کسی محاذ پر پسپا نہیں ہوا

شاعری سچ بولتی ہے

ارم حنیف

شاعری کے بارے میں کیا کہوں۔ میری نظر میں شاعری احساسات کی ترجمانی کا آسان ذریعہ ہے شاعری زندگی کی تلخ و شیریں حکایات کا بیان بھی ہے۔ اب چلتے ہیں سب سے پہلے علامہ اقبال کی طرف۔ شاعری کی بات ہو اور سب سے پہلے علامہ اقبال کا ذکر نہ ہو یہ ناانصافی ہو گی۔ علامہ اقبال کی غزل کے کچھ اشعار۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
تیرا سفینہ ہے بحر بے کراں کے لیے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لیے

غم اور خوشی زندگی کا حصہ ہے لیکن پھر بھی جب کوئی اپنا دور ہو تو اداسی سی ہو جاتی ہے۔ اداسی میں ایک خوبصورت سی احمد فراز کی غزل آپ سب کے لیے۔

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اُداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
تیرے گلاب سے چہرے پہ زر اُداسی کا

مرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے طاق پہ سر اُداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہربان میرے
کہ تو علاج نہیں ہے میری ہر اُداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا میرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اداسی کا

محسن نقوی کی تو کیا ہی بات ہے۔ محسن نقوی کی شاعری سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر انسان کے دل کی آواز ہو۔ محسن نقوی کی یہ غزل آپ کے نام۔

اُس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن

یاد کے دشت میں پھرتا ہوں ننگے پاؤں
دیکھ تو آ کے کبھی پاؤں میں چھالے محسن

کھو گئی صبح کی امید اور اب لگتا ہے
ہم نہیں ہوں گے کہ جب ہوں گے اجالے محسن

حاکم وقت کہاں، میں کہاں، عدل کہاں
کیوں نہ خلقت کی زباں پر لگالیں تالے محسن

وہ جو اک شخص متاع دل و جاں تھا نہ رہا
اب بھلا کون میرے درد سنبھالے محسن

منیر نیازی عصر حاضر کے شاعر۔ میرے علاوہ اور بہت سے باذوق صاحب دل کی پسند ہے۔ لہٰذا ان کی ایک نظم۔

میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں
شام کا وقت ہے
دعاؤں کی منظوری کا وقت ہے
میں کن دُعاؤں کو یاد کروں
میری دُعائیں پیچیدہ بہت ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
Emale: id@khawateendigest.com

جنوری 2013 کے شمارے کی ایک جھلک
اناطولیہ کا پاسبان
داسی
جادوگر
عذاب
دیا اور طوفان
رقص اجل
قیامت سے قیامت تک
خوشی
نئی بھرتی
دوزی قتل کیس
گناہ گار
ادھوری سازش
جنوری 2013 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

منیر نیازی کی نظم کے بعد اب اپنا تعارف بھی کروادوں۔ میرا نام ارم حنیف ہے۔ میں تحصیل و ضلع منڈی بہاؤالدین کے ایک چھوٹے سے گاؤں ڈھوک کاسب میں رہتی ہوں۔ میرے خیال سے اتنا تعارف کافی ہے۔ نجم الثاقب کیا خوب کہتے ہیں۔

اس کو تو بچھڑنے کے ڈھنگ بھی نہیں آتے
مجھ سے دور رہ کر بھی قربتوں میں رہتا ہے

ایک ایسے انسان سے مجھ کو نہیں دم جو
دوستی نہیں کرتا دوستوں میں رہتا ہے

دوسروں کی طرح میرے بھی پسندیدہ متفرق اشعار تو بہت سے ہیں مگر ابھی میں وہی قلم بند کیے دیتی ہوں جو میرے ذہن میں ہیں۔ امید ہے آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔

کتنی سُدھر گئی ہے جدائی میں زندگی
ہاں وہ خفا ہے مجھ پہ احسان تو کر گیا
(خالد شریف)

اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا
(منیر نیازی)

کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو درد کوئی ہو عدیم
مسکرانا ہی پڑ جاتا ہے زمانے کے لیے
(عدیم)

اس قدر قیمتی تو نہ تھا میرا چین و سکوں محسن
لوٹ کر لے گئے وہ کسی انمول خزانے کی طرح
(محسن نقوی)

پلیز آپ لوگ یہ ضرور بتائیے گا کہ آپ کو میرا عام سا شاعری کا انتخاب کیسا لگا۔

*

دستک دستک دستک

شاہین رشید

تحریم منیبہ

"کیسی ہو تحریم؟ اور ریڈیو پر کام کیسا جا رہا ہے؟"
"میں ٹھیک ٹھاک۔ اللہ کا شکر ہے اور ریڈیو بھی ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔"

"ریڈیو کی فیلڈ میں اتفاقاً آئیں یا شوق لایا ہے؟"
"ریڈیو کی فیلڈ میں اتفاق سے آئی ہوں۔ کیونکہ سچی بات ہے کہ مجھے ریڈیو ٹی وی پہ کام کرنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ نہ بڑے ہو کر نہ بچپن سے۔ یہ تو اللہ نے عزت دے دی ہے ورنہ میں نے کوشش بالکل نہیں کی تھی۔"

"اچانک جاب ملنے پر کیا تاثرات تھے؟"
"جاب ملنے پر تاثرات تو اچھے تھے ہی۔ مگر اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے بولنے کا موقع ملے گا۔ کیونکہ بولنے کی عادت مجھے بچپن سے ہے اور کہیں بھی بولنے کا موقع ملے تو میں بولے بغیر رہ نہیں سکتی۔"

"کوئی سیلری وغیرہ طے نہیں کی؟ اور پھر کہاں کہاں کام کیا؟"
"ارے! ہمیں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ ہم تو بس بولنے جاتے تھے اور بول بول کر اپنی مرضی کے گانے چلا کر گھر واپس آجاتے تھے۔ خوشی بہت ہوتی تھی ظاہر ہے ہم چھوٹے تھے۔ بس پروگرام کر کے خوش ہو جاتے تھے۔ چھ مہینے کے بعد اس چینل کو چھوڑ کر ایف ایم 94.6 کو جوائن کیا۔ یہ نیا ریڈیو اسٹیشن تھا۔ اس میں صرف چھ آوازیں تھیں اور ان میں ایک میں بھی تھی پورا ایک سال ان کے ساتھ کام کیا۔
پھر میں نے ایف ایم 105 جوائن کر لیا اور اب تک یہیں ہوں۔"

"ریڈیو سے ٹی وی تک کا سفر کیسے ہوا؟"
"ریڈیو سے ٹی وی تک سفر کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہاں سے بھی خود بخود ہی آفر آئی تھی۔ ہوا یہ کہ آج سے دو تین سال قبل پی ٹی وی کے پروڈیوسر آفتاب عظیم صاحب نے مجھے رمضان کے سارے پروگرامز کی آفر دی تھی وہ ریکارڈڈ پروگرام تھے چونکہ ان سے ہمارے فیملی تعلقات ہیں۔ تو میں انکار نہ کر سکی اور پورے رمضان کے پروگرام میں نے کر دیے۔ وہ رمضان سیریز انڈس ویژن سے بھی چلی اور میٹرو ون ٹی وی سے بھی..... اب جب اس سال میٹرو ون اپنی سحری کی ٹرانسمیشن کر رہا تھا تو اس نے چونکہ میرے پہلے پروگرام نہ صرف دیکھے ہوئے تھے بلکہ چلائے بھی تھے تو انہوں نے لائیو ٹرانسمیشن کے لیے مجھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے رابطہ کیا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں نے ریڈیو لائیو پروگرام بہت کیے ہیں اور ریکارڈڈ پروگرام ٹی وی سے بہت کیے ہیں، لیکن کبھی ٹی وی سے لائیو پروگرام نہیں کیے اور پھر وہی بات کروں گی کہ مجھے ٹی وی پہ آنے کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ تم کچھ بولنا چاہ رہی ہو اور بول نہیں پا رہی او رکہہ دیا کہ ہم ایک وقفہ لیتے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ ایسا آج تک نہیں ہوا۔ پورے مہینے پروگرام بہت اچھے گئے اور سب نے بہت پسند بھی کیے۔ چونکہ بچپن سے باتونی ہوں اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔"

"وائس اوور میں کیا کیا کیا؟"

"وائس اوور میں پاکستان کے تقریباً" تمام مشہور برانڈز کے کمرشل کر چکی ہوں۔ آج کل بھی میرے پانچ چھ کمرشلز آن ایر ہیں۔"

"اپنی نعت اور حمد کوئی کی سی ڈیز بنوائیں اور کوئی ایوارڈز وغیرہ ملے آپ کو؟"

"سی ڈیز اس لیے نہیں بنوائی کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ لوگ بہت بھرم مارتے ہیں کہ ہماری اتنی سی ڈیز آچکی ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ کوئی معیار نہیں ہے۔ میں نے آج تک نہ کوئی سی ڈی بنوائی ہے اور نہ ہی کوئی ارادہ ہے۔ مجھے گورنمنٹ آف سندھ نے 2007ء میں بہترین نعت خواں کا ایوارڈ دیا تھا۔ میں اس وقت سترہ سال کی تھی اور کم عمر ترین نعت خواں تھی جس کو اتنا بڑا ایوارڈ ملا تھا۔"

☼ ☼ ☼

نور حسن

شوبز کے کچھ نام ایسے ہوتے ہیں، جو اپنے نام سے نہیں، بلکہ اپنے کام سے پہچانے جاتے ہیں۔ نور حسن بہت اچھے آرٹسٹ ہیں ہمگران کی پہچان مشہور سیریل "ہم سفر" ہے۔ جی یہی خضر ہیں۔

"جی نور حسن صاحب! کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ! ٹھیک ہوں۔"

"اب لوگ آپ کو آپ کے نام سے پہچاننے لگے یا ابھی بھی خضر کے نام سے ہی بلائے جاتے ہیں؟"

"میں تو کوشش کرتا ہوں کہ لوگ مجھے میرے نام سے ہی بلائیں، لیکن لوگوں کے ذہنوں پر ابھی تک خضر ہی سوار ہے۔ وہ ابھی تک میرے کردار سے باہر نہیں آئے ہیں۔"

"آج کل کوئی نیا ڈراما نظر نہیں آرہا آپ کا۔۔۔ خیریت؟"

"ہاں جی! بالکل خیریت ہے۔ جب میرے ڈرامے آن ایر آئیں گے تو پھر ایک ساتھ ہی آئیں گے۔ کیونکہ کام تو کافی ہو رہا ہے اور ویسے آج کل مختلف چینلز سے ایک دو ڈراما سیریل آن ایر بھی ہیں۔"

"کام کے لیے کسی خاص چینل کو منتخب کرتے ہیں یا سب کے ساتھ کام کرتے ہیں؟"

"کسی خاص چینل کے لیے نہیں، بلکہ ہر اچھے پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ کام کے لیے میرا انتخاب چینل نہیں، بلکہ اچھا کردار ہوتا ہے۔"

"آپ نے نیگیٹو رول کیا "ہم سفر" میں پھر ایک آدھ ڈرامے میں بھی کیا۔ کیا ہمیشہ نیگیٹو رول کو ترجیح دیں گے؟"

"ہمیشہ تو نہیں، لیکن اگر کوئی اچھا نیگیٹو رول ملا تو ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر میں نوجوان ہوں تو ہمیشہ ہیرو کے رول ہی کروں۔ میں ایک فنکار ہوں اور فنکار کو ہر طرح کے رول کرنے چاہئیں۔"

"مگر ہمارے یہاں تو یہ ٹریجڈی ہے کہ اگر کوئی نیگیٹو میں کامیاب ہو ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ نیگیٹو ہی کو ترجیح دیتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ہر طرح کے رول کر کے یہ ثابت کروں گا کہ میں ہر طرح کے رول کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میں سال میں ایک پروجیکٹ ایسا کروں گا جس میں میرا نیگیٹو رول ہو گا۔"

"آپ لیبیا کے شہر طرابلس میں پیدا ہوئے۔ پاکستان آنے کی وجہ؟"

"میں جب پانچ سال کا تھا تو پاکستان آیا اور ظاہر ہے کہ اس وقت میری عمر ایسی نہیں تھی کہ میں ضد کرتا کہ مجھے یہاں رہنا ہے۔ میری بنیادی تعلیم پاکستان میں ہوئی البتہ ایم ایس سی مارکیٹنگ میں نے یوکے سے کیا۔"

"اب دل چاہتا ہے کہ کہیں باہر شفٹ ہو جاؤں؟"

"نہیں! بالکل بھی نہیں۔ مجھے پاکستان سے بہت محبت ہے اور میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پاکستان نے مجھے عزت دی اور شہرت بھی۔۔۔ میں کسی اور ملک میں ہوتا تو شاید اتنا کامیاب نہ ہوتا۔"

"گھر والوں نے شوبز میں آنے کی اجازت آسانی سے دے دی؟"

"بالکل! آسانی سے دے دی کیونکہ اس معاملے میں میرے والدین کا موقف یہ ہے کہ بچے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ انہیں کسی فیلڈ میں جانے کے لیے فورس نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو میرے گھر والوں نے میری حوصلہ افزائی ہی کی۔"

"آپ نے اس فیلڈ میں آنا چاہا اور آپ آگئے۔۔۔ آپ کی محنت کو دخل ہے یا آپ کی قسمت کو؟"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ملتا ہے مجھے اس فیلڈ میں آنا تھا، کامیاب ہونا تھا قدرت کی مہربانی سے میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔"

"اپنے ڈراموں کو دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟"

"اپنے ڈراموں کو بہت تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ پھر انہیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک فنکار اسی طرح سیکھتا ہے۔"

"مشہور ہونا اچھا تو لگ رہا ہو گا؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ فیمس ہونا کسے اچھا نہیں لگتا۔ جب لوگ مجھے پہچانتے ہیں، میری تعریف کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

"شہرت بھی ایک امتحان ہے انسان کا۔۔۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ یہ بھی اللہ کی آزمائش ہوتی ہے کہ میرا بندہ میری مہربانیوں پہ کتنا شاکر ہوتا ہے یا دل میں کتنا غرور پیدا کرتا ہے۔"

"آپ ماڈلنگ بھی کرتے ہیں۔ آپ کو ایک فلم کی پیشکش ہوئی تھی۔ انکار کیوں کیا آپ نے؟"

"انکار اس لیے کیا کہ مجھے کردار پسند نہیں آیا تھا اور ماڈلنگ تو میں اداکاری سے پہلے ہی کر رہا ہوں۔"

"کھانے پینے کا شوق ہے؟"

"کھانے پینے کا بہت شوق ہے۔ زیادہ تر گھر کا پکا ہوا کھانا کھاتا ہوں۔ اپنی ماں کے ہاتھوں کا پکا ہوا زیادہ پسند ہے۔ رات کا کھانا اکثر دوستوں کے ساتھ باہر کھاتا ہوں۔"

بینش ناصر خان۔ ایف ایم 91

"بینش کیسی ہیں؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ اتنی مصروف رہتی ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

‘‘اور میں حیران ہو گئی کہ اتنی جلدی تم اٹھ بھی جاتی ہو۔ خیر! لائیو کالز میں کبھی مشکل کا سامنا ہوا؟’’

‘‘کالز تو ایسی ویسی آتی ہی رہتی ہیں کیونکہ سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مگر ہمیں بھی ایسے لوگوں سے بات کرنی آتی ہے جو تھوڑے ‘‘اوور’’ ہو جاتے ہیں۔ بڑی تمیز کے ساتھ اور بڑے احترام کے ساتھ ان سے بات کر کے سمجھاتے ہیں‘ کیونکہ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے سامعین کی پسندیدگی کی وجہ سے ہی ہیں مگر میں کسی کو لائن کراس نہیں کرنے دیتی۔’’

‘‘ریڈیو کے لیے جو ٹریننگ آپ کی ہوئی۔ آپ اس کو نئے لوگوں میں منتقل کرتی ہیں؟ ریڈیو مشکل میڈیا ہے یا آسان ہے؟’’

‘‘میری جو ٹریننگ ہوئی ہے یقیناً’’ میں اس کو دوسروں تک منتقل کرتی ہوں اور ریڈیو ایک مشکل اور چیلنجنگ میڈیا ہے کیونکہ ہمیں آواز کے ذریعے ہی سامعین کو متاثر اور مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ ان کو انٹرٹین کرنا ہوتا ہے اور ہماری ٹریننگ اس انداز میں ہوتی ہے کہ چاہے ہمارا کیسا ہی موڈ کیوں نہ ہو ہم اپنے سامعین کو پتا نہیں لگنے دیتے کہ موڈ خراب ہے یا ہم پریشان ہیں یا کسی سے ناراضی ہے یا ہماری طبیعت خراب ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے‘ دوسروں کا کیا قصور ہے کہ ہم ان کو اپنی باتوں سے بور کریں۔’’

‘‘کس ایج کے لوگ آپ کا پروگرام زیادہ سنتے ہیں؟’’

‘‘میرے سننے والوں میں ہر عمر کے لوگ شامل ہیں۔ میرے شو کو نانی‘ دادی سے لے کر کم عمر بچے نوجوان‘ جوان‘ سب ہی شوق سے سنتے ہیں اور بڑی محبت سے کال بھی کرتے ہیں۔ میں صرف نوجوانوں کے لیے شو نہیں کرتی۔ میرا شو تو ہر ایک کے لیے ہے۔ کیونکہ میں ہر ایک کی دلچسپی کا خیال رکھتی ہوں۔’’

‘‘آپ وائس اوور بھی کرتی ہیں۔ ریڈیو پر بھی کافی

گھر آکر کیا دل چاہتا ہے کہ وقت کس طرح گزاریں؟’’

‘‘ہماری فیملی بہت چھوٹی سی ہے۔ بڑی بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ گھر میں امی بھائی بھابھی اور بچے ہیں۔ بس انہی کے ساتھ وقت گزارنے میں مزا آتا ہے۔ امی کے ساتھ وقت گزارنے کو دل زیادہ چاہتا ہے۔ اگر میں رات دیر سے گھر آؤں گی تو پھر امی کے ساتھ وقت کیسے گزاروں گی۔ تو بڑا اچھا لگتا ہے جلدی گھر آنا۔ بہت سے دیگر کام بھی ہو جاتے ہیں اور صبح کے پروگرام کی تیاری بھی کر لیتی ہوں۔’’

‘‘جلدی سوتی ہیں اور جلدی اٹھتی ہیں؟’’

‘‘سوتی تو میں بارہ بجے کے بعد ہی ہوں۔ البتہ میری صبح ساڑھے چھ بجے یا سات بجے تک ہو جاتی ہے۔ میں چاہے رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوؤں‘ صبح اپنی روٹین کے مطابق ہی اٹھ جاتی ہوں۔ کیونکہ ہمیں بچپن سے ہی صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے اس لیے میں نے آپ کو انٹرویو کے لیے دس بجے کا ٹائم دیا۔’’

مقبول ہیں اور سوشل بھی ہیں۔ لوگ آواز سے پہچان لیتے ہیں؟’’

‘‘میری پہلی پہچان تو میرے ابا (سلیم ناصر مرحوم) کی وجہ سے ہے‘ پھر جب میں کسی محفل میں جاؤں تو لوگ میرے بات کرنے کے انداز اور آواز سے پہچان لیتے ہیں اور ساتھ ہی کنفرم بھی کرتے ہیں کہ آپ ریڈیو پہ آتی ہیں‘ آپ کا نام بینش ہے؟ اور جو نام سے نہیں پہچانتے‘ وہ ایف ایم کا حوالہ ضرور دیتے ہیں کہ آپ ایف ایم 91 سے پروگرام کرتی ہیں‘ تو کافی جانی پہچانی جاتی ہوں۔’’

‘‘کبھی ٹی وی پہ آنے کا موڈ ہوا؟’’

‘‘ٹی وی پہ میں کافی آتی ہوں۔ میرے انٹرویوز آتے رہتے ہیں تو ٹی وی کے حوالے سے بھی لوگ جانتے ہیں۔ ٹی وی پہ آنے والی شکلوں کو تو لوگ جلدی پہچان لیتے ہیں۔ فیوچر میں میری خواہش ہے کہ میں ٹی وی کے لیے کوئی ٹاک شو ٹائپ کے پروگرام کروں۔’’

‘‘آپ کے والد کے بارے میں تو سنا ہوا ہے کہ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوا کرتے تھے۔ آپ میں ان کی طبیعت کا اثر ہے؟’’

‘‘بالکل ہے۔ کیونکہ مجھے بھی غصہ نہیں آتا۔ خوش مزاج اور ہنس مکھ ہوں۔ کوئی غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ جھوٹ تو برداشت ہوتا ہی نہیں ہے اماں اور ابا کی طرح ایک اسٹرانگ شخصیت کی مالک ہوں۔’’

ماہنامہ کرن
جنوری 2013 سال نو نمبر شائع ہو گیا

- ‘‘بیاد ابن انشاء’’
- سال نو کے موقع پر معروف شخصیات اور قارئین سے سروے،
- اداکارہ ‘‘سوھائے علی ابرو’’ سے ملاقات،
- سال نو پر کرن کا نیا سلسلہ ‘‘میری بھی سنیے’’ اس ماہ،
- ‘‘دست کوزہ گر’’ فوزیہ یاسمین کے سلسلے وار ناول،
- ‘‘درِ دل’’ نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناول کا آخری حصہ،
- ‘‘ساڈا چڑیا دا چنبا’’ نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- سمیرا شریف طور، کا مکمل ناول ‘‘وہ ایک لمحہ محبت’’
- ریحانہ امجد بخاری، رفعت سلطانہ، حیا بخاری کے ناولٹ
- میمونہ صدف، بشریٰ احمد، روبی نور القساء، فرحین اظفر، فرح طاہر قریشی،

اقراء شفیع، حنا نذیر، سعیدہ نثیہ بخاری کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

سال نو کے موقع پر بہنوں کی دلچسپی کے لیے شخصیت کے اسرار کھولتی
کرن کتاب
‘‘خود کو پہچانیں’’

WWW.PAKSOCIETY.COM

شعاع کے ساتھ

ادارہ

سجل باجوہ 106 شمالی سرگودھا

1 "شعاع" سے تعارف پھپھو کی وجہ سے ہوا۔ وہ "شعاع" اپنے کالج کے زمانے سے پڑھ رہی ہیں۔ اب تو ماشاءاللہ سے ان کے تین بچے ہیں۔ پہلے اسکول اور پھر کالج اکثر لڑکیاں مختلف ڈائجسٹ لے کر آیا کرتی تھیں۔ جن میں زیادہ کے پاس "شعاع" یا "خواتین" ہوتا تھا۔ لیکن میں زیادہ تر "شعاع" کو ہی پڑھتی تھی۔

ایک دفعہ کلاس میں "شعاع" کی کہانی میں اس قدر منہمک ہوئی کہ مجھے میڈم مدثرہ کے آنے کا احساس ہی نہ ہوا میڈم نے ہاتھ سے "شعاع" چھینا اور ٹائٹل دیکھ کر کہنے لگیں کہ "مجھے اس میں سے اچھی اچھی باتیں لکھ کر دینا" وہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میڈم بھی "شعاع" کی فین تھیں ورنہ کوئی اور ہوتیں تو رسالہ پھاڑ دیتیں یا پھر پرنسپل کے سامنے میری پیشی کروا دیتیں۔ پھر جو میرے ساتھ ہوتا خدا جانے 'خدا کا بندہ نہ جانے۔

ہمارے گھر میں بھی ان چیزوں کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ امی زیادہ سختی کرتی ہیں اور ابو اور بھائی کچھ نہیں کہتے۔

2 دن کا آغاز فجر کی نماز اور تلاوت کلام پاک سے ہوتا ہے۔ پھر بستر وغیرہ سمیٹتی ہوں اور یونیفارم استری کرنے کے بعد بیگ کو درست کرتی ہوں اور بکس جو میں نے پورے کمرے میں بکھری ہوتی ہیں انہیں سمیٹ کر بیگ میں ٹھونسنے کے انداز میں ڈالتی ہوں پھر امی کی ناشتے کے لیے پکار شروع ہو جاتی ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد کالج جانے کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔ اگر وین لیٹ ہو جائے تو بھائی کو اٹھانے کا کام سرانجام دیتی ہوں۔ اف خدایا بھائی کو صبح اٹھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ابو بھی ڈیرے سے دودھ لے کر آجاتے ہیں۔ دودھ کو مانے کا کام سجیلہ (بڑی بہن) سرانجام دیتی ہے اور میں اتنی دیر میں بھائی جی کے جوتے ڈھونڈ رہی ہوتی ہوں۔ جو پتا نہیں انہوں نے کس کونے میں پھینک دیے ہوتے ہیں۔ انہوں جوتے ڈھونڈ کر دوں اور وین دروازے پر۔

ڈھائی بجے کالج سے واپسی ہوتی ہے۔ تین بجے تک ریسٹ یا لنچ ان دونوں میں سے ایک کام کرتی ہوں۔ تین بجے سے لے کر ساڑھے چار بجے تک امی کو رات کے کھانے کے لیے اہتمام میں مدد کی۔ پھر عشاء تک کالج بکس کے سبق یاد کیے۔ پھر رات کا کھانا کھایا اور کھانا کھانے کے دوران بھائی اور سجیلہ کی نوک جھونک کو انجوائے کیا۔

رات آٹھ بجے سے نو بجے تک ٹی وی دیکھا۔ نیوز کم ہی سنتی ہوں۔ نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک شعاع پڑھا اور سجیلہ کے ساتھ تبصرہ کیا۔ اس کے بعد سو جاتی ہوں۔ سجیلہ بھی ساڑھے دس بجے تک اپنا کالج کا کام ختم کر کے سو جاتی ہے۔ اتوار والے دن صرف دو ہی خاص کام کرتی ہوں ایک جو باقی رسالہ رہ گیا ہے۔ اسے ختم کرتی ہوں اور صبح صبح چھت پر جا کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھنا مجھے بہت پسند ہے 96۔ F.M سرگودھا سننا بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ باقی سارے کام روٹین والے چلتے ہی رہتے ہیں۔

3 ایسی بہت سی تحریریں ہیں جنہیں بھولنا ناممکن ہے مثلاً "زرد موسم" آپی راحت جبیں کی تحریر ہے۔ جو مجھے بہت پسند ہے۔ آپی راحت گاؤں کی منظر کشی جس انداز میں کرتی ہیں واہ..... زرد موسم کے بعد فرحت اشتیاق کی تحریر "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" یہ ناول کتابی شکل میں میرے پاس موجود ہے۔ اس ناول میں مجھے عمر کا کردار بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ "زندگی اک روشنی" ماہا ملک کا "اک دیا جلائے رکھنا" پھلاں دے رنگ کالے اور نمو بخاری کی ہر شوخ ہر تحریر مجھے پسند ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جوادی اور نجیلی ہمارے محلے دار ہیں اور پسندیدہ رائٹرز کی لسٹ میں رضیہ جمیل 'رفعت سراج' رخسانہ عدنان 'نمو اور عمیرہ ہیں اور اسپیشلی مصباح گل جو ہمارے ہی شہر سرگودھا کی رہنے والی ہیں۔

ہر وہ کردار جو شوخ و شنگ 'شرارتی' حاضر جواب' ہنسنے والا ہنسانے والا' زندہ دل اور کھانے پینے کا شوقین ہو' اس کردار میں آپ کو ہماری جھلک نظر آئے گی۔ اور خاص طور پر نمو بخاری کے جوادی اور نجیلی۔ میں اور سجیلہ ہی ہیں۔ ہاہاہاہا۔

4 ذات کی خوبیاں اور خامیاں دوسرے ہی بتا سکتے ہیں اسی لیے لائبہ (دوست) سے سب سے پہلے رابطہ کیا۔ اس نے کہا تم خوب صورت ہو۔ (ہائے لائبہ کس خوش فہمی میں ڈال دیا) ہمدرد ہو' بے شمار ہنروں کی مالک ہو' کسی کو دکھ نہیں دیتیں اور سب سے بڑی بات کہ تم دوسروں کی خواہشات پوری کرتی ہو پھر صبا سے پوچھا تو اس نے کہا کہ تم ہر ٹاپک پر بول سکتی ہو۔ عاشی نے بتایا کہ تم میرے ساتھ والی بال اچھا کھیلتی ہو۔ خامیاں بتانا مشکل ہے پھر بھی چلتے چلتے کچھ خامیاں بتاتے چلیں۔

لائبہ کا کہنا ہے' غصہ بہت جلد آتا ہے اور کسی کو معاف نہیں کرتیں۔

سجیلہ اور بھائی سے پوچھا تو دونوں نے مشترکہ ایک ہی خامی بتائی کہ کسی کے حصہ کی چیز ہو تو تم کھا جاتی ہو۔ بس بس اب اتنی ہی کافی ہیں۔

تعریفی جملے تو بہت سنے ہیں لیکن لائبہ اور مس زیب (اردو کی ٹیچر) کے منہ سے تعریفی جملے سننا اچھا لگتا ہے۔

5 ساون کا اصل مزہ تو بچپن میں آتا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑکوں پر بھاگنا' کاغذ کی کشتیاں بنا کے پانی میں تیرانا' ایک دوسرے کو کیچڑ میں دھکے دینا' گھر آ کر امی کے ہاتھ کے پکائے ہوئے مولی کے پراٹھے' آج کا ساون تو فکر میں ہی گزرتا ہے۔ ادھر بارش کا پہلا قطرہ زمین پر پڑا اور امی کی کمنٹری شروع' موٹر ڈھک دو' چارپائیاں برآمدے میں ڈال دو اور صابن وغیرہ اندر رکھ دو۔ خراب ہو جائے گا۔ یہ سب تدبیریں کرنے کے بعد اپنے چھوٹے سے لان میں واک کرنا اور اپنے مٹھو کے ساتھ باتیں کرنا اور اسے تنگ کرنا۔ یہ ہے ہمارا ساون ۔ ابھی تک تو کوئی دلچسپ اور اچھی بات یاد نہیں۔ ہوتو یاد ہوتا۔

6 پسندیدہ شعر:

وہ قربتوں کے سفر بھی عجیب تھے ضیاء
کہ ساتھ چلتے رہے اور کہا کچھ بھی نہیں

پسندیدہ کتابوں میں شہادت نامہ 'سفر در سفر' پیار کا پہلا شہر' پطرس کے مضامین اور شاعری کی کتابوں میں برگ صحرا' عذاب دید' طلوع اشک اور ہمیں اقرار کرنا تھا اور دوسری بہت سی کتابیں۔

7 اقتباس راحت جبین کے ناول "زرد موسم" سے حاضر ہے۔

"تو ہوتا یوں ہے کہ تقدیر ہماری زندگی کی تصویر میں بڑے خوب صورت رنگ بھرتی ہے مگر ہم جیسے لوگ ..... اپنی بے لگام خواہشوں اور آوارہ خوابوں کی بدرنگی سے ساری تصویر مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ رنگ کچے ہیں..... اصل اور پکا رنگ تو وہی ہے جو کاتب تقدیر نے ہمارے لیے زندگی کی تصویر میں بھر دیا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

تبصیر نشاط

آئینے میں

کہہ مکرنی

”کہہ مکرنیاں“ اردو ادب کی مقبول صنف ہے۔ اشعار میں ذو معنی انداز میں کوئی بات کہی جاتی ہے اور پھر آخر میں واضح ہونے والے قریبی مفہوم سے مکر کے بعید کا مفہوم بیان کر دیا جاتا ہے۔ گویا کوئی بات کہہ کے اس سے مکرا جاتا ہے۔ اسی لیے اس صنف کو ”کہہ مکرنی“ کا نام دیا گیا۔ امیر خسرو نے بے شمار باکمال کہہ مکرنیاں کہی ہیں۔ لیکن جناب! امیر خسرو کی اس صنف میں ہمارے اکثر سیاست دانوں نے اس قدر کمال حاصل کیا کہ وہ اپنی کہی ہوئی ہر بات سے اگلے ہی لمحے مکرنے لگے۔ پھر اس صنف کو ہماری بعض فلمی اداکاراؤں نے اپنایا۔ وہ شادیاں کر کے مکرنے لگیں۔ تاہم اب یہ وبا ہماری ٹی وی اداکاراؤں تک بھی پہنچ گئی ہے۔

معروف اداکارہ عتیقہ اوڈھو سے کون واقف نہیں۔ جتنی خوب صورت وہ خود ہیں، اتنی ہی خوب صورتی سے خبروں میں بھی رہتی ہیں۔ اداکاری بھی خوب جم کے کرتی ہیں۔ تاہم اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ موصوفہ خاصی بھلکڑ واقع ہوئی ہیں یا شاید ”کہہ مکرنیاں“ پسند ہوں انہیں......

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، عتیقہ اوڈھو کی انصاف پسند ہونے کی دعوے دار ایک پارٹی کے رہنما سے شناسائی ہوئی جو گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بات شادی تک جا پہنچی۔ عتیقہ اوڈھو اور ان رہنما نے کچھ لوگوں کو مدعو کر کے شادی کر لی۔ ایک معروف اخبار کے میگزین میں اس تقریب کی آنکھوں دیکھی باتصویر رپورٹ بھی شائع ہوئی کہ وہ خاتون صحافی اس تقریب میں بہ نفس نفیس موجود ہونے کی دعوے دار تھیں۔ اس رپورٹ میں عتیقہ اوڈھو سے مختصر بات چیت بھی شامل تھی۔ عتیقہ ان صاحب کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر اس رپورٹ کے شائع ہونے کے چند ماہ بعد عتیقہ اوڈھو نے واویلا مچا دیا کہ جی! یہ خبر تو جھوٹی ہے۔ یہ انہیں بدنام کرنے کی کوئی سازش ہے۔

مگر جناب! تازہ ترین خبر یہ ہے کہ عتیقہ اوڈھو بالآخر اپنی اس شادی کو منظر عام پر لے آئی ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے اپنے شوہر ثمر علی خان کے ساتھ ایک نجی چینل میں شرکت کی اور اپنی شادی کا باضابطہ اعلان کیا۔

”کوئی بتلاؤ! کہ ہم بتلائیں کیا۔“

ہیرو

کرکٹ اور فلمی دنیا کا ساتھ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ان میں سے کسی ایک کا جنم

(ظاہر ہے، اس کا جنم جو بعد میں وجود میں آیا کہ پہلے آنے والا تو وجود میں آ کر دوسرے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔) کبھی فلمی ستاروں اور کرکٹرز میں قریبی دوستیاں پروان چڑھیں تو کبھی کرکٹ کے ستارے کرکٹ چھوڑ کر فلم نگری کے آسمان پر چمکے۔ ایسے ہی ستاروں میں ایک اور ستارے کا اضافہ ہوا ہے کہ معروف کرکٹر شاہد آفریدی خیر سے فلم اسٹار بننے کی تیاریوں میں ہیں۔ شاہد آفریدی ان خوش قسمت کرکٹرز میں سے ہیں، جنہوں نے کرکٹ کی دنیا میں قدم رکھتے ہی شائقین کرکٹ کی توجہ کھینچ لی تھی۔ خاص طور پر ”شائقینیوں“ کی۔ (یہ اصطلاح کسی لغت میں تلاش کرنے کی زحمت نہ کیجیے کہ یہ ہم نے ابھی ابھی ایجاد کی ہے۔) اور یہ ”شائقینیاں“ شاہد آفریدی کے کھیل سے زیادہ ان کی پرکشش شخصیت کی مداح تھیں۔ شاہد آفریدی اپنے جارحانہ کھیل کے باعث جہاں نوجوان دلوں کی دھڑکن بنے تو وہیں جہاندیدہ نظروں کی داد کے مستحق بھی ٹھہرے۔ ان کی اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی لوگوں نے انہیں اداکاری کی پیش کش کی۔ شاہد آفریدی نے کچھ اشتہارات تو کر لیے۔ تاہم فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے سے معذرت کر لی۔ مگر جناب! لوگوں نے ہمت نہ ہاری اور شاہد آفریدی کے انکار کے پتھر پر اصرار کے قطرے ٹپکاتے رہے۔ ان قطروں نے اس پتھر میں سوراخ کر ہی دیا۔ یوں اب شائقین کرکٹ کے بعد اب شائقین فلم بھی جلد ہی شاہد آفریدی کو ایکشن میں دیکھ سکیں گے۔

انہیں فلم میں لانے کا سہرا معروف اداکار اور ”نو آموز فلمساز“ ہمایوں سعید کے سر بندھا ہے۔ (تاہم فلم کے دولہا شاہد آفریدی ہی ہیں کہ ہمایوں سعید نے صرف انہیں لانے کا سہرا ہی اپنے سر باندھا ہے اور فلم میں ہمایوں کی موجودگی کے باوجود بھی مرکزی کردار شاہد آفریدی کا ہی ہے۔) اس فلم کا نام ”میں ہوں شاہد آفریدی“ ہے اور یہ شاہد آفریدی کی زندگی پر ہی بنائی گئی ہے۔ (گویا اسے سمعی و بصری اور میوزیکل سوانح حیات ”بھی“ کہا جا سکتا ہے۔) فلم تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور اس کی نمائش جلد ہی متوقع ہے۔ شاہد آفریدی کے ساتھ اس میں بے شمار فنکاروں نے کام کیا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ہمایوں سعید نے اس فلم میں ہمایوں سعید، ثمینہ پیرزادہ، ماہ نور بلوچ، ندیم، جاوید شیخ، شہزاد شیخ، نعمان حبیب سمیت کئی معروف ناموں کو اکٹھا کیا ہے۔ (ذرا دیکھیے گا ہمایوں جی! کوئی نام کاسٹ ہونے سے کہیں رہ تو نہیں گیا؟)

واپسی

کہانی بنانا اور سنانا ایک فن ہے تو کہانی سننا اور دیکھنا ایک شوق۔ دنیا میں تقریباً ہر جگہ اور ہر دور کے بچوں کو کہانی سننے کا شوق رہا ہے۔ خاص طور پر جنوں، بھوتوں اور پریوں کی مافوق الفطری کہانیاں سننے کا۔ ان ہی کہانیوں کے ذریعے پتا چلا کہ جنوں کو بھی عینک لگ جاتی ہے۔ لیکن جناب! ہر جن کو عینک نہیں لگی ہوتی اور نہ ہر عینک والا جن ہی ہوتا ہے کہ عینک والا جن تو بس ایک ہی تھا نسطور جن۔ جس نے نوے کی دہائی میں لاکھوں بچوں کے دلوں پر راج کیا تھا۔ نوے کی دہائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے وہ بچے تو اب بڑے ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے دلوں میں وہ "عینک والا جن" ابھی تک براجمان ہے۔ اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بچوں کی یہ مقبول ترین سیریل ایک بار پھر شروع کی جا رہی ہے۔ ایک نجی چینل کے مارننگ شو میں "عینک والا جن" کی ٹیم کے افراد نے شرکت کی اور یہ خوش خبری سنائی کہ یہ سیریل جلد ہی شروع کی جا رہی ہے۔ اسی شو میں ان فنکاروں نے انکشاف کیا کہ "عینک والا جن" ہر خاص و عام طبقے کے بچوں میں یکساں مقبول تھا۔ تاہم خواص کے بچے تو پھر خاص ہی تھے نا، سو "عینک والا جن" کی نئی قسط ریکارڈ ہوتے ہی پہلے ان خواص کے بچوں کے پاس خاص طور پر بھیجی جاتی تھیں۔ وہ اسے دیکھتے تھے، پھر یہ ڈراما ان ایئر ہوتا تھا۔ (ہاں! تو وہ بچے سنسر بورڈ کے رکن ہوں گے ناں! ڈراما سنسر کرنے کی نیت سے پہلے دیکھتے ہوں گے۔)

ڈرامے کے فنکاروں شہزاد قیصر اور منالاہوری وغیرہ نے یہ بھی شکوہ کیا کہ یہ سیریل تین سال چلی اور اپنی مقبولیت کے عروج پر کوئی وجہ بتائے بغیر بند کر دی گئی تھی۔ (لو جی! وجہ تو سامنے ہی ہے۔ ڈراما سنسر کرنے والے خواص کے وہ بچے تین سال کے عرصے میں "بڑے" ہو گئے ہوں گے ناں! ویسے اب تو وہ بچے اور بھی بڑے ہو چکے ہیں... کہ ان کی دلچسپی کا محور اب "پریاں" ہو گئی ہیں، تو پھر اس وقت وہ ڈراما سنسر کون کرے گا؟ ہمیں تو شبہ ہے شہزاد قیصر جی! کہ یہ ڈراما اب شروع ہو بھی پاتا ہے یا نہیں۔)

ہمت

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مگر جناب! یہ مقولہ ترتیب دینے والے احباب غالباً اس میں "عمر" کا اضافہ کرنا بھول گئے یا انہوں نے عمر کو اس خیال سے اس میں شامل نہ کیا ہو کہ بعض لوگ "عمر چور" بھی تو ہوتے ہیں نا! مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری فلمی و غیر فلمی اداکاراؤں کا یہ ایک سدا بہار مسئلہ ہے۔ اکثر اداکارائیں اپنی عمر چھپانا تو بہت چاہتی ہیں مگر جناب! عمر ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی (میک اپ کی تہوں سے بھی نہیں۔) عمر چھپانے کے لیے میک اپ اور پھر کاسمیٹک سرجری کا سہارا لیتی ہیں۔ تاہم ایک وقت میں سارے سہارے دغا دے جاتے ہیں۔

اس ضمن میں اداکارہ ریشم کو داد نہ دینا یقیناً زیادتی ہوگی کہ انہوں نے جی کڑا کر کے ایک قدم اٹھایا اور خیر سے اپنی تینتیسویں سالگرہ منا ڈالی۔ یوں وہ ہماری فلمی صنعت کی پہلی ہیروئن ہو گئی ہیں، جنہوں نے تیس کا ہندسہ عبور کیا ہے۔ ورنہ یہ ہندسہ "بڑے بڑے" میں ایک ایسی رکاوٹ کی مانند ہے، جہاں آکر ہماری ہیروئنیں چت ہو جاتی ہیں۔

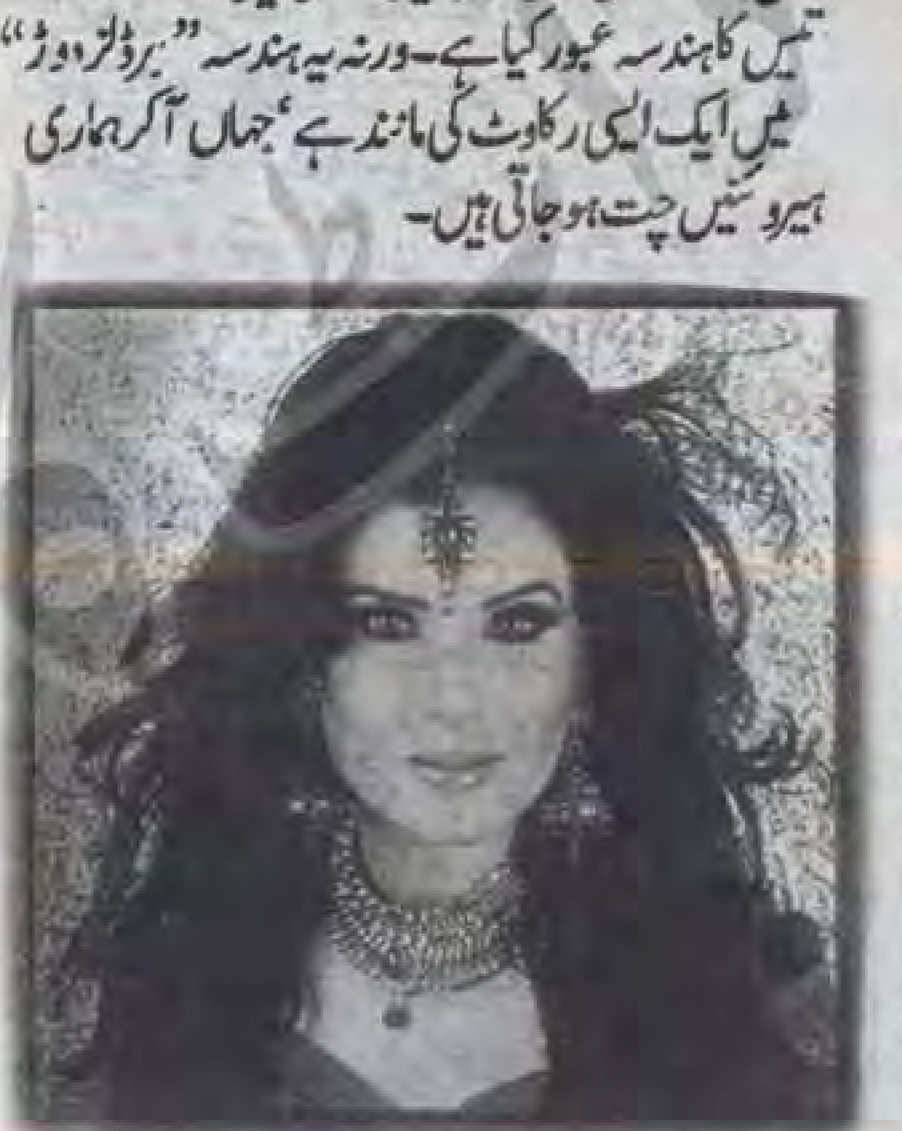

ویسے میں ریشم کا تینتیسویں سالگرہ منانا یقیناً قابل تحسین امر ہے۔ گو ریشم نے ابھی کامل ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے کہ دنیا بھر کی معلومات دینے کی معتبر ویب سائٹ وکی پیڈیا میں ریشم کا سال پیدائش انیس سو بہتر درج ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر چالیس سال بنتی ہے۔ (آج ریشم نے اتنی ہمت کی ہے۔ کل کو تھوڑی اور کر لیں گی۔) ریشم کی دیکھا دیکھی اداکارہ میرا نے بھی ہمت پکڑی اور اپنے ستائیس سال کے ہونے کا اعلان کر ڈالا۔ ورنہ تو وہ گزشتہ ایک عشرے سے اپنی پچیسویں سالگرہ ہی منا رہی تھیں۔

(شکریہ ریشم جی!)

٭ ٭ ٭

بیان کالمانہ

○ طاہر القادری نے وزیر اعلا نواز شریف پر الزام لگایا کہ انہوں نے قاتلانہ حملہ کرایا۔ انہوں نے فوٹو گرافروں کو دیوار پر لہو کے چھینٹے اور گولیوں کے نشان بھی دکھائے۔ یہ کیس ہائی کورٹ میں گیا اور ہائی کورٹ نے اس الزام کو بہتان قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے جو ریمارکس دیے۔ وہ اتنے نازیبا تھے کہ درج نہیں کیے جا سکتے اور خون کے چھینٹوں کے بارے میں لیبارٹری رپورٹ یہ سامنے آئی کہ یہ چھینٹے بکرے کے خون کے ہیں۔

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

○ اردشیر کاؤس جی 1985ء میں بشریٰ زیدی کی ہلاکت کو شہر میں پیش آنے والا سب سے سنگین سانحہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سانحے نے شہر کو حوادث کے سپرد کر دیا۔ چند برس پہلے ایک انٹرویو میں جب ان سے کراچی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بے دھڑک یہ جملہ کہا کہ "شہر سڑ گیا ہے۔"

(زاہدہ حنا۔ نرم گرم)

○ پاکستانیوں کو دنیا کی چوتھی ذہین ترین قوم کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ ایمان اور یقین کی وہ طاقت اور شعور ہے جو اس کے اندر اس کی پیدائش کے وقت کی آذان کی آواز سے اس کے دل میں ودیعت کر دی جاتی ہے۔

(عبدالقادر حسن۔ غیر سیاسی باتیں)

○ حقائق یہ ہیں کہ ایک طرف میڈیا میں کچھ عناصر کے ذریعے لال مسجد میں آپریشن کے لیے ماحول پیدا کیا گیا۔ دوسری طرف کچھ نام نہاد مجاہدین کو داخل کر کے حالات بگاڑے گئے۔ جب آپریشن شروع ہوا تو یہ نام نہاد مجاہدین وہاں سے نکل گئے اور بے گناہ لوگوں کا خون بہا دیا گیا۔

(حامد میر۔ قلم کمان)

سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد سے ہو سکتا ہے قومی اسمبلی کی دو چار ہی سیٹوں کے نتیجے پر اثر پڑے، مگر ہر ایک کی چیکنگ اور ساتھ ہی اگر گھروں کی بھی چیکنگ کر لی گئی اور اسلحہ وغیرہ پکڑا گیا تو کراچی کا امن بحال ہو سکتا ہے۔ کام تو پہاڑ جیسا ہے، مگر مسئلہ بھی پہاڑ سے کم نہیں۔ کرنا تو ہوگا۔

(شاہین صہبائی۔ چلتے چلتے)

○ امریکا میں جگر کی خرابی کے واقعات کثرت سے منظر عام پر آئے۔ جگر کی خرابی کی اہم وجہ پیراسیٹامول کا استعمال تھا۔ ایک دن میں بیس گولیاں پیراسیٹامول کے استعمال سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ درد کم کرنے والی اس دوا کی مقرر کردہ تعداد آٹھ ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے اس دوا کی فروخت پر پابندی سے برطانیہ میں اس کے کیسوں میں نمایاں کمی آئی۔

(لندن۔ نیٹ نیوز)

○ جن خواتین میں وٹامن ای کی کمی ہوتی ہے۔ ان کے بچوں میں پانچ سال کی عمر تک سانس پھولنے یا دمے کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حمل کے پہلے سولہ ہفتے اس سلسلے میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گاجر کا حلوہ

اجزا :

گاجر	ایک کلو
دودھ	دو کلو
بالائی	ایک پاؤ
کھویا	آدھی پیالی
الائچی	دس عدد
چینی	ایک کلو
کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
بادام پستہ	حسب ضرورت
پسا کھوپرا	آدھی چھٹانک

ترکیب :

گاجر چھیل کر کدو کش کرلیں۔ دودھ میں الائچی ڈال کر ایک جوش دے لیں۔ پھر گاجر ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ چمچہ چلاتے رہیں۔ دودھ ذرا خشک ہونے لگے تو چینی ڈال دیں۔ چینی کا پانی خشک ہونے لگے تو بالائی پھینٹ کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی پسا کھوپرا بھی ڈال دیں۔ شیرہ گاڑھا ہو کر جذب ہو جائے اور سارا آمیزہ یکجان ہو کر خوشبو دینے لگے تو کیوڑہ ڈال کر چند منٹ کے لیے ڈھک دیں۔ پھر بادام پستے کی کریوں سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

چکن جنجر

اجزا :

چکن	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
ثابت ادرک	ایک ٹکڑا
پیاز	ایک عدد
گاجر	چار عدد
ٹماٹو پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سفید مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
سرکہ	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن اور گاجر کو لمبائی میں (اسٹرپس) کاٹ لیں۔ تیل گرم کر کے سلائس میں کٹی پیاز ڈال کر سنہرا کریں پھر گاجر اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ اب چکن اور کتری ہوئی ادرک ڈال کر مکس کریں اور چکن گل جانے تک پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو ٹماٹو پیسٹ، چینی، نمک، سفید مرچ ڈال کر بھونیں یہاں تک تیل اوپر آجائے۔ سرکہ ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ چپاتیوں یا ابلے ہوئے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

چکن کریم سوپ

اجزا :

چکن	آدھا کلو
مکھن	ایک چھٹانک
میدہ	ایک چائے کا چمچہ
دودھ	آدھا پاؤ
پسی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب :

آدھے مکھن میں میدے کو اچھی طرح مکس کر کے ابلے ہوئے دودھ میں ڈال کر ایک جوش مزید دے دیں۔ باقی مکھن کو گرم کر کے اس میں چکن فرائی کریں۔ سنہرے ہو جائیں تو نمک اور چھ کپ پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ دو تین ابال آجائیں تو آنچ ہلکی کر کے اتنا پکائیں کہ پانی چار کپ رہ جائے۔ چکن نکال کر ریشے کرلیں۔ بھاپ خارج کر کے میدے اور مکھن والا آمیزہ، چکن کے ریشوں کے ساتھ ڈال کر پانچ منٹ مزید پکائیں۔ سیاہ مرچ اور سویا ساس ڈال کر پیش کریں۔

فش بالز

اجزا :

مچھلی کا قیمہ	تین پاؤ
ہری پیاز	دو عدد
ہری مرچ	چار عدد
کارن فلور	چھ چائے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ پسی مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ادرک پیسٹ، نمک، چینی، سرخ مرچ اور دو کھانے کے چمچے کارن فلور تھوڑے سے پانی میں ملا کر پیسٹ بنالیں۔ ہری پیاز اور ہری مرچ باریک کاٹ کر شامل کریں پھر مچھلی کا قیمہ ملا کر بالز بنالیں۔ بقیہ کارن فلور میں بیکنگ پاؤڈر اور تھوڑا سا گھی ملا کر آدھے کپ پانی میں گھول کر پیسٹ بنالیں۔ فش بالز کو اس پیسٹ میں لپیٹ کر درمیانی آنچ پر گہرے تیل میں تلیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

میتھی کے پراٹھے

اجزا :

آٹا	دو کپ
میتھی کا ساگ	تین کپ
انار دانہ	دو چائے کے چمچے
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	تلنے کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ترکیب :

میتھی صاف کر کے باریک کاٹ لیں اور نمک، مرچ اور انار دانے کے ساتھ آٹے میں ملا کر گوندھ لیں۔ پندرہ منٹ تک گیلے کپڑے سے ڈھک کر رکھیں پھر پیڑے بنا کر زیادہ گھی کے ساتھ تلیں اور لہسن کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چائنیز پلاؤ

اجزا :

چکن	ایک کلو
چاول	آدھا کلو
انڈے	دو عدد
گاجر	دو عدد بڑی
ہری پیاز	چار عدد
بند گوبھی	آدھا پاؤ
اجینو موتو	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
پسی سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب :

چاول صاف کر کے پندرہ منٹ کے لیے بھگو دیں، پھر دو کنی ابال لیں اور نتھار کر کسی باریک کپڑے پر پھیلا دیں۔ چکن کو ابال کر ہڈیاں الگ کر کے اس کے ریشے یا بہت چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ گاجر، گوبھی اور ہری پیاز کو بھاپ پر گلا لیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کر کے چکن اور سبزیاں ڈال کر ہلکے چمچے سے مکس کریں۔ نمک، اجینو موتو اور پسی سفید مرچ بھی ڈال کر مکس کریں۔

چائنیز پلاؤ میں انڈا شامل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ چاہیں تو اسی مسالے میں انڈے توڑ کر مکس کر لیں، ورنہ الگ پھینٹ کر ایک چمچے تیل میں تل لیں اور ٹکڑے کر کے شامل کریں۔ اب چاول جو خشک ہو چکے ہوں گے ڈال کے ہلکے ہاتھوں سے مکس کریں اور سویا ساس ڈال کر دم پر لگا دیں چائنیز پلاؤ تیار ہے۔

مچھلی پلاؤ

ضروری اجزا :

مچھلی (کانٹے نکال کر اسٹرپس کاٹ لیں)	آدھا کلو
چاول	آدھا کلو
تیل	تین پیالی
لہسن کے جوے	15-12 عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	2 عدد
زیرہ	چائے کا ایک چمچہ
لونگ	6 عدد
ثابت دھنیا	چائے کے دو چمچے
ثابت سیاہ مرچ	12-10 عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
ثابت گرم مسالا	کھانے کا ایک چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	چائے کا ڈیڑھ چمچہ

سیل یا گرائنڈر میں لہسن، زیرہ، لونگ، ثابت دھنیا، سیاہ مرچ، نمک اور سرخ مرچ پاؤڈر ڈال کر پیس لیں۔ مچھلی کے اسٹرپس کو دھو کر خشک کر لیں۔ تیار کیا ہوا مسالا مچھلی میں ڈال کر دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ چھوڑیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور اس میں مچھلی کے اسٹرپس ڈال کر سنہری مائل ہونے تک فرائی کریں۔ (زیادہ نہ پکائیں ورنہ مسالا جل جائے گا) ایک میں بقیہ تیل گرم کر کے اس میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر اس میں پیاز ڈال کر سنہری مائل کر لیں۔ باسمتی چاول، حسبِ ضرورت پانی اور نمک ڈال کر ایک کنی رہنے تک پکائیں اس کے بعد فرائی کیے ہوئے مچھلی کے اسٹرپس چاولوں کے اوپر ڈال کر اسے دم پر رکھ دیں۔ مزیدار مچھلی پلاؤ تیار ہے سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

تاریخ کے جھروکوں سے

امت الصبور

دنیا میں بت پرستی کا آغاز

آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن تھے، جو سب اسلام پر قائم تھے۔

قرن سے مراد نسل یا صدی ہے۔

ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نوح علیہ اسلام کی قوم کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جہاں وہ حضرات بیٹھا کرتے تھے، وہاں بت بنا کر رکھ دو، اور ان کے وہی نام رکھ دو جو ان بزرگوں کے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت تو بتوں کی پوجا نہیں ہوئی۔ جب وہ لوگ فوت ہو گئے اور علم مٹ گیا تب ان کی پوجا ہونے لگی۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے یہی بت بعد میں عرب میں پوجے گئے۔

محمد بن قیس رحمتہ اللہ نے فرمایا ہے "یہ حضرات آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان کے زمانہ کے اولیائے کرام تھے۔ ان کے کچھ پیروکار بھی تھے جو ان کے طریقے پر چلتے تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو ان کے عقیدت مند پیروکاروں نے کہا۔

"اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں، تو ان کی یاد کی وجہ سے ہمیں عبادت کا شوق زیادہ ہو گا۔"

چنانچہ انہوں نے ان کی تصویریں بنائیں۔ جب یہ (تصویریں بنانے والے افراد) فوت ہو گئے اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے تو ابلیس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا اور کہا۔

"تمہارے باپ دادا ان اولیائے کرام کی عبادت کیا کرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے انہیں بارش ملتی تھی۔" چنانچہ ان لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔

ابو المطہر سے روایت ہے کہ ابو جعفر محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے کہ حاضرین نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے فرمایا۔

"تم نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا ہے، وہ اس علاقے میں قتل ہوئے ہیں جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی پوجا ہوئی تھی۔ انہوں نے ود کے بارے میں فرمایا۔

"ود ایک نیک آدمی تھا، جو قوم میں ہر دل عزیز تھا، جب وہ فوت ہو گیا تو لوگ بابل میں اس کی قبر پر بیٹھ گئے اور بہت زیادہ غمگین ہوئے۔ جب ابلیس نے ان کا غم دیکھا تو انسانی صورت میں ان کے پاس آ کر کہنے لگا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صاحب کی وفات پر بہت دل گرفتہ ہو۔ تو کیا میں تمہیں اس جیسی ایک صورت نہ بنا دوں، جو اس کی جگہ رکھی جائے اور وہ اس کی یادگار بن جائے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں! بنا دو۔"

اس نے ود کا ایک بت بنا دیا۔ انہوں نے اسے چوپال میں رکھ لیا اور اسے یاد کرنے اور اس کی باتیں کرنے لگے۔ جب ابلیس نے دیکھا کہ لوگ ود کو بہت یاد کرتے ہیں تو کہا۔

"کیا میں تم میں سے ہر شخص کے گھر میں اس طرح کا ایک مجسمہ نہ بنا دوں، جس کو دیکھ کر وہ اسے یاد کرے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں (بنا دو۔)"

اس نے ہر شخص کے گھر میں ایک بت بنا دیا۔ وہ اس کو دیکھ کر اس (اللہ کے ولی ود) کو یاد کرتے تھے۔

جب ان کے بیٹے بڑے ہوئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کو ان (بتوں) کو اہمیت دیتے دیکھا (تو وہ بھی اسی طرح اہمیت دیتے رہے) حتیٰ کہ اگلی نسلوں کے لوگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس بات سے بے خبر ہو گئے کہ ان کے بزرگ انہیں کیوں یاد کرتے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ ان کی عبادت شروع کر دی۔ چنانچہ سب سے پہلے جس مخلوق کی عبادت کی گئی، وہ وہ بزرگ کا بت تھا۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی کو پوجنے والی ایک الگ جماعت تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب طویل زمانہ گزر گیا تو انہوں نے تصویروں کی جگہ مجسم بت بنا لیے تاکہ زیادہ دیر تک قائم رہ سکیں۔ (یعنی پہلے تصویریں بنائی گئی تھیں، بعد میں تصویروں کے مٹ جانے کے خوف سے مجسمے بنائے گئے۔) بعد میں ان کی عبادت ہونے لگی۔ ان کے ہاں ان کی عبادت کے بہت سے طریقے تھے۔

حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ میں جو گرجا دیکھا تھا، اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ اس کا نام "ماریہ" تھا۔ انہوں نے اس کی خوب صورتی کا ذکر کیا اور اس میں جو تصویریں تھیں ان کا ذکر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد (عبادت گاہ) تعمیر کرتے تھے اور اس میں یہ تصویریں بناتے تھے۔ اللہ کے ہاں یہ لوگ مخلوقات میں بد ترین ہیں۔"

(صحیح بخاری)

اصحاب الرس

اصحاب الرس کا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے۔ قرآن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ملیا میٹ کر دیا گیا تھا۔

عربی زبان میں "الرس" اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی منڈیر پتھروں سے بنائی گئی ہو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایک خاص کنواں تھا جس پر قوم ثمود کا ایک قبیلہ رہتا تھا۔ وہی لوگ اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت ابو بکر محمد بن حسن نقاش رحمتہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اصحاب الرس کا ایک کنواں تھا جس سے ان کے پینے کی اور آب پاشی کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ ان کا بادشاہ بہت انصاف پرور اور نیک سیرت تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو لوگوں کو بہت زیادہ غم ہوا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ شیطان اس (مرحوم بادشاہ) کی صورت میں ان کے پاس آیا اور کہا۔

"میں مرا نہیں تھا، میں تو غائب ہو گیا تھا تاکہ دیکھوں تم کیا کرتے ہو۔"

وہ انتہائی خوش ہوئے۔ اس نے کہا۔

"میرے لیے پردہ لگا دو۔ میں کبھی نہیں مروں گا (لیکن تمہاری نظروں سے اوجھل رہوں گا۔)"

بہت سے لوگوں نے شیطان کی بات کو سچ سمجھ لیا اور اس کے فریب میں آ کر اس کی پوجا کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک نبی مبعوث فرمایا، اس نے بتایا کہ

"پردے کے پیچھے سے بات کرنے والا (بادشاہ نہیں، بلکہ) شیطان ہے۔ اس نبی نے انہیں اس کی عبادت سے منع کیا اور اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا۔

امام سہیلی رحمتہ اللہ کا بیان ہے کہ ان نبی پر نیند کی حالت میں وحی نازل ہوتی تھی اور ان کا نام حنظلہ بن صفوان علیہ السلام تھا۔ لوگوں نے آپ علیہ السلام پر حملہ کیا اور آپ علیہ السلام کو شہید کر کے کنویں میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنویں کا پانی خشک ہو گیا۔ درخت سوکھ گئے، پھل ختم ہو گئے، انہیں پیاس نے آ لیا، چنانچہ ان کے گھر ویران ہو گئے اور وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور آخر کار سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

ہیکل سلیمانی اور تابوت سکینہ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ مجھے ایسی حکومت ملے، میرے بعد آنے والوں کو ایسی حکومت نصیب نہ ہو۔ آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ انسانوں، جنوں، حیوانوں اور ہوا پر حکومت کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت داؤد علیہ اسلام کی خواہش کے مطابق فلسطین میں ایک عبادت خانہ تعمیر کیا اس عبادت خانہ کا نام ہیکل سلیمانی پڑا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر 1012ء قبل مسیح میں ہوئی۔ تعمیر کا کام سات سال تک جاری رہا۔ بعض روایات کے مطابق دو لاکھ مزدوروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

اسرائیلی روایات میں پایا جاتا ہے کہ تعمیر کے دوران جنوں نے بھی حصہ لیا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس عبادت خانہ کی لمبائی 90 فٹ، چوڑائی 30 فٹ اور اونچائی 45 فٹ تھی۔ اس کے اندر ایک مخصوص جگہ بنائی گئی تھی۔ جہاں تابوت سکینہ رکھا گیا۔ یہ ایک صندوق کی شکل میں تھا۔ اس میں یہودیوں کے تبرکات رکھے گئے تھے۔ اس میں آل موسیٰ اور آل ہارون علیہ السلام کی نشانیاں تھیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ صندوق بہت متبرک مانا جاتا ہے۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام بھی اسی صندوق میں تھا۔ ان میں پتھر کی وہ تختیاں بھی تھیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو عطا کی تھیں۔

طالوت جب بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو اس نے لڑ کر یہ صندوق حاصل کیا تھا۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ فلسطین پر ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے۔ کبھی بابل نے تباہی مچائی، (عراق کا قدیم نام بابل تھا) کبھی رومیوں نے حملہ کیا، جس نے بھی حملہ کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے عبادت خانے کو بھی نشانہ بناتا رہا۔

ایک مرتبہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا اور ہیکل سلیمانی کو تاخت و تاراج کیا اور اسرائیلیوں کا قتل عام کیا۔ بخت نصر فلسطین سے دس لاکھ یہودیوں کو عراق لے گیا اور وہاں غلام بنا دیا۔ بخت نصر کے عہد کے بعد پھر یہ قوم فلسطین میں آ کر آباد ہو گئی۔ رومی بھی اکثر فلسطین پر حملہ کرتے رہے۔

ہیکل سلیمانی کے جو بھی نشانات تھے حملوں کی زد میں آ کر مٹتے رہے۔ آخر میں روم کے ایک بادشاہ ٹٹس نے ہیکل سلیمانی کو آگ لگا کر بالکل تباہ کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کے وجود کی دھندلی سی نشانی بھی نیست و نابود ہو کر رہ گئی۔

یہودیوں کا دعوا ہے کہ ہیکل سلیمانی کی زمین پر مسجد اقصیٰ تعمیر کی گئی۔ اس لیے یہ یہودیوں کی ملکیت ہے۔ آج بھی یہ تنازعہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے بیت المقدس کی سرزمین پر آج تک جنگ جاری ہے۔ اسرائیلی مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا

کا نیا ایڈیشن قیمت -/750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا خزانہ

قیمت -/225 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی -/800 روپے کا منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

حسن و صحت

ادارہ

موٹاپے کی بہت سی وجوہات و اقسام ہوتی ہیں
- ان میں اہم ترین یہ ہیں۔ (1) خاندانی بیماری کے باعث
(2) غدودوں کی وجہ سے
(3) کھانے کی زیادتی وغیرہ

ان تمام وجوہات میں آخری وجہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر موٹاپا کسی غدود کی وجہ سے ہے تو اس کا علاج ماہرین امراض غدود سے کروا کر اس سے چھٹکارہ پا سکتے ہیں۔

وزن کم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں مگر سب سے بہترین طریقہ "کیلوریز کنٹرول" کرنا ہے۔ اس سے معدے کو کم کھانے کی عادت ہو جاتی ہے کیلوریز کنٹرول کرنے کے لیے پہلے اسے سمجھنا اور جاننا ضروری ہے کہ یہ کس طرح مفید ہے۔

مثال کے طور پر ایک ابلے ہوئے انڈے میں 70 فیصد کیلوریز ہوتی ہیں۔ اگر اس کو فرائی کیا جائے تو 650 ہو جاتی ہیں۔ آملیٹ بنایا جائے تو 450 ہو جاتی ہیں۔

ایک سیب میں تقریباً" 70 کیلوریز ہوتی ہیں۔ اس کو ہضم کرنے کے لیے تقریباً" 25 یا 30 کیلوریز استعمال ہو جاتی ہیں اس کے مقابلے میں ایک چمچہ تیل، گھی یا مکھن (یعنی چکنائی) میں تقریباً" 45 کیلوریز ہوتی ہیں اور اس کو ہضم کرنے میں کچھ صرف نہیں ہوتا۔

گوشت میں سب سے بہتر سفید گوشت یعنی مچھلی اور مرغی کا ہوتا ہے سفید گوشت کیلوریز کنٹرول کرنے میں بہت ہی مفید ہے۔

مختصرا" یہ کہ کھانے میں گھی اور تیل کا کم سے کم استعمال پھلوں اور سبزیوں کا وافر استعمال اور آٹے میں بھوسی کی موجودگی وزن کم کرنے کا ذریعہ ہے۔
مندرجہ ذیل ہفتہ وار ڈائٹ پلان پر عمل کرکے آپ بہت حد تک موٹاپے سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔

پہلا دن : سارے دن میں کسی بھی قسم کا پھل کھائیں سوائے کیلے کے۔

دوسرا دن : سارے دن میں کسی بھی قسم کی سبزی کھائیں۔ سوائے آلو، مٹر اور مکئی کے۔

تیسرا دن : سارا دن پھل اور سبزی کھائیں۔

چوتھا دن : سارے دن میں آٹھ کیلے اور چار گلاس دودھ (دہی اور لسی بھی استعمال کی جا سکتی ہے)

پانچواں دن : سارے دن میں آدھا کلو مرغی، ایک کلو ٹماٹر (تین کھانوں میں تقسیم کرکے)

چھٹا دن : سارے دن میں آدھا کلو مچھلی اور کوئی بھی سبزی (تین کھانوں میں تقسیم کرکے)

ساتواں دن : سارے دن میں ڈیڑھ پاؤ ابلے ہوئے چاول اور کوئی بھی سبزی (تین کھانوں میں تقسیم کرکے)

نیز چائے کافی وغیرہ بغیر شکر کے استعمال کی جا سکتی ہے۔ گھی اور تیل قطعی استعمال نہ کریں۔ گوشت کو کوئلوں پر سینک کر یا ابال کر کھائیں اور سبزیوں کا سوپ دن میں جب بھی بھوک لگے پی لیں۔
آپ دیکھیں گی کہ چند دنوں میں آپ کا وزن نمایاں طور پر کم ہونا شروع ہو جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM